محبت اس کو کہتے ہیں



ملنے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ اقرأ سنٹر اُردو بازار لاہور 37355743
مکتبہ العلم 17 اُردو بازار لاہور 37211788
اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ لاہور 37223506
مشتاق بک کارنر اُردو بازار لاہور 37230350
علم و عرفان پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور 37232336
منیر برادرز مین بازار جہلم
احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ راولپنڈی
بنگش بک ڈپو اُردو بازار سیالکوٹ 052-4595359
اسلم بک ڈپو کلوال سیالکوٹ 0347-6841995
چوہدری بک ڈپو مین بازار دینہ
ضیاء القرآن پبلشرز گنج بخش روڈ لاہور
نیو الیاس کتب محل کچہری بازار جڑانوالہ
ادریس کتاب محل مین بازار منڈی سمبڑیال
عمر بک سنٹر جی ٹی روڈ سرائے عالمگیر 653057
چغتائی بک ڈپو پوڈیال آزاد کشمیر
اتفاق بک ڈپو بھلوال
کوالٹی ڈیپارٹمنٹل سٹور کالج روڈ بورے والا 3355889
شاہین بک ہاؤس منڈی بہاؤالدین
بختار سنز قصہ خوانی بازار پشاور
بلال بک ڈپو گجرات
الفضل کتاب گھر میر پور آزاد کشمیر
مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد 5-2278843
جہانگیر بک ڈپو لاہور 37220897
سعد پبلی کیشنز فسٹ فلور اُردو بازار لاہور 37122943
مسلم بک لینڈ بینک روڈ مظفر آباد
یونائیٹڈ بک ہاؤس کچہری روڈ منڈی بہاؤالدین
نیو وہاڑی کتاب گھر جناح روڈ وہاڑی 62310
الکریم نیوز ایجنسی گول چوک اوکاڑہ
شائلہ بک ایجنسی محلہ چوہدری پارک ٹوبہ ٹیک سنگھ
ڈار برادرز تحصیل بازار جہلم
فضلی سنز اُردو بازار کراچی
کھوکھر بک سٹال مسلم بازار، گجرات
مکتبہ رشیدیہ چکوال
بٹ بک ڈپو جہلم
اشفاق بک ڈپو پاڑیاں والہ
حبیب لائبریری، واہ کینٹ
شاہین بک سنٹر، وہاڑی

سلیم بک سنٹر لاہائی بازار سیالکوٹ 052-4592767
ویلکم بک پورٹ اُردو بازار، کراچی
کتاب گھر علامہ اقبال روڈ راولپنڈی
بلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ میاں چنوں 662650
میاں ندیم مین بازار جہلم 0544-621126
دارالادب تلمبہ روڈ میاں چنوں الرحمت سٹیشنری ڈسکہ
اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی
شمع بک ایجنسی فیصل آباد
ہاشمی برادرز کتب و رسائل گوردت سنگھ روڈ کوئٹہ
الیاس بک ڈپو جلال پور جٹاں
اسلامی کتب خانہ حافظ آباد
خان بک ڈپو حافظ آباد
نظامی کتب خانہ پاکپتن شریف
شکیل بک ڈپو سمندری
خالد کتاب محل اگوگی سیالکوٹ روڈ
لاثانی لائبریری ربوہ
زمان لائبریری ربوہ
سلیمی بک ڈپو احمد پور شرقیہ
جالندھر بک ڈپو ڈسکہ
پاکستان بک ڈپو مین بازار جلال پور جٹاں
کارنر سٹیشنری مارٹ مین بازار کھاریاں 510274
کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ 061-510444
صابر بک سٹال نسبت روڈ لاہور 37230780
کارواں بک سنٹر ملتان کینٹ
علمی بک ہاؤس لاہور
عزیز سٹیشنری مارٹ مین بازار کھاریاں
کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور
سلطان بک پیلس گجرات پنجاب بک ڈپو سرکلر روڈ گجرات
حافظ بک ایجنسی اقبال روڈ سیالکوٹ
وارث سنز بک ڈپو صرافہ بازار پنڈ دادنخان جہلم
کارواں بک سنٹر بہاولپور۔
مکہ بک سنٹر جلالپور جٹاں
مکتبہ کشمیر لالہ موسیٰ
رائل بک سنٹر چوک نواب گجرات
مقدر بک ڈپو گول چوک اوکاڑہ
کوثر بک ڈپو، لالہ موسیٰ
عثمان بک ڈپو، لالہ موسیٰ

محبت اس کو کہتے ہیں

شاہینہ چندا مہتاب

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37211468 - 37314169

دیدہ زیب اور
خوبصورت کُتب کا
واحد مرکز

تزئین واہتمام
نذیر محمد، طاہر نذیر

نام کتاب : محبت اس کو کہتے ہیں
مصنفہ : شاہینہ چندا مہتاب
سن اشاعت: جنوری 2013ء
اہتمام : محمد نذیر، طاہر نذیر
کمپوزنگ : عاصم شہزاد
ٹائٹل ڈیزائن: عاصم شہزاد 0306-4171117
مطبع ریاض شہباز پرنٹرز، لاہور
قیمت -/300 روپے

انتساب

یوں تو میرے چار بھانجے اور تین بھانجیاں ہیں لیکن آج کل میری پہلی اور آخری ترجیح میری تمام تر محبت اور توجہ کا مرکز دونوں چھوٹے ہیں کہ بڑے بہت بڑے ہوگئے اور یہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔

جی ہاں! اپنے دس برس کے بھانجے "حافظ محمد سبحان علی" اور نو برس کی پیاری سی بھانجی "حافظہ ایمان علی" کے نام......!

اللہ دونوں کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے۔ آمین ثم آمین!



ترتیب



مجھے کچھ کہنا ہے

خواتین کے ماہناموں نے اُردو کے فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے، اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دورِ حاضر کی بہت سی خواتین رائٹر ان ہی ماہناموں کے ذریعے اُبھر کر سامنے آئی ہیں۔ مصنفین کے اس جھرمٹ میں ایک روشن ستارہ ''شاہینہ چندا مہتاب'' کے نام سے جگمگا رہا ہے۔

کسی بھی ناول یا ناولٹ کی بنیاد، مرکزی خیال پر رکھی جاتی ہے۔ پلاٹ جتنا مضبوط ہوگا، کہانی پر لکھاری کی گرفت اتنی ہی اچھی ہوگی۔

شاہینہ چندا مہتاب اس بات کو بخوبی سمجھتی ہیں اور وہ کہانی کا تانا بانا بنتے ہوئے اس کے تمام منفی تقاضے نبھاتی ہیں۔ ان کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنہوں نے لکھنے میں کسی کی پیروی نہیں کی۔ ان کا لکھنے کا، بات کہنے کا ایک الگ ہی انداز ہے۔ ان کی تحریروں کی نمایاں خوبی، پختگی، برجستگی ہے۔ وہ درحقیقت اپنی تحریروں میں زندگی کے خدوخال کو کرداروں میں ڈھال کر پیش کرتی ہیں۔ وہ سماج کے بیشتر پہلوں کو بڑی خوبی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی تحریر میں رومان، آرزوئیں، خواب نئے انداز میں جنم لیتے ہیں اور کردار حقیقی صورتِ حال کو اُجاگر کرتے ہیں۔ وہ ماحول کی عکاسی اتنی خوب صورتی سے کرتی ہیں کہ کردار حقیقی زندگی سے رابطہ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ پڑھنے والے کو ان کے دُکھ سکھ ذاتی لگنے لگتے ہیں۔ وہ زندگی کے بڑے بڑے

مسائل کو بڑے آسان اور سادہ انداز میں اُجاگر کرتی ہیں۔ ان کی تحریر معصومیت سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ ہنستے ہنستے بڑے کام کی بات کہہ جاتی ہیں۔

شاہینہ چندا مہتاب جی کی اور میری رفاقت بڑی عجیب سی ہے۔ وہ آج سے دس سال پہلے میرے آفس میں آئیں تھیں، تب سے اب تک محبتوں کا یہ سفر جاری ہے۔ اگرچہ اگر گِنا جائے تو اس طویل عرصے میں ہماری گِنی چُنی آٹھ سے دس ملاقاتیں ہیں، وہ بھی پندرہ سے بیس منٹ پر محیط، جس میں صرف میں بولتی ہوں اور وہ دھیمی سے مسکراہٹ لبوں پر سجائے سُنتی رہتی ہیں۔ اس دوران وہ جو چند جملے بولتی ہیں، اس میں میرے لئے بے شمار چاہتیں، محبتیں اور خلوص ہوتا ہے جو میرے لئے قابل فخر اثاثہ ہے۔ پھر وہ ایک جملہ ان کا جو وہ جاتے ہوئے ہمیشہ کہتی ہیں۔

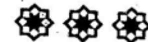
’’فوزیہ......! جتنی باتیں میں تم سے کرتی ہوں، کسی اور سے نہیں۔‘‘

میں حیرانگی سے سوچتی رہ جاتی ہوں، کون سی باتیں......؟ میں آپ کو بولنے کا موقع ہی کب دیتی ہوں......؟ یہ تو آپ کا ظرف ہے کہ آپ مجھے برداشت کرتی ہیں۔

شاہینہ چندا مہتاب جی......! میں ہمیشہ آپ کی محبتوں کی مقروض رہوں گی۔ آپ کی چاہتوں کا قرض میں کبھی نہیں اُتار سکتی اور نہ اُتارنے کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ کچھ قرض ایسے ہوتے ہیں جن کی ادائیگی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اپنی بات کو اس جملہ میں سمیٹوں گی۔

’’شاہینہ چندا مہتاب نام ہے، سراپا محبت کا۔‘‘

مدیرہ خصوصی
فوزیہ شفیق



محبت اس کو کہتے ہیں

سادہ براؤن سوٹ میں ملبوس ایک کاندھے پر بیگ نما تھیلا لٹکائے اور دوسرے ہاتھ میں چارٹ پکڑے سڑک کے کنارے وہ خراماں خراماں چلی جارہی تھی۔ اسمارٹ سی سرو قد وہ لڑکی بہت دلکش خدوخال اور شخصیت کی مالک تھی۔ ابھی ایک ہفتہ قبل ہی تو میرا اس سے تعارف ہوا تھا۔

میں اتفاق سے اپنے دوست اقبال کے گھر ہر دوسرے تیسرے روز جانے کا عادی تھا۔ کیونکہ اس کے دو خوب صورت شریر سے بیٹے مجھے بہت پیارے لگتے تھے۔ وہ دونوں بہت ذہین تھے۔ اس قدر پیاری پیاری باتیں کرتے کہ اگر میں کسی مجبوری کی وجہ سے خود نہ جا سکتا تو کم از کم فون پر ضرور بات کر لیتا۔

چونکہ اقبال سے میری بہت بے تکلفی تھی۔ اس لئے بغیر دستک دیئے ہی اندر چلا جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے گیٹ کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہتی تھی۔ تاہم کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلا

دیتا تھا۔

اقبال کی بیوی یعنی بھابی بہت ملنسار اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ انہیں خاتون کے نام سے یاد کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ان کی عمر ابھی بمشکل پچیس برس کے قریب رہی ہوگی۔ ابھی چھ ماہ قبل تو ان کی شادی ہوئی تھی۔ شروع شروع میں بہت شرماتی تھیں۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتی تھیں۔ مگراب ان سے میری اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اگر میں کسی روز ان کے گھر نہ جاتا تو وہ خود ہی فون کرتیں۔

’’ارے بھائی......! ایسی کیا مصروفیات ہوگئیں جو ہمارے گھر کا راستہ تک بھول گئے......؟‘‘

ہاں......تو بات ہو رہی تھی اس سرو قد لڑکی کی۔

اتفاق سے میں اس رات ان کے گھر گیا تو بھابی نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے انہیں اس سے قبل کبھی نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس لئے حیرت ہوئی۔ پھر بچے بھی دونوں غائب تھے۔ وہ یقیناً گھر میں نہیں تھے۔ اگر وہ گھر کے کسی حصے میں ہوتے تو اپنی موجودگی کا احساس دُور سے بھی دلا دیتے۔

میں بیڈ کے سامنے لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر اس نئی تبدیلی پر غور کرنے لگا۔ نہ جانے کیا وجہ تھی آج اقبال بھی ابھی تک نہ آیا تھا۔ بھابی کی نماز لمبی سے لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ بوریت سے بچنے کے لئے میں نے بیڈ پر رکھا ہوا میگزین اُٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگا۔

نہ جانے کیسے اچانک ہی مجھے احساس ہوگیا کہ ان کی نماز ختم ہوچکی

ہے۔ میں نے میگزین ہٹا کر دیکھا تو جاء نماز تہہ کر کے رکھ رہی تھیں۔

’’یہ تبدیلی کیسی بھابی جان......؟ اور بچے کہاں ہیں......؟‘‘

میں نے میگزین بیڈ پر پھینکتے ہوئے پوچھا۔

آواز سن کر وہ اُچھل پڑیں۔ پلٹ کر مجھے دیکھا او رآنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ گویا اس سے قبل وہ میری موجودگی سے بے خبر ہی تھیں۔

مگر یہ کیا......؟ یہ حادثہ اس کے ساتھ ہی نہیں، میرے ساتھ بھی گزرا اور میں گھبرا کر کرسی سے کھڑا ہوگیا۔

’’معاف کیجئے گا......! میں سمجھا شاید بھابی نماز پڑھ رہی ہیں۔ مگر آپ......آپ کون ہیں......؟‘‘

میں نے بغور اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا جس نے پیشانی تک کو چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس کی شکل بھی تھوڑی تھوڑی بھابی سے ملتی تھی۔ شاید اسی لئے میں دھوکا کھا گیا تھا یا پھر شاید ان کے گھر میں میں کسی دوسری عورت کی موجودگی کا خیال بھی نہ کرسکتا تھا۔

بہرحال کچھ بھی ہو، یہ طے تھا، اسے دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور جیسے ہی اس نے باہر جانے کے لئے قدم اُٹھایا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔

’’معاف کیجئے گا محترمہ......! مجھے نہیں معلوم تھا یہ آپ ہیں۔ میں اقبال کا دوست حماد ہوں۔ یہ بتائیں کہ وہ لوگ کہاں گئے......؟‘‘

’’وہ سب لوگ کسی دعوت میں گئے ہیں۔‘‘

اس کے صرف ہونٹ ہلے۔

”کب تک آئیں گے......؟“

میں نے پھر پوچھا۔

”معلوم نہیں......!“

اس نے اسی لہجے میں کہا۔

”اچھا تو میں چلتا ہوں......!“

میں نے یہ سوچ کر کہا کہ شاید وہ کہے۔

”آپ ان کے آنے تک بیٹھیں، میں چائے بناتی ہوں۔“

مگر وہ چپ کھڑی رہی اور میں واپس آگیا۔

اگلے روز میں اقبال کے آفس جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولا۔

”مجھے معلوم ہے تم کل آئے تھے۔ رات نازش بتا رہی تھی۔“

”اچھا تو اس کا نام نازش ہے......!“

میں نے سوچا۔

”مگر اقبال......! یہ تو بتا یار......! وہ کون ہے......؟ اور کہاں سے آئی ہے......؟“

”یار......! تمہاری بھابی کی فرسٹ کزن ہے۔ کراچی سے آئی ہے۔ یہ لوگ بھی لاہور ہی میں رہتے ہیں۔“

اقبال نے پوری تفصیل سے بتایا۔

”مگر تم کل کہاں گئے تھے......؟“

میں نے اس کی میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ کو اُچھالتے ہوئے

پوچھا۔

”ارے بھئی......! کل اسد کے گھر پارٹی تھی۔ اس نے بہت تاکید کی تھی کہ بھابی اور بچوں کو لے کر آنا۔ اسی لئے سب لوگ چلے گئے۔ مگر تم کہاں رہتے ہو آج کل......؟“

”بھئی......! ہاؤس جاب شروع ہو چکا ہے۔ پروفیسر صاحب بہت سخت ہیں۔ ہسپتال سے واپسی پر اتنا تھک جاتا ہوں، اسی لئے کچھ دنوں سے نہیں آ رہا تھا۔“

پھر اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد میں چلا آیا۔

دو دن بعد مجھے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو وہ محترمہ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی بلند آواز میں سلام کیا۔ اس نے پتہ نہیں جواب دیا تھا یا نہیں، تاہم میں نے اس کے ہونٹ ہلتے ضرور دیکھے تھے۔

پھر میرے بیٹھتے ہی وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں کافی دیر بیٹھا بھابی، بچوں اور اقبال سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اجازت لے کر چلا آیا۔

دوسرے دن میں پھر گیا، وہ پھر مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب تک میں بیٹھا رہا وہ کمرے میں نہ آئی۔ مجھے خود بھی دوسرے مردوں کی طرح لڑکیوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ جب میں واپس آیا تو میں نے سوچ لیا کہ اب دوسرے تیسرے دن جانے کی بجائے چار پانچ روز بعد جایا کروں گا۔

اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس کے بعد ایک ہفتہ میں بہت مصروف

رہا اور آج جب میں اقبال سے ملنے اس کے آفس آیا تو وہ بہت مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''شکر ہے تم خود ہی آگئے ورنہ میں خود تمہیں فون کرنے والا تھا۔''

''کیوں......؟ خیریت تو ہے......؟''

میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے......! کیا کر رہے ہو......؟ اُٹھو اُٹھو......!''

اقبال جلدی سے بولا۔

''بتا تو سہی کہاں جانا ہے......؟''

مجھے غصہ آگیا اور وہ مسکرا کر بولا۔

''معاف کرنا یار......! میں آج بہت مصروف ہوں، کھانے پہ گھر نہیں جا سکتا۔''

''پھر......؟''

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''پھر یہ کہ تمہاری بھابی کی وہ کزن یہاں ایک انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے چکی ہے۔ پینٹنگز کی ''الف، ب'' سیکھنے کے لئے میں صبح اس کو انسٹی ٹیوٹ چھوڑ آتا ہوں اور دوپہر میں گھر جاتے ہوئے ساتھ لے جاتا ہوں۔ لیکن آج میں بہت مصروف ہوں۔ تم یوں کرو اسے انسٹی ٹیوٹ سے لے کر گھر چھوڑ آؤ۔ وہ یہاں کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتی۔ کہیں گم نہ ہو جائے۔ دیکھو چھٹی کا ٹائم گزر چکا ہے۔ وہ یقیناً میرے انتظار میں گیٹ پہ کھڑی ہوگی۔''

اقبال نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس اب تم جلدی سے جاؤ......!''

''لیکن اگر اس نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو......؟''

میں نے اقبال کی لمبی چوڑی بات سن کر کہا۔

''جب تم اسے کہو گے کہ میں نے تمہیں بھیجا ہے تو وہ انکار نہیں کرے گی۔''

اقبال نے کہا اور فائل پہ جھک گیا۔

''او کے......!''

میں نے سر ہلایا اور باہر چلا آیا۔ مگر جب میں انسٹی ٹیوٹ پہنچا تو وہ گیٹ پر نہیں تھی۔ بس سٹاپ کی جانب جا رہی تھی۔ میں نے گاڑی آہستہ سے اس کے قریب لے جا کر روک دی اور کھڑکی میں سے سر نکالتے ہوئے کہا۔

''بات سنیں محترمہ......!''

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا پھر آنکھوں میں ناگواری اُبھری آئی۔

''معاف کیجئے گا محترمہ......!''

اس کے تیور دیکھ کر میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

''یوں گھور کر دیکھنے سے پہلے میری بات سن لیں......!''

''اقبال آج بہت مصروف ہے۔''

اس نے کہا تھا۔

''میں آپ کو گھر ڈراپ کر دوں۔''

میں نے پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور وہ ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے

ہوئے بیٹھ گئی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور پھر گھوم کر اسٹیئرنگ پر آ بیٹھا۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ راستے میں وہ خاموش سی بیٹھی رہی۔ میں نے گرمی کی وجہ سے ٹھنڈا پینے کی آفر کی۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ گاڑی گھر کے دروازے پر رُکتے ہی وہ اپنا سامان پکڑ کر باہر نکلی اور میں خود بھی گاڑی لاک کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

’’چاچو آ گئے......! چاچو آ گئے......!‘‘

مجھے دیکھتے ہی بچوں نے شور مچایا اور بھابی بولیں۔

’’کیوں بھائی......! اتنے دن کہاں رہے......؟‘‘

’’میں نے سوچا آپ کی مہمان ڈسٹرب نہ ہوں۔‘‘

میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ میری بات سنتے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

’’ارے بھئی......! نازش ایسی نہیں ہے۔‘‘

بھابی کہہ رہی تھیں اور میں کچھ دیر بچوں کے پاس بیٹھ کر چلا آیا۔

دوسرے دن میں ان کا شکوہ دُور کرنے کی غرض سے پھر ان کے ہاں چلا گیا اور وہ ہی بات......!

مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد میں ایک بار پھر گیا مگر وہ گھر نہیں تھی۔ اقبال کے ساتھ کہیں گھومنے گئی ہوئی تھی۔

پھر اچانک ایک دن میں نے اس کو ہارون روڈ کے ایک سٹاپ پہ پریشان سا کھڑے دیکھا۔ اس نے کچھ سامان اُٹھا رکھا تھا اور آنے جانے والی

بسوں اور ویگنوں کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ شاپنگ کے لئے آئی تھی۔ آسمان پر بادل بارش کے منصوبے بناتے ہوئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ موسم خوشگوار سا ہو رہا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا ہوا سوچتا رہا۔

’’اسے لفٹ کی آفر کروں یا نہیں......؟‘‘

آخر کچھ سوچ کر میں گاڑی اس کے قریب لے آیا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’یہ محض اتفاق ہے کہ میری آپ پر نظر پڑ گئی۔ پوچھ سکتا ہوں آپ یہاں کیسے......؟‘‘

’’کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ اس لئے چلی آئی۔ آپ یہ بتائیں کہ گھر پہنچنے کے لئے مجھے کس نمبر کی بس میں بیٹھنا چاہیے......؟‘‘

’’آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو چھوڑ دوں......؟ دراصل میں بھی گھر ہی جا رہا تھا۔‘‘

میں نے کہا اور وہ کچھ سوچتے ہوئے گاڑی کی عقبی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

گھر آیا تو بھابی سے پتہ چلا اقبال آفس کے کام کے سلسلے میں حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ اس پر جب میں نے انہیں بتایا کہ ان کی مہمان راستہ بھول چکی تھیں تو بھابی بولیں۔

’’میں نے تو اسے کہا تھا جب تک اقبال نہیں آتے، حماد تمہیں چھوڑ دیا کرے گا۔ مگر یہ مانی ہی نہیں۔‘‘

میں نے شکایت بھری نظروں سے نازش کو دیکھا تو وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بھابی بولیں۔

"اب اگر یہ گم ہو جاتی تو کتنی پریشانی ہوتی۔ کل سے تم ہی اس کو لے جانا اور چھوڑ جانا۔"

"اور اگر اس نے جانے سے انکار کر دیا تو......؟"

"نہیں......! میرا خیال ہے اب وہ ایسا نہیں کرے گی۔"

بھابی نے کہا اور میں اپنے شریر بھتیجوں کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔

صبح میں گاڑی لے کر آیا تو وہ تیار کھڑی تھی۔ مگر بے زاری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بھابی نے مجھے دیکھا اور کہا۔

"جاؤ نازش......! میرا دیور آج کے دور کا نوجوان ہوتے ہوئے بھی بہت سادہ اور شریف انسان ہے۔"

بھابی کی بات پر مجھے ہنسی آ گئی۔

"بھلا مرد کو بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے......؟"

مگر ہاں یہ سچ ہے کہ میں دوسرے مردوں جیسا نہیں تھا۔ نہ جانے اس کی وجہ کیا تھی......؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ میڈیکل کالج یعنی مخلوط جگہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود میں لڑکیوں سے ذرا دُور ہی رہتا تھا۔ میں تو خیر جو تھا سو تھا، مگر یہ بھابی کی مہمان نہ جانے خود کو کیا سمجھتی تھی......؟ کبھی کبھی مجھے خواہ مخواہ اس کے روّیے پر غصہ آنے لگتا مگر پھر میں سوچتا بھلا مجھے غصہ کیوں آ رہا ہے......؟ کیا اس لئے کہ وہ مجھ سے تکلف نہیں ہونا چاہتی......؟

مگر بے تکلفی کا یہ مرحلہ بھی خود بخود طے ہو گیا۔ اس ایک ہفتہ میں آہستہ آہستہ وہ مجھ سے مانوس ہو گئی یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ دوستی ہو گئی۔

اس نے بتایا تھا چونکہ اس نے ابھی دو تین ماہ کراچی میں رہنا ہے۔

اس لئے اس نے سوچا فارغ کیوں بیٹھا جائے۔ بہتر یہ تھا کہ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ لیا جائے۔ میں جانتا تھا ان تین ماہ میں وہ کچھ خاص نہ سیکھ سکے گی۔ مگر چپ رہا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اقبال حیدر آباد سے واپس آ گیا مگر انہیں دنوں فیکٹری میں ہونے والے ایک فراڈ کی تحقیق اس کے ذمے آ گئی اور اتفاق سے ان لوگوں نے ابھی تک نازش کو کراچی کی سیر بھی نہ کرائی تھی۔

جب اقبال نے دیکھا کہ نازش مجھ سے بے تکلف ہو چکی ہے تو یہ کام بھی میرے ذمے آ لگا۔ ادھر نازش جو پہلے مجھے دیکھتے ہی کمرے سے باہر چلی جاتی تھی۔ اب مجھے برداشت کرنے لگی تھی۔ بہرحال اقبال کے آنے کے باوجود نازش میری ہی ذمے داری بن گئی۔

اس روز جب نازش کے انسٹی ٹیوٹ آیا تو موسم بہت حسین ہو رہا تھا۔ میں نے فرنٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہے......؟ آج ذرا آؤٹنگ پر نہ چلا جائے......؟"

اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گویا وہ رضامند تھی۔ میں خوش ہو گیا۔ حالانکہ میرے دل میں اس کے لئے صرف احترام تھا اور کوئی جذبہ نہیں۔ ہم خوب جی بھر کے گھومے۔ بارش بھی شروع ہو گئی۔ اچانک میں نے گاڑی ایک ہوٹل کے باہر روکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا پینا پسند کریں گی آپ......؟"

"شکریہ......! میرے خیال میں تو اب گھر چلنا چاہئے......!"

اس نے آہستہ سے کہا اور مجھے خواہ مخواہ غصہ آ گیا۔ نہ جانے کیا سمجھتی

ہے اپنے آپ کو......؟ میں گاڑی بھگاتے ہوئے اقبال کے گھر آیا اور باہر ہی اس کو چھوڑ کر چلا گیا لیکن پھر مجھے خود پر غصہ آیا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں......؟

اس کی مرضی......! وہ جو چاہے کہے......! یہی وجہ تھی۔

اگلے روز میں پھر وہاں موجود تھا۔ سب سے پہلے میں اس کو میوزیم دکھانے لے گیا۔ پھر مزارِ قائداعظمؒ، اس کے بعد شاپنگ کے لئے چلے گئے۔

شاپنگ کے بعد مجھے اپنا ایک ضروری کام کرنا تھا اور جب میں اپنے ضروری کام سے فارغ ہوا تو میں نے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج تو میں بہت تھک گیا ہوں اور دوپہر میں کھانا بھی نہیں کھایا۔ کھانا تو خیر آپ نے بھی نہیں کھایا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو پہلے کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا نہ کھالیا جائے......؟"

"آپ چاہیں تو کھا سکتے ہیں مگر میں تو گھر جا کر ہی کھاؤں گی۔"

اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے......! پھر میں بھی گھر جا کر ہی کھاؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"ارے......! آپ تو ناراض ہو گئے......!"

وہ شاید پہلی بار مسکرائی تھی۔

"چلئے......! آپ کھانا کھالیں اور میں آئس کریم۔"

میں اسے ایک اچھے ہوٹل میں لے گیا۔ مجھے واقعی بہت بھوک لگ ہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم باہر آئے تو میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے

ہوئے پوچھا۔

"آپ میرا کالج دیکھنا پسند کریں گی......؟"

"کیوں نہیں......؟"

اس نے جلدی سے کہا اور اگلے روز میں اس کو انسٹی ٹیوٹ کے بعد میڈیکل کالج دکھانے لے گیا۔ اب وہ بھی پہلے والی کم گو لڑکی نہ تھی۔ تقریباً ہر موضوع پر وہ میرے ساتھ بات کرتی تھی۔ کالج دکھا کر جب میں اس کی معیت میں باہر آ رہا تھا تو سامنے سے آتے ہوئے میرے دوست اصغر نے نازش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ جبکہ دوسرے لوگ جو مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ الگ حیرت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ میں نے اصغر کو بتایا۔

"یہ مس نازش کراچی سیر و سیاحت کے لئے آئی ہیں۔"

میں نے تعارف کروایا تو وہ ایک دو باتیں کرنے کے بعد آگے بڑھ گیا پھر جب میں لائبریری میں نازش کے ساتھ کھڑا تھا تو لڑکے آپس میں ہمارے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

"ارے......! یہ حماد کے ساتھ آج لڑکی نظر آ رہی ہے۔"

میں نے راحت کی آواز سنی۔ وہ مجھ سے ایک سال جونیئر تھی اور آج کل فائنل ائیر میں تھی۔

"گویا جناب حماد صاحب بھی لڑکی کے چکر میں آ ہی گئے......؟"

یہ دوسری آواز تھی اور میں دانت پیس کر رہ گیا کیونکہ میرے ساتھ ساتھ یہ باتیں نازش بھی سن رہی تھی۔

"ویسے یار......! بڑا بے داغ کردار رہا ہے پورے کالج میں حماد کا۔

مگر آخر کار حوّا کی بیٹی ایک بار پھر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی......؟"

یہ تیسری آواز تھی اور چوتھی آواز نے تو رہی سہی ساری کسر پوری کر دی۔

"یار......! ویسے لڑکی ہے خوب صورت......! جوڑی بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

میں نے گھبرا کر پہلی بار نازش کو دیکھا۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو رہی ہو......؟ مگر اس کا چہرہ پرُسکون تھا۔ وہ میری جانب دیکھ رہی تھی۔ نظر ملتے ہی میرے چہرے کی کیفیت بھانپ کر بولی۔

"ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو سیدھی راہ جانے والوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ تو محبت کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ خود احمق ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بناتے ہیں۔"

میں نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا اور لائبریری سے باہر آگیا۔

اگلے روز وہ ساحل سمندر کی نرم ریت پر میرے ساتھ قدم بقدم چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آپ کو شاید علم نہیں کہ میرے خاندان میں کسی غیر مرد کے ساتھ گھومنا تو دُور کی بات، باتیں کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مجھے خود بھی یہ باتیں پسند نہیں تھیں مگر نہ جانے کیوں میں آپ سے باتیں کرتی رہی، گھومتی رہی۔ آپ جانتے ہیں اگر ہمارے خاندان کا کوئی فرد مجھے آپ کے ساتھ دیکھ

لے تو کیا ہوگا......؟"

وہ رُکی تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوگا......؟"

"وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے......!"

وہ بولی۔

"یہ تو بہت برا ہوگا۔"

میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور ہنس پڑا۔

"آپ ہنس رہے ہیں......؟"

وہ خفا ہوگئی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں کچھ لوگ اتنے رجعت پسند بھی ہو سکتے ہیں۔"

"کچھ نہیں......! بہت سارے خاندان ایسے ہیں۔"

وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"اچھا......! مگر اقبال بھی تو آپ کے خاندان کا ایک فرد ہے۔"

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"کراچی آکر تو وہ بہت آزاد خیال ہوگئے ہیں۔ میں ان کے گھر میں آپ کا یوں آنا جانا دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ مگر اب یہ حیرانگی ختم ہو چکی ہے۔ میں خود بھی آپ کے ساتھ گھوم رہی ہوں۔ آپ پہلے اجنبی مرد ہیں جن سے میں نے بات کی، جن کے ساتھ گھومی پھری ہوں اور اب سوچتی ہوں یہ کوئی ایسی بری بات تو نہیں۔ بعض مرد بھی اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے

ساتھ وقت گزارا جا سکتا ہے۔"

"بہت شکریہ آپ کا......! کہ اس ناچیز کو آپ نے یہ اعزاز بخشا......!"

میری یہ بات سن کر وہ کچھ جھینپ سی گئی۔

اس دن اس نے بہت باتیں کیں اور شاید خود میں نے بھی اپنی پوری زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی سے اس طرح بے تکلفی کے ساتھ باتیں کی تھیں۔

ایک روز میں اسے اپنا گھر دکھانے لے گیا۔ ممی اس سے مل کر بہت خوش ہوئیں پھر مجھ سے کہنے لگیں۔

"حماد......! تم پہلے کیوں نہیں لائے نازش کو میرے پاس......؟"

"پہلے کا ذکر چھوڑیئے، بس آج انہیں لے آیا ہوں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نازش میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر شرما سی گئی اور پھر باتوں کا ایک طویل دور شروع ہوگیا۔

اچانک ممی کو کھانے کا خیال آیا۔ انہوں نے ملازمہ کو آواز دی تو نازش نے کھانے سے انکار کر دیا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ ممی اُٹھ کر باہر گئیں تو میں نے کہا۔

"مس نازش......! یہ ہوٹل نہیں، ہمارا گھر ہے۔ یہاں انکار کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔"

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر کھانے کے لئے رضامند ہوگئی۔

اس طرح دن ہنسی خوشی گزارتے رہے۔ ایک صبح میں اس کو لینے گیا تو وہ اقبال کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اقبال بولا۔

"آج سے تمہاری ڈیوٹی ختم میں اس کو لے جا رہا ہوں۔ ہاں اگر تم پسند کرو تو واپسی پر اسے گھر ڈراپ کر دیا کرنا۔"

اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

انسٹی ٹیوٹ سے واپسی پر میں ہمیشہ اسے گھمانے لے جاتا۔ بعد میں گھر ڈراپ کرتا۔ پھر دُنیا کا وہ کون سا ٹاپک تھا جس پر اس نے مجھ سے بات نہ کی تھی......؟

ایک دن جب وہ اور میں ساحل سمندر پر بیٹھے باتوں میں مگن تھے کہ اس نے بتایا تھا کہ وہ چند روز بعد لاہور واپس جا رہی ہے۔

یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔ اچانک اپنے پیچھے قہقہے سن کر ہم چونک پڑے۔ کالج کی شریر لڑکیوں کا ایک گروپ گزرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"محبت......محبت اس کو کہتے ہیں......!"

وہ سب ہنستی ہوئی ہمارے قریب سے گزرنے لگی۔ میں نے مسکرا کر نازش کو دیکھا تو وہ بھی مسکرا دی۔ پھر پہلے والی بات کو دہراتے ہوئے بولی۔

"یہ لوگ نہیں جانتے محبت کس کو کہتے ہیں......؟ محبت کے تقدس سے ایسے لوگ کب آشنا ہوتے ہیں......؟ ان کے نزدیک ایک دوسرے کو دیکھا، چاہا، پھر شادی کے لئے کوشش شروع کر دی۔ یہ ہوگئی محبت، جبکہ محبت تو صرف روح کے لئے ہوتی ہے۔ باقی جو لوگ ایک دوسرے کی طلب محسوس کرتے ہیں، وہ محبت نہیں، ایک دوسرے انسان کی ضرورت محسوس کرتا رہا ہے۔ جس طرح مرد عورت، یہ محبت نہیں دستور ہوتا ہے، زمانے کا رواج ہوتا ہے۔ باقی رہی محبت، تو محبت میں کسی چیز کی طلب محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ

محبت تو روح کے لئے ہوتی ہے اور پھر وہ ہستی دُور کب ہوتی ہے جس کی طلب محسوس ہو......؟ وہ تو اپنے ہی اندر کہیں جگہ بنائے بیٹھی ہوتی ہے۔ محبت لفظوں کے اظہار کی محتاج نہیں ہوتی اور پھر محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔''

میں حیران سا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے انکار یا اقرار کی کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ایسے مواقع پر میں صرف اس کی موہنی صورت کو دیکھا کرتا تھا یا پھر سوچتا تھا۔

''کیا دُنیا میں کوئی اور لڑکی ایسی ہوگی......؟ اتنے اعتماد سے بات کرنے والی......؟ شاید نہیں......!''

یہ میرے اندر کی آواز تھی۔

پھر ممی کی طبیعت خراب ہونے کے سبب ان کے گھر نہ جا سکا۔ ایک شام جب میں گیا تو اس کی تیز آواز سن کر صحن میں ہی رُک گیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو کامی......؟''

وہ پوچھ رہی تھی۔

''آنٹی......! جب ہم بھی بڑے ہو جائیں گے تو پاپا کی طرح شیو کیا کریں گے......!''

عامی نے کہا۔

''اچھا......!''

اس کی سنجیدگی سے بھرپور آواز آئی۔

''مگر بیٹا......! تب تک اللہ میاں کے پاس داڑھی مونچھ ختم ہو چکی ہوگی۔''

''واقعی آنٹی......؟''

دونوں بھائیوں نے جلدی سے ایک ساتھ پوچھا۔

''اور کیا......؟ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں......؟''

اس نے کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں......! آنٹی......! ہم پاپا سے مانگ لیں گے۔''

یہ کامی تھا۔

''مگر اس وقت تو پاپا کی داڑھی مونچھ بھی ختم ہو چکی ہوگی۔''

نازش کے لہجے میں شرارت تھی۔

''سچ آنٹی......؟''

یہ عامی تھا۔

''چلو ہم درخت سے لے لیں گے۔''

''مگر درخت کی داڑھی مونچھ نہیں ہوتی۔''

وہ پھر بولی۔

''اچھا تو پھر کیا ہوگا......؟''

دونوں بھائیوں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''میں ان کو دیکھ نہیں رہا تھا مگر ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''آنٹی......! آنٹی......!''

وہ دونوں اچانک خوشی سے چیخے۔

''ہم چاچو سے داڑھی مونچھ لے لیں گے۔''

"تب تک ان کی داڑھی مونچھ بھی ختم ہو جائے گی۔"

اس نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی عامی، کامی کی آواز سنی۔ وہ دونوں کہہ رہے تھے۔

"اللہ میاں......! داڑھی مونچھ دے دے......! اللہ میاں......! داڑھی مونچھ دے دے......!"

اور نازش ان کی یہ دُعا سن کر زور زور سے ہنس رہی تھی۔ میں نے آج پہلی بار اس کی ہنسی کی آواز سنی تھی۔ یوں جیسے فضاء میں کلیاں چٹک رہی ہوں۔ میرا دل چاہا وہ یوں ہی ہنستی ہے اور میں......

"ارے......!"

اچانک میرے اندر سے کسی نے سرزنش کی۔

"یہ تو کیا سوچ رہا ہے......؟ یعنی وہ صدیوں پرانی بات کسی لڑکی سے چند دن بات کی اور محبت کا چکر شروع......؟ لاحول ولاقوۃ......!"

میں نے کہا اور پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوگیا۔ وہ معصوم سے انداز میں کھڑی اب تک ہنس رہی تھی۔ بھابی بھی مسکرا رہی تھیں اور عامی، کامی ابھی تک دُعا مانگ رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ اس نے منہ بند کر کے ہنسی ضبط کر لی مگر اس کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے عامی، کامی کو دیکھا جو بیڈ پر لیٹ کر ہاتھ اُٹھائے دُعا مانگ رہے تھے۔

"کیوں بھئی......! یہ کیا ہو رہا ہے......؟"

میں نے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

عامی کامی مجھے دیکھتے ہی اُٹھ گئے۔

"چاچو......! آنٹی کہتی ہیں......!"

"عامی......! کامی......! خبردار......! چپ......!"

وہ ان کو گھورنے لگی مگر وہ کہنے لگے۔

"چاچو......! آپ اپنی مونچھیں اُتار کر ہمارے لئے رکھ دیں۔"

ان کا اتنا کہنا تھا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے پٹ پکڑ کر ہنستے ہوئے باہر بھاگ گئی۔ بھابی بھی ہنسنے لگیں اور میں بھی مسکرانے لگا اور عامی، کامی پھر دُعا مانگ رہے تھے۔ میں نے انہیں بانہوں میں لے کر پیار کیا اور کہا۔

"بیٹا......! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم اللہ میاں سے کہہ دیں گے کہ وہ آپ کے لئے ابھی سے سٹاک کر دیں......!"

"سچ چاچو......!"

وہ دونوں خوش ہوگئے۔

"بالکل سچ......!"

میں نے ہنس کر کہا تو بھابی بولیں۔

"کیوں نا کل ہاک بے چلیں......؟"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے......؟ مگر بھابی......! کل کی بجائے اگر پرسوں جمعہ کو جایا جائے تو زیادہ اچھا نہیں رہے گا......؟"

میں نے اپنی رائے پیش کی۔

"نہیں بھئی......! جمعہ کو ہم لوگ نہیں جا سکتے۔"

"کیوں......؟ جمعہ کو کیا مجبوری ہے......؟"

"ارے......! تمہیں معلوم نہیں، پرسوں شالیمار سے نازل جا رہی ہے۔"

میرے اندر اچانک ہی پتا نہیں جانے کیا ہوا۔ میں اس جذبے کو کوئی نام نہ دے سکا۔ میں نے بڑی مشکل سے ظاہری طور پر خود کو نارمل رکھا۔ مگر اندر سے میرا دل بجھ سا گیا۔ بھلا وہ اتنی جلدی چلی جائے گی......؟ یہ میں نے کب سوچا تھا......؟ مین تو سمجھا تھا، مگر میں کیوں سمجھا......؟ اور پریشان کیوں ہوں......؟ آخر ایک دن تو اُس نے جانا ہی تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو......؟"

بھابی نے پوچھا تو میں چونک پڑا۔

"کچھ نہیں بھابی......! آپ سب لوگ تیار رہیئے گا۔ میں گاڑی لے کر آجاؤں گا۔"

میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں بھابی میرے چہرے سے کوئی اندازہ نہ لگا لیں۔

باہر آکر میں نے خود کو سمجھایا۔

"یہ مجھے کیا ہوگیا ہے......؟ کیا یہ محبت کی ابتداء ہے......؟"

"نہیں......!"

یہ محبت تو بڑی حماقت ہے۔ ویسے بھی میرے دل میں اس کے لئے محبت نہیں، صرف دوستی اور خلوص ہے۔ اگر کوئی دوست دُور جا رہا ہے، خاص کر جب آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ وہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ آپ اس کو

دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکیں گے تو دل اُداس ہوگا ہی۔

وہ بھی میری اچھی دوست بن گئی تھی۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں اُداس ہوں ورنہ اور کوئی خاص بات نہیں، جذبہ نہیں، میں نے دل سے کہا اور وہ مان گیا۔ یہ سراسر دھوکہ اور فریب تھا جو میں اپنے آپ کو دے رہا تھا۔

اگلے روز وہ شاید آخری بار میرے ساتھ تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔ اقبال اور بھابی عامی کی اچانک طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے نہ آسکے تھے۔ البتہ کامی کو ہم لوگ لے آئے تھے اور میں نے ہی اس کو اُٹھا رکھا تھا۔ وہ اور میں کتنی دیر سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہروں سے کھیلتے ہوئے گھومتے رہے، باتیں کرتے رہے۔

بار بار میرا دل چاہا اس سے پوچھوں۔

"کیا وہ جا کر مجھے یاد کرے گی......؟ خط لکھے گی......؟"

مگر میں اس سے کچھ نہ کہہ سکا اور نازش بھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے ایک بار بھی تو مجھ سے یہ نہیں کہا کہ وہ لاہور جا کر مجھ کو یا ان لمحوں کو یاد کرے گی۔ شام ہونے پر ہم لوگ گھر واپس آئے تو عامی کی طبیعت تھوڑی بہتر تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔

صبح میں پانچ بجے ان کے گھر پہنچ گیا۔ عامی، کامی ابھی سو رہے تھے۔ اگر جاگ رہے ہوتے تو یقیناً اس کے جانے پر ہنگامہ کرتے اور نازش چھوٹا پرس ہاتھ میں پکڑے بالکل تیار کھڑی تھی۔ بھابی سے مل کر وہ باہر آئی اور پیچھے بیٹھ گئی کیونکہ آگے میرے ساتھ اقبال بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے غور سے آئینے میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کھڑکی کے

باہر دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ذرا سی بھی اُداسی نہ تھی اور میں میرے احساسات نہ جانے کیوں عجیب سے ہو رہے تھے......؟

اسے پرسکون دیکھ کر میں نے سوچا وہ ٹھیک کہتی ہے۔

''محبت حماقت ہوتی ہے اور مجھے حماقت نہیں کرنی چاہئے......!''

میں نے سوچا اور دوسرے لمحے ہی میں پرسکون ہوگیا۔ اسٹیشن پہنچ کر اقبال نے اس کا بیگ اُٹھا کر اندر گاڑی میں رکھا اور وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اقبال باہر کھڑکی کے اس آ کر کھڑا ہوگیا۔ میں بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اقبال نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''گاڑی تو ابھی آدھ گھنٹہ بعد جائے گی۔ تمہیں اگر جلدی ہے تو تم چلے جاؤ......!''

''نہیں......! ایسی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔''

میں نے کہا اور دل میں سوچا۔

''ایسے لمحے میں جب کہ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کیوں چلا جاؤں......؟''

میں اس کو دیکھنے لگا۔ وہ صرف اقبال سے باتیں کر رہی تھی۔ بلکہ زیادہ باتیں اقبال ہی کر رہا تھا۔ وہ صرف ہوں ہاں ہی کر رہی تھی۔

پھر گاڑی نے رینگنا شروع کیا۔ اس نے ہم دونوں کو سلام کیا۔ گاڑی دیکھتے ہی دیکھتے دُور نکل گئی۔ تب اقبال بولا۔

''آؤ یار......! چلیں......!''

میں اس کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ اقبال کو آفس ڈراپ کر کے

میں ہاسپٹل چلا گیا۔ اگرچہ سارا دن مصروف گزرا مگر اچانک وہ مجھے یاد آتی اور میں ذہن سے اسے جھٹک دیتا۔ لیکن رات جب میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو نہ جانے اچانک دل میں عجیب سا درد محسوس ہوا۔ یوں جیسے اندر سے میرے کسی حصے کو کاٹا جا رہا ہو۔ میں گھرا کر کھڑا ہوگیا۔

اچانک ہی میرے اندر ویسی ہی تنہائی اور اُداسی تھی۔ جو کسی کے مرنے یا جدا ہونے پر ہوتی ہے۔ لگتا تھا جیسے میرا کوئی بہت اپنا، بہت ہی پیارا مجھ سے جدا ہوگیا ہو۔ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہو۔ میں بستر چھوڑ کر دریچے میں آ کھڑا ہوا اور اپنی کیفیت کے بارے میں سوچنے لگا۔

''یہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے......؟ کیا اس کی بھی یہی حالت ہوگی......؟''

''نہیں......! وہ تو آرام سے سو رہی ہوگی۔''

اور پھر محبت حماقت ہوتی ہے۔ میں نے بے چین دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر آج دل بغاوت پر آمادہ تھا۔ وہ محبت کو حماقت ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ محبت کو محبت ہی سمجھ رہا تھا۔ اور مجھے خواہ مخواہ بے چین کئے جا رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ میں اس کے جانے سے بکھر رہا تھا۔ حالانکہ پہلے کون سا میرے پاس ہوتی تھی......؟

ہاں......! مگر وہ میرے شہر میں تو ہوتی تھی۔ مگر آج گاڑی اس کو مجھ سے بہت دُور لے گئی تھی۔ میرے اندر ایک عجیب سی آگ لگ رہی تھی۔ ایک عجیب سا درد اور بے چینی تھی۔ میں گھرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ مگر وہ جلن، وہ آگ پھر بھی نہ بجھی۔ پہلی بار محسوس ہوا اور میں نے اعتراف کیا کہ میں اس

کے ساتھ محبت کرنے لگا تھا۔

چلو......! محبت کرنا کوئی جرم نہیں......! پھر اس نے کہا بھی تھا کہ محبت روح کے لئے ہوتی ہے اور انسان یاد اس کو کرتا ہے جو دُور ہو۔ محبت کرنے والی ہستی تو اپنے ہی اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر یاد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کی بات پہ میں نے پرُزور انداز میں سر ہلا کر تائید کی تھی مگر آج اس کی یہ بات مجھے تسلی نہ دے رہی تھی۔ میں کتنی دیر بے چین سا لان میں ٹہلتا رہا۔ پھر کمرے میں چلا آیا۔ ڈھائی بجے کے قریب میری آنکھ لگ گئی۔ مگر پرُ سکون نیند کے زمانے گزر گئے تھے۔

تین بجے پھر میری آنکھ کھل گئی۔ طبیعت میں وہی بے چینی تھی۔ میں کوشش کے باوجود پھر نہ سو سکا۔ صبح میرا اقبال کے گھر جانے کا بھی موڈ نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اب وہاں نہیں تھی۔ چار دن اسی تڑپ اور بے چینی کی نذر ہو گئے۔ مگر میری طبیعت میں کوئی فرق نہ ہوا۔

رہ رہ کر سوچتا۔

"مجھے اس سے اظہارِ محبت کر دینا چاہئے تھا۔"

ہو سکتا ہے پھر یہ جلن، یہ آگ اتنی شدید نہ ہوتی۔ مگر اب تو مجھے اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں تھا۔ بس ہر طرف ایک ہی صورت، ایک ہی نام اور ایک ہی صدا سنائی دیتی تھی۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا اور بہلایا۔

"یہ میں کیا کر رہا ہوں......؟ اگر محبت ہو ہی گئی ہے تو ایسی دیوانگی بھی کیا......؟ مگر بے فائدہ......!"

میں جتنا اس کو بھولنے کی کوشش میں تھا، وہ اتنی ہی شدت سے یاد آتی تھی۔ پھر میں کیا کرتا......؟

اپنی اسی دیوانگی میں ایک ہفتہ بعد میں گاڑی کا رُخ پنجاب کی جانب موڑ چکا تھا۔ اس بات کا احساس ہوا تو اس وقت جب میں حیدر آباد پہنچ چکا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں فوراً واپس مُڑ جاتا۔ مگر دل کی طور پر بھی واپس جانے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ سو میں آگے بڑھتا گیا اور بالآخر لاہور پہنچ گیا۔

دل کو تھوڑا سا سکون ملا مگر اب مسئلہ اس کے گھر کا تھا۔ اقبال نے بتایا تھا وہ لوگ شادمان میں رہتے ہیں۔ مگر گھر کے ایڈریس کا مجھے پتہ نہیں تھا اور اگر پتا ہوتا بھی تو کیا میں ان کے گھر جا سکتا......؟ اور اگر جاتا تو کہتا کیا......؟

لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ محبت حماقت ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی حماقت ہو چکی تھی اور میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے بات نہ کر سکوں گا، اسے مل نہ سکوں گا، اس کے باوجود کراچی سے لاہور آ گیا تھا۔

اس سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کروں تو کیا......؟ بہت سوچ کر میں نے گاڑی ایک ہوٹل کے باہر روکی اور اندر چلا گیا۔ تھکن سے برا حال تھا۔ اس پر بھوک بھی ستا رہی تھی۔ کیونکہ اس قدر طویل راستے میں میں نے کچھ بھی نہ کھایا تھا۔

کمرہ حاصل کرنے میں مجھے کوئی دِقت پیش نہ آئی۔ سب سے پہلے میں نہایا پھر کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ کتنی دیر لیٹا میں اس سے ملنے کے منصوبے سوچتا رہا۔ پھر گاڑی لے کر شادمان کی طرف روانہ ہو گیا۔ شادمان کوئی چھوٹا

سا محلہ نہ تھا، میں کبھی لارنس گارڈن کی جانب سے اس کی جانب نکل جاتا، کبھی اچھرہ کی جانب سے اور کبھی گلبرگ کی جانب سے۔ پورا شادمان خوب گھوم پھر کر دیکھا مگر نہ وہ ملی نہ اس کے گھر کا پتہ چلا۔

تھک ہار کر میں واپس ہوٹل آ گیا۔ رات عجیب سی بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں بل ادا کر کے ہوٹل سے نکل آیا۔ ایک چکر شادمان کا لگایا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ پھر ممی پاپا کی پریشانی کا احساس کرتے ہوئے واپس روانہ ہو گیا۔

تین دن بعد جب میں اپنے گھر اپنے شہر پہنچا تو ممی بہت پریشان تھیں اور پریشان کیوں نہ ہوتیں......؟ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

''حماد......!''

ممی مجھے دیکھتے ہی رونے لگیں۔

''بیٹا......! کہاں چلا گیا تھا تو......؟ ہم نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا......؟ حماد......! تمہیں میرا خیال نہیں تھا......؟''

''ممی......!''

میرا جی چاہا میں بھی انہیں چیخ چیخ کر بتاؤں۔

''میں خود نہیں گیا تھا۔ کسی کی محبت مجھے کھینچتی ہوئی لے گئی تھی اور یہ کہ ممی......! میں تین دن نہیں، تین صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا ہوں۔''

مگر میں ممی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ عجیب سی پیاس لگ رہی تھی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ کچھ اور نہ سوجھا تو میں ممی کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح

رونے لگا۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے حماد......؟ ارے......! تمہیں تو بخار بھی ہے۔''

ممی نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''حماد......! کہاں چلا گیا تھا تو......؟''

میں نے ممی کی آواز سنی پھر ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں نہیں جانتا، میں کب تک بے ہوش رہا......؟ ہوش آیا تو ممی اقبال کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

''اقبال......! یہ تمہارا بہت گہرا دوست ہے۔ تم معلوم کرو یہ اس کو کیا ہو گیا ہے......؟ تین دن کہاں غائب رہا ہے......؟ اب دیکھو، کل سے بے ہوش پڑا ہے۔ چار دن میں کیا ہو گیا ہے میرے بیٹے کا......؟ میں ایک ہفتہ سے اسے اَپ سیٹ سی دیکھ رہی تھی مگر مجھے معلوم نہ تھا۔ اس کی ایسی سیریس حالت ہو جائے گی۔''

وہ رونے لگیں۔

''پلیز آنٹی......! آپ فکر نہ کریں......! یہ ذرا ہوش میں آ جائے پھر میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گا۔''

اسی وقت میں نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی اور پانی مانگا۔ ممی بھاگ کر میرے قریب آئیں۔ اقبال نے سہارا دے کر مجھے اُٹھایا اور ممی نے گلیکوز ڈی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر میں پھر لیٹ گیا۔

''حماد......! اب طبیعت کیسی ہے......؟''

ممی نے پیار سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اور میں نے خشک ہونٹوں

پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا ہوا تھا ممی......؟ اور میں کب سے بے ہوش تھا......؟''

''تمہیں کچھ نہیں ہوا میری جان......! تو ٹھیک ہے......!''

ممی نے کہا اور اپنے آنسو چھپانے کے لئے باہر چلی گئیں۔

اقبال نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

''یہ کیا ڈرامہ کر رہے ہو......؟''

''ڈرامہ......؟''

میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔

اقبال نے میری کیفیت محسوس کر لی۔ غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ کیا حالت بنا لی ہے تم نے اپنی......؟ کیا ہوگیا ہے یار تجھے......؟ کہاں رہے تین دن......؟''

ایک ساتھ ہی اس نے کئی سوال پوچھے۔

میں اس کے سب سوال سن کر بھی چپ رہا۔ بھلا میرے اندر جو آگ تھی، جو جلن تھی، وہ تو اس کی محبت کی دین تھی۔ یہ درد تو اس کی امانت تھی۔ میں کسی سے اِس آگ کا ذِکر کیوں کرتا......؟ جو میرے لئے محبت کا پہلا تحفہ تھی۔ اور بھلا یہ بات بھی کسی کو بتانے والی تھی کہ میں کوچہ یار کی خاک چھاننے گیا تھا اور بھلا یہ بات بھی کسی کو بتانے والی تھی کہ میری یہ حالت اس ہستی کے جانے سے ہوئی ہے جو قریب تھی، تو میں نے اس کے قرب کو محسوس نہ کیا۔ وہ جو کچھ محبت کے بارے میں کہتی رہی، میں بغیر کسی پس و پیش کے

یقین کرتا گیا کیونکہ مجھے وہ بہت سادہ اور مقدس لگتی تھی۔ محبت کرنے کے باوجود میں اس کے سامنے یہ جذبہ محسوس نہ کر سکا۔

مگر جب وہ چلی گئی تو مجھے احساس ہوا، میری زندگی تو اس کے بغیر بہت سونی سی ہے اور وہ تو شاید میرے جذبے سے بھی بے خبر چلی گئی تھی۔ پھر میں کیوں سب کو وہ داستان سناتا جس کو سنانے سے اس کو رُسوائیاں ملتیں......؟

''نہیں......! میں اقبال کو کبھی کچھ نہ بتاؤں گا۔''

میں نے فیصلہ کیا اور مطمئن ہوگیا۔

اقبال جو میرے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہا تھا، بول پڑا۔

''یار حماد......! تم کیوں پریشان ہو......؟ خدا کے لئے مجھے بتاؤ......!''

''کیا بتاؤں تمہیں......؟''

میں نے طویل سانس لے کر اسے دیکھا۔

''تمہاری یہ حالت کیوں ہوگئی ہے......؟ اور تم تین دن کہاں غائب رہے......؟''

اس نے اپنا وہی سوال دہرایا۔

''بھئی......! ایک ضروری کام کے لئے میں تین دن مصروف رہا۔ باقی میری حالت، میرا خیال ہے یہ تھکن کا نتیجہ ہے۔''

میں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کیونکہ اتنی باتیں کرنے سے ہی میں تھکن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اقبال نے میری کیفیت محسوس کر لی اور اُٹھتے

ہوئے بولا۔

’’جلدی سے اچھے ہو جاؤ......! بچے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔‘‘

’’ہاں......!‘‘

میں نے آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔

’’کیا حال ہے ان کا......؟‘‘

’’وہ ٹھیک ہیں۔ بس تم اچھے ہو جاؤ......!‘‘

’’میں شاید کبھی اچھا نہ ہو سکوں......!‘‘

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

’’کیا بکواس کرتے ہو یار......! مرد بنو......!‘‘

اس نے کہا اور چلا گیا۔

’’مرد......؟‘‘

میں بڑبڑایا۔

’’تم کیا جانو......؟ یہ محبت بڑی ظالم اور بے رحم چیز ہوتی ہے۔ مضبوط سے مضبوط انسان کو بھی یہ نڈھال اور بے بس کر دیتی ہے۔ مگر تم کیا جانو......؟‘‘

میں پھر نازش کے بارے میں سوچنے لگا۔

’’پتہ نہیں وہ مجھے یاد کرتی ہوگی یا نہیں......؟‘‘

’’کیا سوچ رہے ہو حماد......؟‘‘

ممی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے پوری آنکھیں کھول کر ان کو دیکھا مگر چپ رہا۔

’’اُٹھو......! سوپ پی لو......!‘‘

وہ کہہ رہی تھیں۔ اتنے میں پاپا کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی پریشانی میں نے اپنے اندر تک محسوس کی۔

’’کیوں بھئی......؟ برخوردار......! کہاں رہے تین دن......؟ اور یہ کیا حالت بنا لی ہے......؟‘‘

وہ کرسی گھسیٹ کر میرے پاس بیٹھ گئے اور میں نے جواب سے بچنے کے لئے سوپ کا پیالہ پکڑ کر منہ سے لگا لیا اور ممی نے پاپا کو اشارہ کر دیا کہ ابھی کوئی بات نہ پوچھی جائے۔

ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔ طبیعت کبھی بہتر ہو جاتی، کبھی سستی سی چھا جاتی۔ ایسے میں اقبال جو مجھے روزانہ دیکھنے آتا تھا، ڈانٹ کر بولا۔

’’کیا بکواس ہے یار......؟ سارے گھر کو تم نے پریشان کر رکھا ہے۔ کب تک بستر سے دوستی رکھنے کا ارادہ ہے......؟ ارے......! بندے خدا کے......! تم ہمت سے کام لو......! اب ایسے بھی سیریس بیمار نہیں ہو کہ کمرے کی رونق بن کر رہ جاؤ......؟‘‘

وہ مجھے زبردستی اُٹھا کر باہر ساحل پہ لے آیا۔ کیونکہ سمندر ہمارے گھر کے سامنے ہی تھا۔ میں اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں وہ قدم بقدم میرے ساتھ چلی تھی۔ تب مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے جانے سے میری ایسی حالت ہو جائے گی......؟

فضاء میں ہر طرف ایک ہی لفظ کی بازگشت تھی۔

’’محبت......! محبت......! محبت......!‘‘

میں تھک سا گیا۔ میری حالت دیکھ کر اقبال گھبرا کر مجھے واپس لے آیا۔ ممی میری حالت دیکھ کر پھر رو پڑیں۔

تب میں نے خود کو سرزنش کی۔

''محبت میں نے کی ہے، سزا بھی صرف میری ذات تک ہونی چاہیے۔ باقی لوگوں کو میں کیوں پریشان کرتا ہوں......؟''

میں نے فیصلہ کیا۔

''میں صبح ڈیوٹی پر جاؤں گا۔''

دن تو بے چین ہو ہی گئے تھے، مگر مجھے ہمت سے کام لینا چاہیے۔

رات میں بستر پر لیٹ کر خود کو تیار کر رہا تھا کہ دریچے سے چودھویں کا چاند اندر جھانکنے لگا۔ اس کی زرد زرد چاندنی نے میرے اندر ایک عجیب سی اُداسی اور حسرت بھر دی۔ میں بے ساختہ اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ سمندر کی حالت مجھ سے مختلف نہ تھی۔ چاندنی راتوں میں وہ بھی کچھ زیادہ ہی شور کرتا تھا۔ میں کنارے پر بیٹھ کر اس ظالم کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا جس کی یاد میرے لئے زندگی بھی تھی۔

کسی شاعر نے شاید میرے ہی دن رات کی عکاسی اس شعر میں کی تھی۔

بے چین دن بے خواب راتیں تجھ سے وابستہ ہیں
ہم مگر پھر بھی تیری یادوں سے گریزاں ہیں
ہو ہی جاتی ہے پھر بھی ملاقات تیری یاد سے
مل جاتے یوں ہمیں جینے کے سہارے ہیں

اگرچہ اس کی یاد ہی اب میری زندگی تھی لیکن میں اس کی یادوں سے دامن چھڑا کر نارمل ہونا چاہتا تھا۔ ممی کے لئے پاپا کے لئے۔ میں نہ جانے کتنی دیر اور بیٹھتا کہ پاپا کی آواز سن کر چونک پڑا۔

''حماد بیٹے......! اتنی سردی میں بغیر کسی گرم کپڑے کے یہاں بیٹھے ہو......؟''

''یوں ہی پاپا......!''

اب میں اپنے دل کا حال انہیں کیا بتاتا......؟

''دیکھو بیٹا......! اگر کوئی مسئلہ تمہیں پریشان کر رہا ہے تو مجھے بتاؤ......! تم نہیں جانتے، تمہاری وجہ سے تمہاری ممی رات رات بھر نہیں سوتیں۔ اس وقت بھی اسی نے تمہیں دیکھا ہے اور مجھے بھیجا ہے۔ تم کیوں کرتے ہو یہ سب کچھ......؟ کیا بات ہے......؟''

''پاپا......! مجھے کوئی پریشانی نہیں......! بس دل گھبراتا ہے۔''

''اچھا......! چلو اندر......!''

میں پاپا کے ساتھ آیا تو ممی بھی گیٹ پر کھڑی تھیں۔ ان کے دُکھی چہرے کو دیکھ کر میں نے فوراً دل میں فیصلہ کر لیا۔

''خواہ کچھ بھی ہو جائے، اب اندر کا درد اندر ہی رہے گا۔ میں تو محبت کو تماشہ بنا رہا ہوں۔ مجھے نارمل رہنا چاہیے۔''

صبح میں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آیا تو مارے خوشی کے ممی پھر رو دیں۔

''ممی......! اب میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیوں پریشان ہوتی

ہیں......؟"

میں نے ان کو تسلی دی۔ ناشتہ کیا اور ہاسپٹل چلا گیا۔ رات میں اقبال کے گھر گیا تو بھابی اور بچے مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"ارے......! یہ کیا ہو گیا تمہیں......؟"

بھابی پوچھنے لگیں اور عامی، کامی بولے۔

"چاچو......! آپ نے اللہ میاں سے ہماری داڑھی تو نہیں لے لی......؟"

میں بے ساختہ ہنس پڑا اور شاید اس کے جانے کے بعد پہلی بار ہنسا تھا۔

"ہاں بھئی......! یہ تم نے داڑھی کس خوشی میں رکھ لی......؟"

اقبال نے پوچھا اور میں نے جھک کر کامی کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اتنے دن جب شیو نہ بنائی تو پھر عادت نہ رہی، ویسے داڑھی رکھنا کوئی بری بات تو نہیں......!"

"لگتا ہے زندگی سے دُور ہو گئے ہو......؟"

اقبال نے غور سے مجھے دیکھ کر کہا اور میں بس اس کو دیکھتا رہ گیا۔ کہتا بھی تو کیا......؟

"کیوں بھئی......؟ یہ سب کیا چکر ہے......؟"

بھابی نے چائے بنا کر مجھے دیتے ہوئے پوچھا اور میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"مسکرانے سے کام نہیں چلے گا۔ کہاں گئے تھے تین دن......؟ جہاں

سے بیمار بن کر لوٹ آئے......؟"

"یہ آپ کو اقبال نے تو سامنے نہیں کیا......؟"

میں نے ہنس کر پوچھا۔

"کیوں......؟ مجھے کوئی حق نہیں......؟"

بھابی نے گھور کر دیکھا۔

"سوری بھابی......! سب حق ہیں آپ کو......! اصل میں ایک نیا دوست بنا تھا۔ وہ اپنے گاؤں سندھ لے گیا۔ پھر نہ پوچھیں، میرا کیا حال ہوا......؟"

میں نے ان کو گول مول سا جواب دیا اور عامی، کامی کی باتیں سننے لگا۔

پھر باتوں ہی باتوں میں بھابی نے بتایا، نازش کا خط آیا تھا۔ میں نے خود کو لاپرواہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی ہوگی......؟"

"ہاں......! یہی لکھا ہے۔"

بھابی نے کہا اور دوسری باتیں کرنے لگیں اور میں نے سوچا۔

"نازش......! کیا میرا خلوص، میری دوستی کی اتنی وقعت بھی نہیں تھی کہ تم خط میں مجھے سلام ہی لکھ دیتیں......؟"

ضبط کے باوجود اندر کی آگ پھر زور پکڑنے لگی اور میں اجازت لے کر چلا آیا۔

دن حسب معمول گزرنے لگے تھے مگر اس کی یاد مٹنے کی بجائے کچھ

اور گہری ہوگئی تھی۔ دن کا وہ کون سا لمحہ تھا جب اس کی یاد نہ آتی تھی......؟

پھر ایک دن جب موسم بھیگا بھیگا سا ہو رہا تھا۔ میں گاڑی گھر سے نکال کر باہر سڑک پر لایا اور بہت وقت گزرنے پر مجھے احساس ہوا میں ایک بار پھر لاہور کا رُخ کر چکا ہوں۔ وہ جو میرے جذبے میری محبت سے بے خبر تھی۔ میں پھر اسی کے لئے جا رہا تھا۔

طویل ترین سفر کے بعد گاڑی لاہور کی حدود میں داخل ہوئی تو ایک سکون سا اپنے اندر اُترتا ہوا محسوس کیا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے ممی کی پریشانی کا خیال آیا۔ میں ہوٹل آیا جہاں پہلے بھی ایک دن ایک رات گزار کر جا چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ممی کو فون کیا اور بتایا کہ میں ایک دو روز تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ انہوں نے بہت پوچھا کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں مگر میں نے فون بند کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ نہ ملی۔

اگلے روز میں اُداس سا جب شادمان سے ہوتے ہوئے کراچی جا رہا تھا تو ریڈیو آن تھا اور شرافت علی اپنی پُرسوز آواز میں میرے دل کا حال بیان کر رہا تھا۔

دل بھی کرتا ہے چھپ کے یاد تجھے نام لیتی نہیں زباں تیرا
کس سے پوچھوں گا میں خبر تیری کون بتلائے گا نشاں تیرا
تیری رُسوائیوں سے ڈرتا ہوں جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں

حالِ دل بھی نہ کہہ سکا اگرچہ تو رہی مدتوں قریب میرے
تو مجھے چھوڑ کے چلی بھی گئی خیر قسمت میری نصیب میرے

اب میں کیوں تجھ کو یاد کرتا ہوں جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں

”اُف......!“

بعض دفعہ گانے بھی حقیقت کے کس قدر قریب ہوتے ہیں۔

”نازش......! کاش تم میرے جذبے کو سمجھ سکتیں......؟“

میں نے بے ساختگی میں اسے پکارا۔ مگر آگے پیچھے صرف گاڑیوں کا ہجوم تھا اور میں پھر ایک بار گانے کے بولوں میں کھو گیا۔

وہ زمانہ تیری محبت کا ایک بھولی ہوئی کہانی ہے
کس تمنا سے تجھ کو چاہا تھا کس محبت سے ہار مانی ہے
اپنی قسمت پہ ناز کرتا ہوں جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں

”نہیں نہیں......! ناز......! میں ہار نہیں مان سکتا۔ تمہیں میرے پاس آنا ہوگا۔“

میں کرب سے آنکھیں بند کر کے بڑبڑایا اور سامنے سے آتا ہوا ٹرک گاڑی پر چڑھ دوڑا۔

ہوش آیا تو میں ہسپتال کے بیڈ پر تھا مگر دماغ میں اب بھی گانے کے بول گونج رہے تھے۔

کوئی پُرسان حال ہو تو کہوں کیسی آندھی چلی ہے تیرے بعد
دن گزارا ہے کس طرح میں نے رات کیسے کٹی ہے تیرے بعد
روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں

یکایک نسوانی آواز سن کر میں چونک پڑا شاید یہ نرس کی آواز تھی۔

”دیکھو، کتنا ہینڈسم ہے۔ اگر اس کو کچھ ہو جاتا تو ماں کے دل پر کیا

گزرتی......؟ میرے بس میں ہوتا تو ٹرک والے کو سخت سے سخت سزا دیتی۔‘‘

’’تم ٹھیک کہتی ہو۔ آج کل ڈرائیور اندھے ہو کر گاڑیاں چلاتے ہیں۔‘‘

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دو نرسیں کھڑی باتوں میں مصروف تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ باہر بھاگ گئیں۔ کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر، انسپکٹر اور ٹرک ڈرائیور اندر داخل ہوئے۔ ٹرک ڈرائیور زور زور سے کہہ رہا تھا۔

’’جناب......! قصور میرا نہیں، اس لڑکے کا ہے۔ میں نے تو کوشش کر کے اس کی جان بچائی ہے۔ اگر میں نشے میں ہوتا تو یہ گیا تھا اپنی جان سے۔ مجھے تو یہ پاگل لگتا ہے۔‘‘

وہ خاموش ہوا تو ڈاکٹر بولا۔

’’ویسے انسپکٹر صاحب......! زخم زیادہ خطرناک نہیں۔ بس ونڈ سکرین کا شیشہ کرچیاں بن کر اُڑا تو اس نوجوان کو زخمی کر گیا۔ ہم کل اسے فارغ کر دیں گے۔‘‘

میں نے آنکھیں کھول کر انسپکٹر کو دیکھا اور کہا۔

’’انسپکٹر صاحب......! یہ حادثہ میری لاپرواہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ اس ٹرک ڈرائیور کو جانے دیں۔‘‘

مگر انسپکٹر میری بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر ان دونوں کو باہر لے گیا اور میں اپنی حالت دیکھ کر مسکرا دیا۔

پانچویں دن جب میں گھر پہنچا تو ممی مجھے پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر ایک بار پھر رونے لگیں۔

’’حماد......! یہ تجھے دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے......؟‘‘

’’کچھ نہیں ممی......! گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ آپ تو بس یوں ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔‘‘

میں ان کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا۔ نہا کر لباس تبدیل کیا پھر اقبال کے گھر چلا گیا۔ وہ لوگ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ قبل اس کے بھابی کچھ پوچھتیں، میں نے گرما گرم کافی کی فرمائش کر دی۔ وہ کچن میں چلی گئیں اور میں عامی، کامی سے باتیں کرنے لگا۔

’’اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا دماغ درست ہونے والا ہے۔‘‘

اقبال نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

’’اس کی کوئی ضرورت نہیں......! میں بالکل ٹھیک ہوں......!‘‘

میں نے مسکرا کر کہا۔

’’آخر چکر کیا ہے......؟ کہاں جاتے ہو......؟‘‘

اقبال نے آہستہ سے پوچھا۔

اور میں نے سوچا۔

’’اگر مجھے اس کی رُسوائیاں منظور ہوتیں تو پہلے ہی دن بتا دیتا۔‘‘

اتنے میں بھابی کافی بنا کر لے آئیں اور موضوع بدل گیا۔

ممی، پاپا نے مجھے گاڑی چلانے سے منع کر دیا تھا اور میرے لئے ایک صحت مند ڈرائیور رکھ دیا تھا۔ بقول ان کے آج کل میں اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ ایسے میں ڈرائیو کرنا خطرناک ہے۔ میں ان کے مقصد کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس لئے انکار نہ کیا۔

مجھے ہاؤس جاب کرتے ہوئے ایک سال پورا ہوگیا تھا اور ہاؤس جاب ختم ہونے پر مجھے مزید ڈگریوں کے لئے لندن یا امریکہ جانا تھا۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا۔ میں اس کے بغیر اکیلا نہیں جا سکتا اور نہ ہی رہ سکتا تھا۔

ایسے میں ایک دن ہاسپٹل سے واپس آتے ہوئے اقبال کے گھر آیا تو وہ خط پڑھ رہا تھا۔

"شاید یہ خط نازش کا ہو......؟"

میں نے دل میں سوچا اور بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اقبال نے خط بند کیا اور بولا۔

"یار......! تمہیں یاد ہے وہ لڑکی نازش جو یہاں آئی تھی......؟"

اقبال کا شاید خیال تھا، میں اس کو بھول چکا ہوں۔ مگر میں اقبال کو یہ نہ بتا سکا کہ وہ کراچی سے گئی ہی کب تھی......؟ وہ تو میرے اندر میرے دل میں براجمان ہوگئی تھی۔ وہ تو ہر لمحے میرے ذہن پر چھائی رہتی تھی۔ پھر میں اس کو کیسے بھول سکتا تھا......؟ لیکن جواب بہرحال مجھے دینا تھا۔

"اچھا......! نازش......؟"

میں نے بھابی سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا اسے......؟"

"یار......! ہوا کچھ نہیں، بس اس کی منگنی ہوگئی۔"

"کیا......؟"

چائے کا کپ میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور پوچھا۔

"کیا یہ خط نازش کا ہے......؟"

"ارے بھئی نہیں......! یہ میری بہن کا ہے۔ اسی نے اطلاع دی ہے کہ نازش کی منگنی ہو چکی ہے۔ نازش تو ایک ہی خط لکھ کر ہمیں بھول گئی۔"

اقبال نے کہا اور میں مزید وہاں نہ بیٹھ سکا۔ ابھی دو دن قبل ہی تو ممی نے کہا تھا۔

"حماد......! اب ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں، تمہاری نظر میں...... میرا مطلب ہے تمہاری کوئی پسند ہو تو بتا دو......!"

میں کتنی دیر چپ رہا، یہ سوچ کر کہ پہلے ایک بار اس سے مل لوں۔ کیا وہ بھی ایسا چاہتی ہے......؟ ممی نے جواب مانگا تو میں نے کہا۔

"میں سوچ کر بتاؤں گا......!"

مگر آج ہر سوچ ختم ہوگئی تھی۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ یعنی وہ آگ جو میرے اندر تھی، جو مجھے جلا رہی تھی، اس کی ہلکی سی تپش بھی اس تک نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ اپنی نئی زندگی کی تیاریوں میں لگ گئی تھی یہ جانے بغیر کہ میں موت کی تیاری کر رہا ہوں۔

ایک بار پھر مجھ پر وحشت سی طاری ہو رہی تھی مگر مجھے خود کو سنبھال کر رکھنا تھا۔ مجھے اندر ہی اندر اس اذیت، اس درد کو سہتے ہوئے ہوش کی دُنیا میں رہنا تھا۔ ویسے بھی اس درد سے تو زندگی بھر کا ساتھ ہوگیا تھا اور مجھے زندگی بھر لوگوں کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

میں بظاہر نارمل پھرتا تھا۔ مگر اندر کی کیفیت کیا تھی......؟ یہ کوئی دلِ بے چین سے پوچھتا۔

چھ ماہ کا عرصہ مزید گزر گیا۔ پھر ایک دن اقبال نے بتایا، اس کی بہن کی شادی ہے۔ وہ پنجاب جا رہا ہے۔ اس نے مجھے بھی دعوت دی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پرائی ہو چکی ہے، میں آخری بار اسے دیکھنے کے خیال سے اقبال کے ساتھ آ گیا۔

ہم لوگ تقریباً بارہ بجے کے قریب لاہور پہنچے۔ آتے ہی اقبال نے کہا۔

"یار......! تم آرام کرو......! مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔"

میں نے نہا کر کھانا کھایا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ پھر اسی کے خیالوں میں گم نیند بھی آ گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ جب اقبال نے مجھے جگایا۔ وہ کسی کام سے جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ واپسی پر وہ بولا۔

"چلو یار......! نازش کو بھی ایک نظر دیکھتے چلیں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے موٹر سائیکل نازش کے گھر کے باہر روکی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے میں کئی بار گزرا تھا مگر وہ نہ ملی تھی۔ دروازہ نازش کے بھائی نے کھولا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ باتوں کا دور شروع ہوا۔ چائے کا دور چلا۔ نازش کی امی بھی وہیں آ گئیں۔ مگر وہ نہ آئی۔ تب مجھے یاد آیا، نازش نے کہا تھا۔

"ہمارے خاندان میں غیر مردوں سے پردہ کیا جاتا ہے۔"

اس کو کیا معلوم کہ میں صرف اسی کی خاطر اتنی دُور سے آیا تھا۔

اچانک میں اقبال کی بات سن کر چونک پڑا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"نازش کی طبیعت اب کیسی ہے......؟ مجھے تو امی نے بتایا کہ وہ ایک طویل عرصہ سے بیمار ہے۔"

"تو کیا وہ بیمار ہے......؟"

میں نے اپنے دل میں سوچا اور نازش کی امی بولیں۔

"کیا بتاؤں......؟ سال بھر ہونے کو آیا ہے۔ مگر طبیعت نہیں سنبھلتی۔ شروع شروع میں تو ہم لوگوں نے کچھ زیادہ توجہ نہ کی۔ مگر چھ ماہ قبل جب اس کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تو یکے بعد دیگرے بہت سے ڈاکٹر بدلے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بیماری کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آئی۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے کہا۔ مریضہ کی شادی کر دی جائے۔ اسی وقت منگنی کر دی۔ مگر منگنی کے بعد اس کی طبیعت اور بھی خراب رہنے لگی۔ اب سوچتی ہوں، اس کی طبیعت کچھ سنبھلے تو اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں......!"

اُف کہہ کر امی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھنے لگیں۔

"ارے......! اتنی خراب ہے طبیعت اس کی۔ یار حماد......!"

اقبال نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"ذرا ایک نظر تم بھی اسے دیکھ لو......! خالہ جان......! یہ بھی ڈاکٹر ہیں۔"

اقبال نے کہا اور ہم تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اچانک باہر سے کوئی دستک دیتا ہوا اندر آ گیا۔ نو وارد کو دیکھ کر اقبال اور نازش کا بھائی وہیں رُک گئے اور میں نازش کی امی کے ساتھ اس کے کمرے میں آیا۔ اسی وقت نازش کی بھابی نے اپنی ساس کو پکارا اور وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔

’’تم اندر بیٹھو بیٹا......! میں بات سن کر آتی ہوں۔‘‘

وہ چلی گئیں۔ میں نے پردہ ہٹا کر اندر دیکھا اور ایک ہی لمحے میں دل پر گویا قیامت سی گزر گئی۔

بیڈ پر لیٹی ہوئی وہ کمزور سی لڑکی نازش کب لگ رہی تھی......؟ اس کے برہانے رکھا ٹیپ ریکارڈ بج رہا تھا اور حکیم ناصر محمد کی غزل عابدہ پروین اپنی خوب صورت آواز میں گا رہی تھی۔

جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے
سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اُٹھا رکھا ہے
اس کے دل پر بھی کڑی عشق میں گزری ہوگی
نام جس نے بھی محبت کا سزا رکھا ہے

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ پتہ نہیں وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی......؟ مگر آنکھیں بند تھیں۔ اس کا خوب صورت اور دل کش چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب نمایاں تھا۔ وہ پہلے والی نازش کب رہی تھی......؟ یہ تو کوئی اور ہی لگ رہی تھی۔ میرا دل تڑپ اُٹھا۔

’’نازش......!‘‘

میں نے بے تابی اور بے قراری سے پکارا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ کتنی دیر حیرت زدہ سی میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں زندگی کی چمک کی جگہ ایک ویرانی تھی۔

پہلی بار مجھے معلوم ہوا، میں اس آگ میں اکیلا کب جلا تھا......؟

محبت کا درد میں نے اکیلے کب سہا تھا......؟ وہ اس تپتے ہوئے ویران اور پُر درد صحرا پر قدم بقدم میرے ساتھ چلی تھی۔ سفر کی اذیت اور تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں بھی کتنا بے وقوف تھا جو یہ سمجھتا رہا کہ میں تنہا اس آگ میں جل رہا ہوں۔

’’بھلا شمع سے پہلے بھی کبھی پروانہ جلا ہے......؟‘‘

میری شمع بھی پہلے خود جلی تھی مگر وہ بڑے حوصلے کی مالک تھی۔

’’محبت......!‘‘

میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت اس کی امی اندر داخل ہوئیں۔ پہلے ٹیپ ریکارڈ بند کیا اور بولیں۔

’’ڈاکٹر نے کہا ہے، یہ تنہا نہ رہے۔ اب گھر میں اس کی کوئی بہن تو ہے نہیں۔ بس ٹیپ ریکارڈر ہے۔ یہی سارا دن سنتی رہتی ہے۔ ویسے بیٹا......! یہ خود بھی شاید اچھا ہونا نہیں چاہتی۔ دیکھو نا، اچھا بھلا انسان چارپائی پر لیٹ کر بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کو میں بہت کہتی ہوں بیٹی......! کمرے سے باہر نکلا کرو۔ چلنے پھرنے سے تندرستی ملتی ہے۔ مگر یہ مانتی ہی نہیں۔ اسے میری بھی پریشانی کا احساس نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے اسے......؟‘‘

وہ پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔ میں نے جھک کر نازش کا ہاتھ پکڑا اور نبض دیکھنے لگا۔

اس نے آنکھیں کھول کر ایک بار پھر مجھے دیکھا اور بمشکل بولی۔

’’میں ٹھیک ہوں......!‘‘

"کہاں ٹھیک ہو......؟"

اس کی امی بول پڑیں اور میں صرف اس کو دیکھ کر رہ گیا۔ مجھے تو اتنی تنہائی بھی نہ ملی تھی کہ میں اس سے حالِ دل ہی کہہ سکتا۔ مگر مجھے یقین تھا ج طرح میں نے اس کی آنکھوں میں محبت کی جلتی ہوئی چنگاری دیکھ لی تھی، اسی طرح اس نے بھی میرے دل کی بے قراری کو محسوس کیا ہوگا۔ اگرچہ ہم دونوں زبان سے ایک دوسرے کو کچھ نہ کہہ سکے مگر آنکھوں نے ایک دوسرے کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ بہرحال میں نے اس کی والدہ سے کہا۔

"آپ ان کی خوراک کا خاص خیال رکھیں اور ان کو اکیلا نہ رہنے دیں......!"

یہ بات میں نے اس لئے کہی تھی، مجھے معلوم تھا وہ اگر یوں ہی بند کمرے میں درد سہتی رہی تو ختم ہو جائے گی۔ پھر اقبال اور نازش کا بھائی بھی آ گئے۔

"ارے ناز......! یہ تمہیں کیا ہوا......؟ تم تو اچھی بھلی تھیں......؟"

اقبال بہت زیادہ حیران ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر جواب میں وہ بمشکل مسکرائی مگر کہا کچھ نہیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر ہم لوگ چلے آئے۔ اسی رات میری اپنی طبیعت پھر سے خراب ہوگئی۔ تو میں نے خود کو سرزنش کی۔

"جب وہ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر رہی ہے تو مجھے بھی کرنا ہوگا۔"

بارات والے روز جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے، میں نے سوچا۔

"یہ اچھا موقع ہے۔ مجھے کم از کم ایک بار تو اکیلے نازش سے ملنا ہی چاہئے......!"

یہ سوچ کر میں چلا آیا۔

گھر میں اس کے پاس صرف ایک ملازمہ تھی۔ مجھے دیکھ کر نازش گھبرا گئی۔

"آپ کیوں آئے ہیں......؟"

اس نے آہستہ سے پوچھا۔

میرا جی چاہا، آج اس کے سامنے محبت کا اقرار کرلوں۔ آج اس کے نرم گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کو سینے سے لگا کر اس کا سارا کرب، سارا درد، ساری اذیت اپنے اندر سمیٹ لوں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ اقبال کا گھر نہیں ہے۔ میں نے آپ کو اپنے خاندان کے بارے میں بتایا تو تھا۔ پھر بھی آپ چلے آئے......؟"

"تمہیں ایسی حالت میں دیکھ کر میں بے چین ہوگیا ہوں نازش......! یہ اچانک تمہیں کیا دُکھ ملا کہ تم ایسی ہوگئیں۔ تمہیں کیا ہوا ہے......؟ مجھے نہیں بتاؤ گی......؟"

اس نے گہری سانس لے کر مجھے دیکھا اور بڑے ضبط سے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا......! اور اگر کچھ ہوا بھی ہے تو وہ کسی کو بتانے والا کب ہے......؟ آپ بھی چپ رہئے۔ کیونکہ چپ رہنا ہی ہمارے لئے بہتر

ہے۔ اب آپ جایئے......! اور یاد رکھئے......! اگر محبت کوئی ایسا جذبہ ہے تو صرف روح کے لئے۔"

وہ خاموش ہوگئی اور میں اُٹھ کر آگیا۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا......؟



شادی سے دو دن بعد ہی میں اور اقبال واپس کراچی لوٹ آئے۔ بھابی کا بھی مزید رہنے کا پروگرام تھا۔ راستے میں اقبال نے مجھے بتایا۔

"ان لوگوں کا ارادہ اگلے ماہ نازش کی شادی کر دینے کا ہے۔"

میں یہ سب سن کر چپ رہا کیونکہ میں جانتا تھا ایسا ہی ہوگا۔

گھر واپسی پر ممی نے ایک بار پھر میری پسند پوچھی تو میں نے محض ممی پاپا کا ہی خیال کرتے ہوئے کہا۔

"ممی......! جسے آپ پسند کریں......! میرا مقصد تو محض آپ کی خواہش کی تکمیل کرنا ہے۔"

ممی میری بات سن کر خوش ہوگئیں۔

پھر ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی میری شادی ہوگئی۔ شادی کی رات اپنے کمرے میں جاتے جاتے نہ جانے اچانک میرے دل کو کیا ہوا......؟ میں گھبرا کر باہر سمندر کے کنارے آ بیٹھا اور سوچا۔

"میں اس بات کو کیسے برداشت کروں گا کہ میرے کمرے میں نازش کی جگہ کوئی اور لڑکی بیٹھے اور پھر عذرا کے پاس جا کر کہوں تو کیا......؟ چند

جھوٹے الفاظ......؟ چند جھوٹی باتیں......؟ چند جھوٹی قسمیں......؟ کیونکہ میرے پاس میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں تھا۔"

میں نازش کے بارے میں سوچنے لگا۔

"کیا اس کی بھی ایسی حالت ہوئی ہوگی میری جگہ کسی اور کو دیکھ کر......؟ ہوسکتا ہے ایسا نہ ہوا ہو......؟ ہوسکتا ہے وہ اپنے پیا کے سنگ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہو......؟ اور مجھے بھی فراموش کر چکی ہو......؟"

"حماد......!"

اچانک پاپا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونک پڑا۔

"یہ شادی تمہاری پسند پر نہیں ہوئی کیا......؟ تمہاری کوئی اپنی پسند تھی......؟ تم کیوں پریشان ہو......؟ مجھے بتاؤ......!"

"کچھ نہیں پاپا......!"

میں نے افسردگی سے کہا۔

"پھر یہاں کیوں بیٹھے ہو......؟ عذرا کیا سوچ رہی ہوگی......؟ چلو بیٹا......! اپنے کمرے میں۔"

پاپا نے کہا اور میں ان کے ساتھ آ گیا۔

شادی کے فوراً بعد میں مزید ڈگریوں کے لئے لندن چلا گیا۔ عذرا بھی میرے ساتھ تھی۔ مگر اس کے باوجود میں نازش کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ اگرچہ مجھ معلوم تھا۔ اس کی بھی شادی ہو چکی ہوگی۔ مگر اس نے خود ہی کہا تھا۔

"محبت روح کے لئے ہوتی ہے......! اگر اس کے علاوہ کچھ ہوتا ہے تو صرف ضرورت یا طلب......!"

عذرا سے شادی میں نے ماں باپ کا فرض سمجھ کر کی تھی۔ اس کی ہر خواہش کا احترام بھی میں فرض سمجھ کر ہی کیا کرتا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد جب خدا نے مجھے پیارا سا بیٹا گوشی دیا تو میں نے محسوس کیا، وہ بھی مجھے نازش کی طرح عزیز تھا۔

پانچ سال لندن میں رہ کر میں مزید ڈگریاں لئے واپس کراچی آ گیا۔ صرف ممی اور پاپا کے لئے ورنہ دل نہیں چاہتا تھا کہ میں اس جگہ جاؤں جہاں مجھے میری محبت نہ مل سکی تھی۔

واپس آتے ہی میں نے اقبال کو خط لکھا جس کی میری عدم موجودگی میں ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ مگر خط کا جواب نہ ملا۔ حالانکہ ممی نے کہا تھا۔ یہی ایڈریس اقبال نے انہیں بھیجا تھا۔

بہرحال میں نے اپنا کام شروع کر دیا، ایک مقامی ہاسپٹل میں۔ گھر میں ممی پاپا گوشی کو پا کر بہت خوش ہوئے تھے اور عذرا، اس کا کبھی پتہ ہی نہ چلا تھا، خوش ہوتی ہے یا ناراض......؟

مارچ میں اچانک میرے ٹرانسفر آرڈر آ گئے۔ میرا تقرر مری کے سینی ٹوریم میں بطور سرجن کر دیا گیا۔ عذرا نے یہ سنا تو بگڑ گئی۔ اس نے صاف کہہ دیا، وہ کراچی کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ نہیں جائے گی۔ ممی پاپا نے بھی اس کی بات کی تائید کی اور میں نے ان سے کہا۔

”ٹھیک ہے عذرا......! اور گوشی آپ کے رہے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ میرا تقرر دوبارہ کراچی ہو جائے۔ لیکن اس وقت تو بہرحال مجھے جانا ہے۔“

میں نے اپنی ضروریات کا سامان پیک کیا اور روانہ ہو گیا۔ پہلے ہی دن جب میں ایک وارڈ کا معائنہ کر رہا تھا تو اچانک بیڈ نمبر چار پر لیٹی مریضہ کو دیکھ کر میرا دل و دماغ جھنجنا اُٹھا۔ دل درد سے تڑپ اُٹھا۔ میرے اندر سے کوئی چلایا۔

”نہیں......! یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟“

مگر یہ ہو چکا تھا۔

ہاں......! وہ میری زندگی، میری محبت اور میرے دل کا سکون نازش ہی تھی۔ قریب کھڑی نرس نے بتایا یہ دو دن سے بے ہوش ہیں۔ میں نے ایک بار پھر اس کو غور سے دیکھا۔ اس کے جسم اور چہرے پر صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گہرے حلقے تھے۔ میں نے فوراً اسے الگ کمرے میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔

میرے ساتھ جو دوسرے ڈاکٹر تھے، وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ مگر آج مجھے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ میں نے جیسے تیسے وارڈ کا معائنہ کیا اور نرس سے کہا کہ وہ مریضہ کی کیس ہسٹری لے کر فوراً میرے کمرے میں آئے۔ نرس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔

میں نے اس کی کیس ہسٹری پڑھی تو آنکھیں بھیگ گئیں۔ بیماری آخری سٹیج پر تھی۔ وہ ایک سال قبل اس جگہ آئی تھی۔ مگر بیماری کم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی اور اب......

”نہیں نہیں......!“

میں کانپ اُٹھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ وہ نہیں مر سکتی۔ میں اس کو مرنے نہیں دوں گا۔''

میں فوراً اُٹھ کر اس کے کمرے میں آیا۔ اس کی حالت پہلے جیسی تھی۔ نرس اس کے قریب کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔

''ان سے ملنے کوئی نہیں آتا......؟''

میں نے نرس سے پوچھا۔

''سر......! تقریباً چھ ماہ سے ان سے ملنے کوئی نہیں آیا۔''

''اچھا......؟''

میں نے نرس کو جانے کا اشارہ کیا اور خود اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں ماضی گھومنے لگا۔ اس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب وہ ہوش میں آئی۔ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور نقاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب......! میرے گھر آپ لوگوں نے اطلاع نہیں دی کیا......؟ اس آخری وقت میں میرا کوئی بھی اپنا مجھ سے ملنے نہیں آئے گا کیا......؟''

اس کے چہرنے پر بے چارگی تھی۔

میں تڑپ اُٹھا۔ وہ انا، وہ خول جس میں میں نے خود کو بند کر رکھا تھا، اور وہ اُصول کہ محبت روح کے لئے ہوتی ہے، میں سب کچھ بھول کر اس پر جھکا اور اس کو سینے سے لگا کر سسک پڑا۔

''نازش......! ناز......! جان......! دیکھو...... یہ میں ہوں...... حماد......

تمہارا حماد......! یہ تم نے کیا کیا ناز......؟ میں تو اب تک یہی سوچ کر زندہ تھا کہ تم اپنے گھر میں خوش ہوگی......؟ اپنے شوہر کی سنگت میں خوش گوار زندگی بسر کر رہی ہوگی......؟ مگر تم تو یہاں اکیلی پڑی زیست کی گھڑیاں گن رہی ہو؟

ناز......! تم تو میری محبت تھیں۔ تمہارے آنے کے بعد تو میرے لئے ہر چیز میں سے کشش ختم ہوگئی تھی۔ میں تمہارے لئے تمہارے شہر کے چکر لگاتا رہا مگر تم سے کبھی ملاقات اس لئے نہ کی کہ تم نے کہا تھا، محبت روح کے لئے ہوتی ہے۔

نہیں ناز......! یہ جھوٹ ہے۔ تم نے جھوٹ کہا تھا کہ محبت روح کے لئے ہوتی ہے۔ محبت انسانی وجود کے لئے بھی ضروری ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زلیخا کو دوبارہ جوانی کیوں عطا کی جاتی......؟ محبت کے بغیر تو انسان لاش بن جاتا ہے۔ مٹی کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ محبت جتنی روح کے لئے ضروری ہے، اتنی ہی انسانی وجود کے لئے بھی۔

دیکھو میرے جسم کو جو تمہاری محبت کی آگ میں جلتا رہا ہے اور خود بھی ناز......! میں تمہاری وجہ سے چپ رہا مگر کسی سے دل کا درد نہ کہہ سکا۔

ناز......! تم نے مجھے چپ رہنے کا کیوں کہا......؟ تم نے ایک بار تو مجھے بولنے کی اجازت دی ہوتی۔''

میں بولتے بولتے تھک گیا اور اس کے بالوں پر سر رکھ کر چپ ہوگیا۔

اور وہ گم سم سی میرے سینے پر سر رکھے چپ چاپ روتی رہی، بغیر آواز کے۔

"ناز......!"

میں نے اس کا چہرہ اپنی جانب کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں مجھ سے محبت تھی اور ہے، مگر تم آج بھی چپ ہو؟ آج تو چپ نہ رہو ناز......! آج تو مجھے بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے محبت تھی۔"

میری یہ بات سن کر وہ ایک بار پھر رونے لگی اور میری آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔

"ناز......!"

میں نے محبت سے پکارا۔ اس نے چہرہ اوپر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"حماد......! میں جب کراچی میں تھی تو اس جذبے کو محسوس نہ کرسکی اور محسوس کرتی بھی کیسے......؟ جبکہ ایسی کوئی بات ہی نہ تھی۔ مگر یہ کیا......؟ جیسے ہی گاڑی اسٹیشن چھوڑ کر آگے بڑھی، تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنی کوئی قیمتی چیز وہیں بھول آئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہ آیا وہ قیمتی چیز کیا ہے......؟ میں مضطرب سی کبھی اُٹھتی کبھی بیٹھتی، تب اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں تو آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔

یہ حقیقت بڑی جان لیوا تھا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اب میں کبھی دوبارہ کراچی نہیں جاسکتی۔ آپ سے مل نہیں سکتی۔ مگر یہ جذبہ......"

وہ بولتے بولتے تھک سی گئی اور کھانسنے لگی۔ میں نے لپک کر جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیلا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے پانی پی کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے گلاس میز پر رکھ کر اس کے بہتے ہوئے آنسو

صاف کیئے اور وہ دوبارہ بولی۔

"یہ جذبہ بڑا خودسر اور منہ زور ہوتا ہے۔ میں نے اس کو دبانے کی بہت کوشش کی مگر ہار گئی۔ اندر ہی اندر ہونے والی اس جنگ نے مجھے نڈھال کردیا تھا۔ میں نے خود کو نارمل رکھنے کی بہت کوشش کی مگر......"

وہ رُکی۔ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر آہ بھر کر بولی۔

"مگر ایسا نہ ہوا۔ میں بیمار پڑگئی۔ پھر ڈاکٹروں کے کہنے پر میری منگنی ہوگئی۔ یہ بات میرے لئے اور بھی تکلیف دہ تھی۔ جب میں نے خود کو تم سے منسوب کرلیا تھا تو پھر کوئی اور کیسے میرا ہوسکتا تھا......؟ ڈاکٹروں کو جب مرض ہی صحیح معلوم نہ تھا تو وہ فیصلہ کس طرح کرتے......؟ منگنی کے بعد میں زیادہ بیمار اور پریشان رہنے لگی۔

اسی حالت میں میری شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ تاریخ طے ہونے کا سن کر میری طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ ایک بار پھر میرا علاج زور وشور سے شروع ہوا۔ تب ڈاکٹروں نے انکشاف کیا کہ مجھے ٹی بی ہے۔ میرے لئے یہ بات زندگی کا پیغام بن کر آئی کیونکہ میرے منگیتر نے شادی سے انکار کردیا تھا۔

میرا علاج ہونے لگا مگر جب میں خود تندرست ہونا نہیں چاہتی تھی تو کوئی ڈاکٹر، کوئی دوا مجھے کیسے تندرست کرسکتی تھی......؟"

اس نے خاموش ہوکر آنکھیں موندھ لیں۔

"ناز......! تم نے میرے ساتھ اور اپنے ساتھ ظلم کیا ہے۔ تم ایک بار تو مجھ سے کہتیں......!"

"حماد......! یہ ممکن ہوتا تو میں خود کو یوں موت کے حوالے کر

ہتی......؟ میں جانتی تھی میرے گھر والے کبھی اس رشتے پر راضی نہ ہوتے۔"

کتنے اُداس اور بوجھل بوجھل سے لمحے گزر گئے۔ وہ یوں ہی میرے سینے پر سر رکھے سوچتی رہی اور میں اس کو دیکھتا رہا۔ وہ انا اور خول جس میں کبھی ہم دونوں بند تھے، آج ٹوٹے بھی تھے تو کس وقت......؟ جب وہ موت کے دہانے پر کھڑی تھی......؟ اور اس جگہ ماں باپ، بہن بھائی سب اس کو بھول گئے تھے، چھوڑ گئے تھے۔ اپنی عملی زندگی میں کون کسی کا خیال کرتا ہے......؟ میں نے سوچ لیا۔

"ہاں......!"

میں نے سوچ لیا۔

"میں خود اس کا علاج کروں گا۔ خود اس کی دیکھ بھال کروں گا اور جب وہ اچھی ہو جائے گی تو میں عذرا سے دوسری شادی کی اجازت لوں گا۔ جب ہمارے مذہب نے ہمیں چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے تو میں دوسری شادی کیوں نہیں کر سکتا......؟ میں ایسا ضرور کروں گا۔ میں اس کا ایک ایک دُکھ سمیٹ لوں گا۔"

میں نے آہستہ سے اس کو بستر پر لٹا دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں زندگی کی ایک نئی چمک دیکھی تھی۔

اس وقت اس کی طبیعت بہت بہتر لگ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا وہ زندہ رہے گی، میرے لئے، وہ میری محبت تھی۔ اور اب میں مزید اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سو گئی، میٹھی نیند۔ میں کتنی

دیر کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ پھر نرس کو بلا کر اس کے پاس رہنے کی تاکید کی اور خود اپنے کمرے میں آ گیا۔

میرے ذہن میں آج بھی صرف ایک ہی لفظ کی گونج تھی۔

"محبت......! محبت......!"

میں بستر پر لیٹ گیا۔ وصل کے خواب صورت اور سہانے سپنے دیکھتے ہوئے، بہت برسوں کے بعد مجھے سکون کی نیند آئی تھی مگر......

علی الصبح نرس بھاگتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

"سر......! وہ آپ کی......"

اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی میں کمرے سے نکل چکا تھا۔ سینے میں دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جب میں بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر موت کی زردی چھا چکی تھی۔ وہ خون کی قے کر رہی تھی۔ گویا رات کی تندرستی بجھتے ہوئے دیئے کی لَو تھی۔

"ناز......!"

میں نے بے تابی سے آگے بڑھ کر اس کو بانہوں میں لے لیا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے دیکھا اور کمزور سے لہجے میں بولی۔

"حماد......! میری میت کو لاہور والوں کے سپرد مت کرنا۔ میرے جسم کو مری کے ان برف زاروں میں دفن کرنا تاکہ میرے اندر کی وہ آگ جس نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا ہے، سرد ہو جائے۔"

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا ناز......!"

میں نے بھیگی ہوئی آواز میں اس کو تسلی دی۔ جب کہ میں خود بھی

جانتا تھا، وہ اب چند لمحوں کی مہمان ہے۔"

"حماد......! تم اب یہیں رہو گے یا......"

اس نے اٹک کر پوچھا۔

"ناز......!"

میں نے تڑپ کر اس کو دیکھا۔

"میں ساری زندگی یہیں رہوں گا۔"

"اچھا......!"

اس نے مدہم لہجے میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ موت کی غنودگی اس پر چھا رہی تھی۔

"ناز......! ناز......!"

میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر خون کی قے آئی اور میرا سفید لباس سرخ ہوگیا۔ نرس اتنی دیر میں دوسرے ڈاکٹروں کو بھی بلا کر لا چکی تھی۔

وہ حیرت سے مجھے پاگلوں کی طرح دیکھے جا رہے تھے۔

"کہاں سینی ٹوریم کی لاوارث مریضہ؟ کہاں سرجن حماد علی؟"

مگر مجھے آس پاس کا ہوش کب تھا......؟ وہ بڑی اذیت میں تھی۔ وہ جو میری جان تھی، میرے وجود کا ایک حصہ تھی۔ وہ اذیت میں تھی۔ اس کے اندر سے گوشت کے لوتھڑے کٹ کٹ کر آ رہے تھے۔ پھر یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

اس نے بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے مجھے دیکھا۔ شاید آخری بار پھر بولی۔

"حماد......! تم نے دیکھا، محبت کرنے کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی

پڑتی ہے......؟ حماد......! میں نے بھی اپنی یہ زندگی محبت کی نذر کی......"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے آس پاس تاریکیوں کے سوا کچھ نہ رہا ہو اور میں نے تڑپ کر اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ کر محبت کی پہلی اور آخری مُہر ثبت کی اور اس کے بے جان وجود کو بستر پر ڈال دیا۔

"اس کے گھر اطلاع کر دی جائے......!"

میں نے پلٹ کر دوسرے ڈاکٹر سے کہا اور دوبارہ اس کے بے جان چہرے کو دیکھنے لگا۔

مجھے اس کا کراچی آنا، کراچی سے جانا یاد آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت ساری پابندیوں کے باوجود وہ کراچی آئی ہی اس لئے تھی کہ محبت کی اس کہانی کا آغاز ہو سکے۔ یہ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا۔ جس طرح محبت کرنے والوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔

بالآخر وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اس کے گھر والے اطلاع ملتے ہی چلے آئے تھے۔ اس کی خواہش کے مطابق اسے وہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ اقبال بھی آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوا اور پوچھا۔

"تم یہاں کیسے......؟"

میں نے بتایا کہ لندن سے واپسی پر میری یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔

بھلا جس رُسوائی سے بچنے کے لئے نازش نے اپنی جان دی تھی، میں اس کے بارے میں زبان کیسے کھول سکتا تھا......؟ اور اقبال، وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی کچھ نہ سمجھا تھا۔

"بھابی کیسی ہیں......؟"

وہ یوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا جیسے نازش کی موت اس کے لئے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی ہو۔

"گوشی کیسا ہے......؟"

وہ پوچھ رہا تھا۔

"سب لوگ ٹھیک ہیں......!"

میں نے بے زاری سے کہا۔

اچانک مجھے عامی، کامی کا خیال آیا۔ میرے وہ شریر بھتیجے جن کے بغیر میں دو دن نہ رہ سکتا تھا، اب کتنے برس بیت گئے تھے۔ انسان حالات کے سامنے کس قدر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے اپنے اس سے بچھڑ جاتے ہیں مگر وہ زندہ رہتا ہے۔ صرف ان کی یاد کے سہارے، شاید یہی قانونِ قدرت ہے۔

"عامی اور کامی کیسے ہیں ہیں......؟"

میں نے تھکے تھکے سے لہجے میں پوچھا۔

"بھئی......! ایک فور کلاس میں ہے اور دوسرا فائیو میں......! ویسے وہ دونوں تمہیں اب بھی بہت یاد کرتے ہیں۔"

اقبال نے بتایا۔

"کسی دن لے کر آنا انہیں......!"

میں نے اقبال سے کہا۔

"تم خود کیوں نہیں چلتے لاہور......؟ میرا تو خیال ہے ابھی چلو......! بھابی سے بھی مل لینا۔"

"نہیں یار......! میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔"

"کیوں......؟"

اقبال نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ مگر میں اسے کچھ نہ بتا سکا اور وہ سب لوگ واپس چلے گئے۔ میں نے اپنا ٹرانسفر کراچی کرانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب جبکہ قدرت نے مجھے اس کے پاس رہنے کا موقع دیا تھا، تو میں اِس کو کیوں ضائع کرتا......؟

اسی دوران عذرا نے مجھ سے طلاق لے لی۔ بقول اس کے وہ مجھ جیسے بور، لاپرواہ اور غیر ذمے دار شخص کے لئے اپنی زندگی مزید خراب نہیں کر سکتی۔ میں نے بغیر کسی پس و پیش کے اسے طلاق دے دی۔

اب گوشی ممی پاپا کے پاس ہے اور میں مری کے ان برف زاروں میں جہاں میری محبت دفن ہے۔ جب میں اس کی قبر پر جاتا ہوں تو فضا میں دُور کہیں "محبت، محبت" کی بازگشت کے بعد اس شعر کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اب میرے دید کی دُنیا بھی تماشائی ہے
تو نے کیا مجھ کو محبت میں بنا رکھا ہے

اور میں تھکا تھکا سا قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہوں اور میرے جاننے والے مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر مجھے سوائے نازش کے کسی کا ہوش نہیں۔

"محبت......! محبت......!"

میں تو صرف اسی کی بازگشت میں گم رہتا ہوں۔



بازی

ہماری یادیں تم اپنے دِل میں بسا کے اتنے اُداس کیوں ہو؟
محبتوں کے حسین قصے سنا کے اتنے اُداس کیوں ہو؟
حسین چہروں کی انجمن سے چھپا لیا تھا، ہمیں بتاؤ!
ہماری چاہت کو اپنے دِل میں چھپا کے اتنے اُداس کیوں ہو؟

باہر گلی میں سبزی والا آواز لگا رہا تھا۔

”آلو لے لو......! مٹر لے لو......! پالک لے لو......! ٹنڈے لے لو......! مولی لے لو......! گاجر لے لو......! گوبھی لے لو......!“

اور پتا نہیں کیا کیا......؟

مگر میرا اُٹھنے کا موڈ نہ ہوا۔ میں جو ہر روز بچت کے خیال سے اس کی آمد کی منتظر رہتی تھی کہ دُکاندار کی نسبت گلیوں میں پھیری لگا کر سبزی فروخت کرنے والے ذرا سستی سبزی دیتے ہیں کہ ان کو نہ تو دُکان کا کرایہ دینا

ہوتا ہے اور نہ ہی بجلی کا بل......!

”باہر گلی میں سبزی والا آواز لگا رہا ہے۔ سنا نہیں......؟“

سامنے صوفے پر بیٹھے عروج نے کرخت لہجے میں مجھ سے کہا۔

”معلوم ہے......!“

یہ کہہ کر میں نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

”معلوم ہے تو پھر جاتی کیوں نہیں سبزی لینے......؟“

عروج دھاڑا۔

”میری شکل اس وقت باہر جانے والی ہے......؟“

میں نے بھی جواباً چیخ کر بدتمیزی سے کہا۔ عروج نے چونک کر میرے چہرے کی جانب دیکھا جس پر اس نے صبح ہی صبح ٹھکائی کی تھی۔ وہ الگ تھی، مگر زبان میں نے بھی خوب جی بھر کر چلائی تھی۔ اس ٹھکائی اور زبان بازی کی وجہ کچھ خاص نہ تھی۔ آج چھٹی تھی اور چھٹی والے روز ناشتہ ہمیشہ بازار ہی سے آتا تھا۔ آج جب بچوں نے ناشتے کا کہا تو عروج نے ان معصوموں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”آج پیسے نہیں ہیں۔ اپنی ماں سے کہو، چائے کے ساتھ تم لوگوں کو پراٹھے بنا دے۔“

یہ سنتے ہی میں نے غصے سے کہا۔

”اپنے لئے پیسے ہوتے ہیں آپ کے پاس، مگر معصوم بچوں کے ناشتے کے لئے آپ کے پاس پیسے نہیں۔ جائیں اور جا کر حلوہ پوری کا ناشتہ لے کر آئیں۔ میرا آٹا گوندھنے اور پراٹھے بنانے کا بالکل موڈ نہیں۔“

گو کہ اپنی ماں کے ساتھ کبھی نہ رہی تھی، میں نے تو فقط اس کو دیکھا بھی زندگی میں ایک ہی بار تھا۔ مگر زبان درازی میں اپنی ماں جیسی ہی تھی۔ یہ بات عروج کئی بار جتا چکا تھا۔

"بکواس کرنے کی عادت کچھ زیادہ نہیں ہوگئی......؟"

میری بات سنتے ہی عروج نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دو مکے میرے چہرے پر جڑ دیئے اور یہ مکے کھا کر میں کبھی خاموش نہ رہی تھی، سو میں اونچی اونچی آواز میں بولنے لگی۔ یہ اور بات ہے کہ ساتھ ساتھ روتی بھی جاتی۔

میری زبان چلتی دیکھ کر عروج کے ہاتھ بھی چلنے لگے اور ایک بار پھر اس نے مجھے یہ بھی جتا دیا کہ اپنی ماں جیسی بدزبان ہے۔ خوب اچھی طرح میری ٹھکائی کرنے کے بعد وہ دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر ناشتہ لینے چلا گیا مگر میں بولتی رہی، روتی رہی، جب تک وہ ناشتہ لے کر واپس نہیں آگیا۔

میرے سسر چھٹی والے روز صبح صبح اپنی بیوی کے لئے بازار سے ناشتہ لے کر آتے تھے مگر اسے اپنے باپ کو دیکھ کر بھی عقل نہیں آتی۔

میری ساس ایک تیز عورت تھی۔ جب عروج مجھے مارتا تو میں اونچا بولتی مگر مجال ہے، وہ مکار کبھی مجھے چھڑانے آجائے......؟ شادی سے پہلے انہیں کتنی محبت تھی مجھ سے اور اب......؟

مار کھانے کے بعد میں نے بازار سے آیا ہوا ناشتہ تو کر لیا مگر غصے میں گھر کے کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اب سبزی والا آیا تب بھی میں نہ اُٹھی تھی۔ عروج خود ہی اُٹھ کر میرے چہرے کو دیکھتا ہوا باہر گیا اور پانچ سبزیاں چن کر لے آیا۔ آلو، مٹر، میتھی، مونگرے اور گاجر۔ ان سبزیوں کو ملا کر تنجن پکانا تھا۔

ایک تو میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اور اس پر مار کھانے کے بعد میرے جسم کا پور پور درد کر رہا تھا اور غصہ جو دو چھوٹے بچوں پر نکالنے کے باوجود ختم نہیں ہو رہا تھا اور اب یہ پانچ سبزیوں کا سالن......؟

پتا نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اپنے والدین کی پسند کی شادی کرنے کی بجائے عروج سے محبت کی شادی کی تھی۔ محض ندا سے بازی جیتنے کے لئے۔ اصل میں جوانی میں صرف جوش ہی ہوتا ہے، ہوش نہیں۔ آپ اچھائی برائی پر غور کیے بغیر ہر حال میں بازی جیتنا چاہتے ہیں۔

عروج سے میری شادی خود میرے اصرار اور پسند پر ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہم دونوں کی لومیرج تھی۔ بارات والے روز اپنی کزن ندا کا چہرہ دیکھ دیکھ کر میں مارے فخر و غرور کے سمجھتی تھی کہ میں نے میدان مار لیا ہے۔ بازی جیت لی ہے۔

ہاں......! ندا سے تو میں نے بازی جیت لی تھی مگر یہ بھید جلد ہی کھل گیا تھا کہ میں نے بازی جیتی نہیں، ہاری تھی۔ مگر اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ بھلا کمان سے نکلا تیر بھی کبھی واپس آیا ہے......؟

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ ولیمے والی رات جب سب ہی مہمان ہماری تعریف کر رہے تھے کہ کتنی خوب صورت جوڑی ہے تو ندا باوجود کوشش کے اپنے چہرے پر پھیلے نفرت و حسد کے تاثرات کو چھپا نہیں پا رہی تھی اور اس پر قیامت یہ کہ جب وہ میری ساس کے ازحد اصرار پر کہ وہ ان کی اکلوتی لاڈلی بھانجی ہے، مووی بنانے کے لئے ہمارے ساتھ بیٹھنے لگی تو عروج نے میرے کہنے کے مطابق بطورِ خاص ندا سے کہا۔

"ایک منٹ ندا سسٹر......! آپ یہاں میرے ساتھ نہیں، دوسری سمت میری دُلہن کے پاس جا کر بیٹھیں......!"

عروج کے سسٹر کہنے پر میں دُلہن ہونے کے باوجود ندا کو دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑی تھی اور عروج نے حیران و ششدر کھڑی ندا کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے آہستگی سے کہا۔

"جان......! ذرا شرم کرو......! لوگ دیکھ رہے ہیں۔ دُلہن کس طرح منہ پھاڑ کر ہنس رہی ہے۔"

مگر میں نے جیت کے نشے میں عروج کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ میں تو جلی سڑی ندا کو دیکھ رہی تھی۔ عروج کے سسٹر کہنے پر اس کا منہ یقیناً حلق تک کڑوا ہوگیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کر چلی گئی تو میرے اندر ڈھیروں سکون اُمڈ آیا تھا۔

پھر دعوت ختم ہونے تک ندا دوبارہ اسٹیج پر نہیں آئی تھی اور یہ بات بھی میرے لئے باعث سکون تھی۔

دراصل ندا میری چھوٹی پھوپھو کی بیٹی تھی جبکہ عروج میری بڑی پھوپھو کا بیٹا تھا اور میری دو ہی پھوپھو تھیں اور ایک چاچو۔ میرے والد کے کل چار بہن بھائی تھے۔ یعنی دو بہنیں اور دو بھائی۔ میرے والدین کی شادی کو ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا کہ بابا جان جو بیرون ملک سے چھٹی پر وطن آئے تھے، واپس ڈیوٹی پر چلے گئے۔ کیونکہ ان کی چھٹی صرف چالیس روز کی ہی تھی اور وہ شادی سے چند روز پہلے آئے تھے۔

واپس جانے سے پہلے انہوں نے میری ماں کو ان کی خواہش سن کر

کہ وہاں جاتے ہی ماں کو بھی اپنے پاس بلالیں گے، صاف صاف بتا دیا کہ وہ باہر اس کو اپنے پاس نہیں بلا سکتے جبکہ رشتہ طے کرتے وقت میری چالاک اور ہوشیار دادی نے میری نانی سے وعدہ کیا تھا۔

"لڑکا شادی کے بعد دُلہن کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

مگر لڑکا انکار کر کے واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ میری ماں بہت زیادہ خوب صورت تھی۔ اس نے سوچا وہ اپنے حسن کے بل بوتے پر اپنے شوہر سے یہ بات منوا لے گی۔ اب اتفاق یہ ہوا کہ شادی کے فوراً بعد میری ماں پریگننٹ ہو چکی تھیں۔ اپنے پروگرام پر عمل کرنے کے لئے انہوں نے شوہر کے جانے کے بعد چند روز بعد ہی اپنی چھوٹی نند سے خوب جھگڑا کیا اور جب میری دادی نے اس کو فضول باتیں کرنے سے منع کیا تو میری ماں نے ساس اور نند کے ساتھ خوب جی بھر کر زبان چلائی۔ پھر روٹھ کر میکے بیٹھ گئی اور میری نانی نے فوراً میرے والد کو فون کر کے کہہ دیا۔

"تمہارے گھر والوں نے مار مار کر میری بیٹی راحت کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اب صلح کی صرف ایک ہی شرط ہے کہ تم اس کو اپنے پاس بلا لو یا پھر طلاق دے دو۔ تمہارے گھر والوں کے ساتھ اب میری بیٹی نہیں رہ سکتی۔"

اس پر میرے والد نے اپنی مجبوری کھل کر بتا دی کہ ان کی تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ فیملی کو افورڈ کرسکیں۔ جبکہ بچہ بھی ہونے والا ہے اور ظاہر ہے ایک کے بعد دوسرا، تیسرا بھی ہوگا۔ اس لئے میں راحت کو باہر نہیں بلا سکتا۔ تاہم اپنے گھر والوں کو میں سمجھا سکتا ہوں کہ وہ پھر کبھی راحت کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں۔

پلیز......! آپ راحت کو بلائیں میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔ مگر میری نانی نے میری ماں کو بلانے کی بجائے فون ہی بند کر دیا۔ میرے والد اور ان کے گھر والوں نے صلح کے لئے بہت کوشش کی مگر میری نانی نے ان کی ایک نہ مانی۔ کیونکہ میری ماں بھی امریکہ سے آنے والے اپنے کزن میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری نانی نے میرے والد سے کہہ دیا۔

''تمہارے گھر والوں نے جو میری بیٹی پر تشدد کیا، اس کے نتیجے میں تمہارا بچہ ضائع ہوگیا تھا۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم میری بیٹی کو طلاق دے دو۔ اب تم بلاؤ بھی تو وہ نہ تمہارے پاس آنا چاہتی ہے اور نہ ہی تمہارے ساتھ زندگی مزید برباد کرنا چاہتی ہے۔''

بچہ ضائع ہونے کا سن کر میرے والد سمجھ گئے کہ انہوں نے دانستہ طور پر یہ حرکت کی ہے کہ ان کے گھر والے ان کو بتا چکے تھے کہ انہوں نے راحت کو اُنگلی تک نہیں لگائی اور انہوں نے بہت سوچنے کے بعد میری ماں کو طلاق بھجوا دی کہ جو لڑکی ابتداء میں ہی اتنی جھوٹی اور نڈر ہے، وہ آگے چل کر زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔

میری پیدائش پر انہوں نے مجھے اپنے ماموں اور ممانی جو کسی گاؤں میں رہتے تھے، اور بے اولاد تھے، ان کے حوالے کیا اور تاکید کی کہ کبھی کسی کو بھی یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے کسی بچے کو جنم دیا تھا۔ میری پیدائش ہوئی بھی ماں کے اس ماموں کے گھر تھی کہ وہ میری پیدائش سے دو ماہ پہلے ہی ان کے یہاں آگئی تھی۔

میرے پیدا ہونے کے بعد ہی میری ماں اپنے امریکہ سے آنے

والے کزن سے نکاح کر کے امریکہ چلی گئی اور پھر کبھی پلٹ کر میری خبر نہ لی کہ میں زندہ بھی ہوں کہ نہیں......؟ میری نانی مجھے دیکھنے کبھی کبھار آجاتی تھی۔ میں پانچ سال کی تھی جب میری نانی بھی انتقال کر گئیں اور نانا میری پیدائش سے بھی پہلے بلکہ میری ماں کی شادی سے بھی قبل فوت ہو چکے تھے اور میں اپنے والدین کی زندگی میں ہی غیروں میں پل رہی تھی۔

جن لوگوں نے مجھے گود لیا تھا، ان کی شادی کو دس برس ہو چکے تھے مگر ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اب انہوں نے مجھے گود لیا تو اللہ نے ان پر اپنی رحمت بھی کر دی۔ میں ابھی بمشکل دو برس کی تھی جب اللہ نے ان کو اولاد سے نوازنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں میاں بیوی مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے بابرکت وجود سے اس گھر میں آنے کے بعد اللہ نے ہمیں بھی صاحب اولاد کر دیا ہے۔ پہلے پانچ لڑکیاں ہوئیں پھر پانچ لڑکے، اور پانچ بیٹوں کے بعد جب اللہ نے پھر ان کو بیٹی دی تو ممانی کا دل بچوں سے بھر گیا۔

شروع میں تو دونوں میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے تھے کہ میری وجہ سے اللہ نے ان کو صاحب اولاد بنا دیا تھا مگر پھر بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے میرے پیار میں کمی کر دی تھی۔ خیر جیسے تیسے گزارہ ہو رہا تھا مگر میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرتے ہی جب میں نے کالج میں داخلہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو میری سوتیلی ماں نے پہلی بار میری اوقات یاد کرا دی۔

''ہم نے ساری عمر کے لئے تمہارا ٹھیکہ نہیں لیا۔ نانی تمہاری خود تو آرام سے قبر میں جا سوئی اور یہ مصیبت ساری زندگی کے لئے ہمارے گلے

میں ڈال گئی اور تمہاری سگی ماں تو تمہیں ہمارے حوالے کر کے بھول ہی گئی ہے۔ ایسا سلوک تو کوئی جانور بھی نہیں کرتا اپنے بچوں کے ساتھ جیسا سلوک تمہاری ماں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ خود تو وہاں امریکہ میں بیٹھی عیش کر رہی ہے۔ کبھی اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بیٹی کا خیال کر کے چار پیسے ہی بھیج دے......!"

گو کہ اس سے پہلے بھی چند رشتے داروں نے مجھے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ میں ان کی سگی بیٹی نہیں ہوں، جب میں نے یہ بات اپنے سوتیلے باپ سے پوچھی تو ابا حقہ پیتے ہوئے کہنے لگے۔

"لوگوں کی تو عادت ہوئی ہے فالتو بکواس کرنے کی۔ تم ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو۔ بھلا اپنی اولاد بھی کوئی کسی کو دیتا ہے......؟ تو ہماری بیٹی ہے۔"

لیکن اب ماں نے بھی یہی بات کی تو ابا نے اقرار کر ہی لیا کہ میں ان کی سگی بیٹی نہیں۔ تاہم انہوں نے ساتھ یہ بھی کہا کہ سگی بیٹیوں سے بھی زیادہ عزیز ہو ہمیں اور میں ان کو کتنی عزیز تھی، یہ بات میں اب خوب اچھی طرح جان چکی تھی۔

میں نے ان سے اپنے والدین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے طلاق کی ساری کہانی مجھے سچ سچ بتا دی۔ یہ بھی کہ قصور وار میرا باپ نہیں ماں تھی، باپ کو تو اس بات کا پتہ ہی نہیں کہ ان کی کوئی بیٹی بھی ہے۔ میں نے اپنے باپ کے گھر اور شہر کا پتہ پوچھا تو انہوں نے بتانے سے صاف انکار کر دیا۔

شروع ہی سے بڑی بہن ہونے کے ناطے گھر کا زیادہ کام میں ہی کرتی تھی۔ مگر اب ماں نے سارے گھر کا کام میرے سپرد کر دیا تھا اور بھائی بہنوں نے یہ پتہ چلنے کے بعد کہ میں ان کی سگی بہن نہیں ہوں، اپنا رویہ بدل لیا تھا۔

اب میں تھی اور گھر کا کام......! جو میرے سونے تک ختم ہونے میں نہیں آتا تھا اور اس پر ماں کی باتیں۔ وہ سارا وقت میرے ہی پیچھے پڑی رہتی۔ اپنی اولاد کا غصہ بھی مجھ پر نکالتی اور میں جو پہلے کبھی کبھار ان کو غصے میں جواب دے دیا کرتی تھی، اب یہ جاننے کے بعد کہ وہ میری سگی ماں نہیں، جواب دینے کی بجائے چپ رہتی تھی اور پھر ایک دن میں نے سنا۔ اندر روم میں بیٹھے ابو جی اماں سے کہہ رہے تھے۔

"ناشکری نہ بن......! وہ ہمارے گھر میں آئی تو اللہ نے ہمیں اپنی اولاد سے نوازا تھا ورنہ دس برس ہو چکے تھے ہماری شادی کو اور ہم اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور پھر جتنا کام وہ کرتی ہے، اتنے کام کے لئے تم باہر سے عورت رکھو تو روٹی کپڑے کے علاوہ پیسے بھی دینے پڑیں گے۔ نوکر سمجھ کر ہی اپنی زبان منہ میں رکھا کرو۔ سارا وقت بچی کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو......!"

مگر ماں پر ابو کی ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ ایک نڈر عورت تھی۔

میں بہت خوب صورت تھی مگر اب میرا حسن مٹی میں رُل گیا تھا۔ مجھے تو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ اگرچہ میں گھر میں بڑی تھی کہ مجھے گود لینے

کے بعد ہی اللہ نے ان کو اپنی اولاد سے نوازا تھا لیکن وہ مجھے فراموش کر دیتے کہ میں کون سی ان کی سگی بیٹی تھی......؟

اپنی دو بیٹیوں کی شادی چھوٹی عمر میں ہی کر چکے تھے اور اب مزید دو بیٹیوں کی منگنی کرنے والے تھے کہ لڑکے وہ پسند کر چکے تھے، کون کسی کی بیٹی کی شادی کرتا ہے......؟

میں منتظر ہی رہتی کہ وہ کبھی میری شادی کی بات کریں مگر میرے حوالے سے ایسی کوئی خوش کن بات کبھی نہ ہوئی اور میں چلتی پھرتی حسرت سے اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھتی رہتی کہ ان میں شادی کی لکیر ہے یا نہیں......؟

اور پھر اچانک ہی اللہ نے میری سن لی۔

اس وقت میری عمر بائیس برس تھی جب میری سگی ماں اپنی شادی کے بعد پہلی بار پاکستان آئی تو نہ جانے کیسے مجھ سے ملنے گاؤں چلی آئی......؟ تب مجھے معلوم ہوا کہ خوب صورتی میں میں ماں کی کاپی ہوں اور اب عروج کہتا ہے کہ میں زبان درازی میں بھی اپنی ماں کی کاپی ہوں۔

میری ماں میری حالت دیکھ کر مجھے گلے لگا کر رو پڑی مگر میری آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہیں آیا۔ بھلا اس عورت کے گلے مل کر آنسو بہانے کا کیا فائدہ جو پیدا ہوتے ہی مجھے غیروں کے سپرد کر کے چلی گئی......؟ اور پھر کبھی پلٹ کر میری خبر نہ لی۔ یہ تو آنسوؤں کی بھی توہین تھی۔ میری ماں نے مجھ سے کہا۔

''اب میں تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے کر جاؤں گی۔ وہاں تمہارے

چار بہن بھائی اور بھی ہیں۔''

ان کی بات سن کر میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''سوری......! وہ صرف آپ کے بچے ہیں، میرے بہن بھائی نہیں۔ مجھے آپ کے ساتھ امریکہ نہیں جانا۔ اب آئی ہیں تو اتنا احسان کر دیں، مجھے میرے والد کے گھر کا ایڈریس بتا دیں۔ میں اپنے والد کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

میری بات سنتے ہی وہ کھڑی ہو گئیں اور کہا۔

''اپنا سامان پکڑو، ہم ابھی چلتے ہیں۔''

''میرا ذاتی کوئی سامان نہیں......! آپ کی بھابی نے سوٹ جو ایک سال پرانے ہو جاتے ہیں، وہ مجھے مل جاتے ہیں، آپ چلیں......!''

میں نے تلخ لہجے میں کہا کہ میری اس حالت کی ذمہ دار میری سگی ماں تھی۔ اپنے پاس نہیں رکھنا تھا تو مجھے میرے والد کے سپرد کرتیں......؟ مگر انہیں صرف اپنا سکون اور انا عزیز تھی۔ میرے منہ بولے والدین نے برائے نام مجھے روکنے کی کوشش کی اور ہم چلے آئے۔

میرے والد لاہور کے رہنے والے تھے۔ میری ماں گاؤں سے مجھے سیدھی میرے والد کے گھر لائی۔ اچھا خاصا کشادہ خوب صورت گھر تھا اور اتفاق سے میرے والد گھر پر ہی موجود تھے۔

مدت بعد میری ماں کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئے اور جب میری ماں نے میرا تعارف کرایا تو میرے والد مجھے گلے لگا کر عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہنے لگے۔

"کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تمہاری نانی نے جھوٹ بولا کہ میرا بچہ ضائع ہوگیا یا تو انہوں نے بچے کو خود ضائع کروایا ہے یا پھر میرا بچہ زندہ ہے......؟"

میری ماں ان کی بات سن کر خاموش رہی۔ میں خود بھی کتنی دیر والد کے گلے لگ کر روتی رہی اور ایک سکون سا بھی محسوس کرتی رہی۔ میری ماں میرے والد کے کہنے کے باوجود ایک منٹ بھی نہ بیٹھی اور مجھے چھوڑ کر فوراً ہی چلی گئی۔

میرے والد مجھے ہال کمرے میں لائے جو میری دادی کا کمرہ تھا۔ وہاں میری سوتیلی ماں اور بہن بھائی بھی بیٹھے تھے۔ سب ہنس بول رہے تھے۔ میرے والد نے میرا تعارف کرایا تو میری سوتیلی ماں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ چند پل بغور مجھے دیکھتے ہوئے جیسے میرا جائزہ لیتی رہی پھر مسکرا کر انہوں نے نرمی سے مجھے گلے لگاتے ہوئے میرا رُخسار چوم کر مجھے پیار کیا۔ پھر بچوں سے تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگیں۔

"سجان......! ذیشان......! تم چھوٹی بہن کو اکیلی سمجھ کر بہت تنگ کرتے تھے، اب وہ بھی دو ہوگئی ہیں اور آپا ہیں بھی تم تینوں سے بڑی۔ اب اپنی خیر منانا۔"

بچوں سے ملنے کے بعد دادی سے گلے ملی اور میری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگیا۔ میری سوتیلی ماں بہت اچھی عورت تھی۔ انہوں نے میرے لباس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میرے والد کو کچھ آہستہ سے کہا اور پھر اسی وقت میرے والد کو ساتھ لے کر میرے لئے شاپنگ کرنے چلی گئیں۔ یعنی

انہوں نے مجھے خوش دلی سے قبول کرلیا تھا۔

چند دنوں میں ہی میرا حلیہ بدل کر رہ گیا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ میں وہ پہلے والی فرح ہوں۔ اچھا لباس، اچھا کھانا اور پرُسکون ماحول نے مجھے بدل کر رکھ دیا تھا۔ سب ہی خاندان والے مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔

میری بڑی پھوپھو اور چاچو لاہور میں ہی رہتے تھے۔ اس لئے وہ لوگ دوسرے ہی روز مجھ سے ملنے چلے آئے اور میری چھوٹی پھوپھو کراچی رہتی تھیں۔ انہوں نے اور ان کے بچوں نے مجھ سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم چھٹیوں میں لاہور آئیں گے تو مجھ سے ملاقات ہوگی۔"

میری بڑی پھوپھو کے صرف دو ہی بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ چاچو کے صرف تین بچے تھے۔ چھوٹی پھوپھو کی شادی بھی میرے بابا جان کی شادی سے پہلے ہوئی تھی اور ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے مجھ سے بڑے تھے۔ ایک تین سال اور دوسرا دو سال۔

البتہ ندا مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی۔ بڑی پھوپھو اپنی بیٹی کی شادی کر چکی تھیں اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ آج کل جرمنی میں ہوتی تھی اور بیٹا دو برس پہلے لندن چلا گیا تھا اور یہ کہ اس نے صرف میٹرک تک پڑھا تھا اور مجھ سے صرف چھ سال بڑا تھا۔

میرے بہن بھائی مجھے بتاتے تھے کہ عروج بھائی بہت خوب صورت اور اچھے ہیں جب کہ میرے بابا جان کا خیال میری شادی کراچی والی پھوپھو کے بڑے بیٹے اُسامہ کے ساتھ کرنے کا تھا اور انہوں نے میری دادی سے

کہہ بھی دیا تھا کہ جب ہماری بہن (چھوٹی پھوپھو) لاہور آئیں تو آپ ان سے فرح اور اُسامہ کے رشتے کی بات کر کے دیکھیں۔

اور اتفاق سے میں نے یہ ساری باتیں سن لی تھیں اور اب مجھے شدت سے چھوٹی پھوپھو کا انتظار تھا اور وہ دو ماہ بعد ہی چھوٹی پھوپھو اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ لاہور آ گئیں۔ آنے سے پہلے انہوں نے ہمیں فون کر دیا تھا۔ اس لئے گھر بھر کی بطورِ خاص صفائی کی گئی اور کھانے پر بھی خوب اہتمام کیا گیا اور پھر وہ بھی آ پہنچے جن کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔

پھوپھا جی تو سب سے ملتے سلام کا جواب دیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ پھوپھو مجھے گلے ملیں، مجھے پیار کیا مگر ان کے پیار میں وہ گرم جوشی نہ تھی جو باقی خاندان والوں کے روّیے میں مجھ سے ملتے ہوئے تھی۔ پھر انہوں نے اپنے بچوں سے میرا تعارف کرایا۔

"یہ میرا بڑا بیٹا اُسامہ ہے۔"

اسامہ نے میری سمت ہاتھ بڑھایا تو میں نے اماں کی جانب دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ گویا ہاتھ ملانے کی اجازت دے رہی ہوں اور میں نے پھر بھی ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اُسامہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

پھر دوسرے بیٹے حمزہ کا تعارف ہوا۔ اس نے بھی مجھ سے ہاتھ ملایا اور آخر میں ندا، پھوپھو کی بیٹی خود ہی آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

"میں ندا ہوں۔"

تب میں نے دیکھا اس نے بے حد خوب صورت لان کا سوٹ پہن

رکھا تھا۔ ساتھ میں بلیک ہائی ہیل کا جوتا۔ میں نے محسوس کیا وہ بڑی تنقیدی نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر وہ سب بھی باقی گھر والوں سے ملنے کے بعد صوفے پر بیٹھ گئے۔

چھوٹی پھوپھو میری ماں کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور میری دادی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ تب میں اماں کے ساتھ کچن میں کھانا لگانے چلی آئی۔

اسامہ کو دیکھ کر میرا دل ویسے بھی دھک دھک کر رہا تھا۔ دونوں بھائیوں نے موسم کی مناسبت سے سفید شلوار سوٹ پہن رکھے تھے مگر اسامہ، حمزہ سے زیادہ اچھے لگ رہے تھے۔ خوب صورت تو ندا بھی تھی مگر رنگت گندمی مائل تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا، اس کی نگاہوں میں میرے لئے ناپسندیدگی تھی۔ میں اس کو پسند نہیں آئی تھی۔

ظاہر ہے میں گاؤں کے غریب اور فقیرانہ ماحول میں بائیس برس تک رہی تھی۔ ہمارا گاؤں والا گھر پانچ مرلے کا تھا جبکہ میرے بابا جان کا گھر دس مرلے پر تھا اور گھر میں گاڑی بھی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ سب گاڑیاں ایک جیسی ہوتی ہیں مگر اب میرا بھائی سبحان میرے قریب کھڑا مجھے بتا رہا تھا۔

"چھوٹی پھوپھو کی گاڑی دیکھی ہے، پورے پچیس لاکھ کی ہے۔"

"پچیس لاکھ......!"

برتن میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچے اور میں نے پوچھا۔

"ہماری گاڑی کتنے کی ہے......؟"

"ہماری گاڑی ہوگی......"

سبحان نے منہ بنا کر حقارت بھرے لہجے میں کہا پھر بتایا۔

"یہی کوئی تین لاکھ کی۔ سیکنڈ ہینڈ سوزوکی ہے۔ سارے خاندان میں صرف چھوٹی پھوپھو ہی سب سے زیادہ امیر ہیں۔"

سبحان کی باتیں سن کر میں دل ہی دل میں بے حد خوش ہوئی تھی کہ اس امیر پھوپھو کی مجھے بہو بننا ہے۔

کھانے اور کام کی فراغت کے بعد میں آرام کرنے اپنے روم میں چلی آئی۔ ندا بھی میرے ساتھ آئی تھی۔ اس کو میرے روم میں ہی قیام کرنا تھا۔ اس کا بیگ پہلے ہی میرا بھائی ذیشان میرے روم میں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اب ندا کھانے کے بعد روم میں آئی تو بیگ کھول کر اپنی نائٹی نکالتے ہوئے بطورِ خاص مجھے اپنے سوٹ اور جوتے بھی نکال کر دکھانے لگی۔ شاید اپنی حیثیت دکھانے کو یا مجھے میری اوقات جتانے کو......؟

جتنے اس کے سوٹ تھے، اتنے ہی جوتے بھی۔ میں یہ سب دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ لباس تو میرا بھی اچھا ہی تھا کہ اچھی لان کے پانچ سوٹ اماں نے مجھے بنا کر دیئے تھے مگر جوتے دو ہی تھے۔ وہ اپنی ساری چیزیں مجھے دکھانے کے بعد ندا نے پہلے جا کر نائٹی پہنی پھر میرے ساتھ بستر پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"آپ عروج کو جانتی ہیں......؟"

"ہاں......! بڑی پھوپھو کا بیٹا ہے۔"

پھر وہ بتانے لگی۔

"آپی (عروج کی بہن) کی شادی پر جب فوٹو سیشن ہوا تو ہمیں

عروج کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے ورنہ بچپن سے لے کر ان کے لندن جانے تک ہم پانچوں ہر فنکشن میں ہمیشہ اکٹھے شامل ہوتے تھے۔ آپی کی شادی پر میں نے...... آئی مین ہم سب نے عروج کو بہت یاد کیا۔ پہلی بار کسی فنکشن میں ہم پانچ کی بجائے چار تھے۔ ہم میں دوستی بھی بہت زیادہ ہے۔ وہ اکثر مجھے فون کرتے رہتے ہیں۔"

سونے تک ندا عروج کی ہی باتیں کرتی رہی اور میں سنتی رہی۔ مجھے عروج سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک تو اس لئے کہ میں نے ابھی تک اس کو دیکھا ہی نہ تھا، دوسرے میری شادی کی بات تو اُسامہ سے چل رہی تھی اور اسامہ مجھے بے حد پسند آئے تھے۔

رات عروج کی باتیں کرتے کرتے ندا سو گئی مگر مجھے اسامہ کا سوچتے ہوئے نیند بہت دیر بعد آئی تھی۔

اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ رُخصت ہو گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں شمالی علاقہ جات جاتے ہیں اور آتے جاتے وقت چند روز لاہور میں بھی قیام کرتے ہیں۔ جیسے اب ایک روز قیام کرنے کے بعد وہ لوگ سیر کے لئے چلے گئے تھے۔

ان کے جاتے ہی میں کام میں لگ گئی۔ کام کرتے ہوئے ایک بات میں نے شدت سے محسوس کی تھی کہ سب ہی گھر والے کچھ چپ چپ تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی......؟ اور جلد ہی ان کی چپ کا بھید کھل گیا۔ دوپہر کا کھانا بناتے ہوئے اماں نے مجھے بتایا۔

''تمہاری چھوٹی پھوپھو نے تمہارے رشتے سے معذرت کر لی ہے۔ دراصل اسامہ کو تم پسند نہیں آئی ہو۔ اس نے ماں سے کہا، ایک تو بے وقوف لڑکی اس پر موٹی۔ شادی کے بعد مزید پھیل جائے گی۔ کیونکہ شادی کے بعد تو اسمارٹ لڑکیاں بھی پھیل جاتی ہیں۔''

اماں کی بات سن کر میں چپ رہی مگر اندر ہی اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ہاں میرا جسم ذرا بھاری تھا، خاص کر ٹانگوں پر گوشت کچھ زیادہ ہی تھا۔ حالانکہ کھانا تو میں عام انسانوں جتنا ہی کھاتی تھی اور پھر گاؤں میں سارے گھر کا کام بھی میں اکیلی ہی کرتی تھی۔ اس کے باوجود اپنا یہ موٹاپا میری سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا اور اب یہاں آ کر میں کھاتی بھی زیادہ تھی اور کام کم ہی کرتی تھی کہ گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے اماں نے ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے میری صحت پہلے سے اچھی ہوگئی تھی۔

اب اماں کی زبانی انکار کا سن کر مجھے اپنی شدید توہین کا احساس ہوا مگر اس توہین کی تو میں عادی تھی کہ یہ بائیس سال میں نے ایک توہین آمیز ماحول میں بسر کئے تھے اور یہ سب اس عورت کی وجہ سے ہوا تھا جو میری سگی ماں تھی۔ مجھے اپنی ماں سے شدید نفرت تھی۔ اب اُسامہ کے بے وقوف کہنے پر اس نفرت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ وہ اگر مجھے اپنے یا نانی کے پاس نہیں رکھنا چاہتی تھی تو مجھے میرے والد کے سپرد کر دیتی کیونکہ اپنا خاندان اپنا ہی ہوتا ہے۔

واپس کراچی جاتے ہوئے وہ پھر ہمارے یہاں رُکے مگر صرف دو دن کے لئے، اور ان دو دنوں میں میں نے جان لیا تھا کہ ندا خاصی تک

چڑھی، مغرور اور خود پسند لڑکی تھی۔ اس نے مجھ سے بطورِ خاص کہا تھا۔

''آپ کا جسم بہت بھاری ہے۔''

حالانکہ اتنا بھی بھاری نہیں تھا جتنا وہ بنا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''لڑکے موٹی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے اور میرے اسامہ بھائی تو بہت زیادہ نفیس ہیں۔ آپ ان کو ذرا بھی اچھی نہیں لگیں اور پھر آپ ہیں بھی گاؤں والی، شہر میں تو اب آئی ہیں۔ عروج بھائی ہوتے تو وہ بھی آپ کو پسند نہ کرتے کہ وہ بھی اسمارٹ لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر اپنے اسمارٹ جسم پر اِک نگاہ ڈالی پھر نہ جانے کیا سوچ کر مسکرانے لگی۔ میں جواباً اس کو ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی تھی کہ اس کے لہجے میں ہی نہیں، نگاہوں میں بھی میرے لئے حقارت تھی۔

خیر دو روز گزار کے وہ لوگ چلے گئے اور ان کے جانے کے چند روز بعد میری بڑی پھوپھو مجھے اپنے گھر لے آئیں۔ بڑی پھوپھو مجھ سے بہت زیادہ اپنائیت کا اظہار کرتیں۔ ان کے گھر آئے ابھی مجھے تیسرا روز تھا۔ پھوپھا جی ناشتے کے بعد آفس جا چکے تھے اور پھوپھو سبزی گوشت لینے بازار گئی ہوئی تھیں۔

اس وقت میں گھر میں اکیلی تھی اور پھوپھو کے اکلوتے بیٹے کی بڑی سی تصویر جو پھوپھو کے روم میں لگی ہوئی تھی، محویت سے دیکھ رہی تھی۔ عروج کی تصویر میں نے پہلی بار ان کے گھر آ کر ہی دیکھی تھی اور اب عروج بھی مجھے بے حد پسند آیا تھا۔

میں نے دیکھا تھا وہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ میرا مطلب یہ

کہ اسامہ سے کافی زیادہ خوب صورت تھا اور رہتا بھی لندن میں تھا۔ میں نے دل میں سوچا اُسامہ نہیں تو نہ سہی، میری شادی عروج کے ساتھ بھی تو ہو سکتی ہے۔ بڑی پھوپھو تو مجھ سے محبت بھی بہت کرتی ہیں۔

ہاں تو میں کھڑی تصویر دیکھ رہی تھی کہ کوئی چپکے سے روم میں داخل ہوا۔ آہٹ محسوس کرتے ہی میں مڑی اور پھر اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر چونک پڑی۔ عروج تصویر سے نکل کر گویا باہر آ گیا تھا۔

"کون ہو تم......؟ اور مما کہاں ہیں......؟"

عروج نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے مڑ کر پہلے تصویر کو دیکھا پھر عروج کو۔ یہ دیکھ کر عروج نے کہا۔

"ہاں......! میں ہی عروج ہوں۔ ابھی ابھی لندن سے آیا ہوں مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ تم کون ہو......؟ اور مما کہاں ہیں......؟"

"پھوپھو سبزی لینے گئی ہیں اور میں فرح ہوں۔ آپ کے بڑے ماموں کی بیٹی......!"

میں نے اپنا تعارف کرایا تو عروج نے مجھے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"بڑے ماموں کی بیٹی......؟ لڑکی......! تمہارا دماغ تو درست ہے......؟ بڑے ماموں کی صرف ایک ہی بیٹی ہے اور وہ ابھی چھوٹی ہے۔ میں لندن میں صرف دو برس رہ کر آیا ہوں اور تم کہیں چور تو نہیں ہو......؟ یا......"

انہوں نے سرتاپا مجھے دیکھتے ہوئے بات اُدھوری چھوڑ دی اور مجھے گھورنے لگے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کروں......؟ یا کیا کہوں......؟

تب ہی پھوپھو نے آ کر میری مشکل آسان کر دی۔ انہوں نے باہر سے مجھے آواز دی تو میں جلدی سے عروج کو وہیں چھوڑ کر باہر آ گئی۔ میرے پیچھے عروج بھی باہر آ گئے۔ پھوپھو عروج کو دیکھتے ہی سبزی گوشت والا شاپر وہیں پھینک کر بازو پھیلا کر عروج کی جانب بڑھتے ہوئے بولیں۔

"ارے......! میرا بیٹا......! تو کب آیا ہے عروج......؟"

"ابھی آیا ہوں......!"

انہوں نے پھوپھو سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ پھوپھو کتنی دیر عروج کو گلے لگا کر کھڑی رہیں پھر الگ ہوئیں تو عروج نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مما......! یہ کون ہے......؟"

"تمہارے بڑے ماموں کی بیٹی......!"

یہ کہہ کر پھوپھو نے جلدی جلدی میری ساری اسٹوری بھی ان کو سنا دی۔ ساری بات سن کر عروج نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ راحت تو بڑی مکار اور بے رحم عورت نکلی۔ نہ بیٹی کو اپنے پاس رکھا نہ اس کے والد کے سپرد کیا۔"

وہ غصے میں کچھ اور بھی کہتا رہا جبکہ میں تو دھک دھک کرتا دل لے کر سبزی اور گوشت کے شاپر اُٹھائے کچن میں چلی آئی تھی۔

عروج واقعی اسامہ سے زیادہ خوب صورت تھا، پر تھوڑا غصے والا بھی لگتا تھا۔ میں نے دل سے دُعا کی کہ میری شادی عروج سے ہو جائے۔ پھوپھو نے مجھے آواز دے کر پوچھا۔ وہ میری مدد کو آئیں تو میں نے منع کر دیا کہ ان

کا بیٹا آیا تھا، وہ بھی دو سال بعد۔ میں چاہتی تھی پھوپھو جی بھر کر بیٹے کے پاس بیٹھیں اور باتیں کریں۔ کھانا میں خود ہی بنا لوں گی۔

مجھے اس گھر میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا مگر پھوپھو نے مجھے ابھی تک کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانے دیا تھا۔ گھر کی صفائی وہ میرے اُٹھنے سے پہلے ہی کر لیتی تھیں، اور ناشتہ بھی وہی مجھے بنا کر دیتی تھیں۔ کھانا بھی وہ خود ہی بناتی تھیں۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے گھر میں لے آؤں مگر......''

وہ اُدھوری بات کہہ کر چپ ہوگئیں۔ اس کے بعد کبھی ایسی بات نہ کی۔ آج پہلی بار میں ان کے گھر میں کھانا بنا رہی تھی۔ کھانا پکانے کے بعد میں ان کو اطلاع کرنے گئی تو دروازے پر رُک گئی۔ پھوپھو عروج کو بتا رہی تھیں۔

''تمہارے بڑے ماموں اسامہ کے ساتھ فرح کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر تمہاری چھوٹی خالہ نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اسامہ کو فرح پسند نہیں آئی تھی۔ وہ کہتا تھا ایک تو گاؤں کی ہے اس پر موٹی۔''

''اتنی پیاری تو ہے......!''

عروج نے بے ساختہ کہا اور میں خوش ہوگئی۔ تب پھوپھو نے کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے فرح کو اپنی بہو بنا لوں مگر تمہارے ماموں شاید اس بات کو پسند نہ کریں۔''

ان کی بات سن کر عروج نے کہا۔

''کیوں پسند نہیں کریں گے......؟ اب پہلے والی بات یا حالات تو نہیں ہیں۔ میں لندن میں جاب کرتا ہوں۔ آپ ماموں سے ضرور بات کریں کہ فرح مجھے بے حد پسند آئی ہے۔''

''پسند تو مجھے بھی بہت ہے پر خیر...... دیکھتی ہوں۔''

پھوپھو خاموش ہوئیں تو میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی اور بتایا کہ کھانا پک گیا ہے۔ عروج مجھے دیکھنے آئے اور چند ثانیے بے خود سے دیکھتے ہی رہے اور میں گھبرا کر باہر چلی آئی۔ ندا نے کہا تھا کہ عروج بھی موٹی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے، مگر عروج تو دیکھتے ہی مجھ پر مر مٹے تھے۔ یہ بات مجھے گہرا سکون دے گئی تھی۔

رات کو بابا جان، اماں، دادی اور چاچو، چچی کے ساتھ عروج سے ملنے آئے۔ وہ سب ایک بات بار بار کہتے رہے۔

''چلو شکر ہے تمہیں عقل آ گئی......!''

جاتے ہوئے بابا جان مجھے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر پھوپھو نے زبردستی روک لیا۔ دادی بھی پھوپھو کے ہاں رُک گئی تھیں۔ اس لئے بابا جان مزید اصرار نہ کر سکے۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد جب دادی اور پھوپھو باہر لاؤنج میں بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ عروج میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹی تھی۔ ان کو دیکھتے ہی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ عروج میرے قریب آئے۔ چند لمحے مجھے دیکھتے رہے، پھر بولے۔

''فرح......! میں ذرا بے تکلف سا بندہ ہوں۔ اِدھر اُدھر کی فالتو

باتوں میں ٹائم ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ مجھے تم اچھی لگی ہو، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اعتراض نہ ہو تو ماموں سے بات کروں......؟ آئی مین مما ماموں سے بات کریں......؟''

میں چپ رہی حالانکہ ان کی بات سن کر میرا دل خوش ہو گیا تھا۔

''مجھے جواب چاہئے فرح......!''

عروج نے پھر پوچھا تو میں نے کہہ دیا۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں......!''

میری بات سن کر عروج مسکرائے پھر اچانک میرا ہاتھ تھام کر بولے۔

''پتا نہیں یہ محبت ہے یا...... خیر جو بھی ہے، اب ایک بات سنو......! اگر تمہیں میرے ساتھ شادی پر اعتراض نہیں تو پھر تمہیں نہ صرف ہمت کرنا ہوگی بلکہ میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''کیسے......؟''

میں نے پوچھا مگر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

''جب مما رشتہ لے کر جائیں تو ہوسکتا ہے ماموں انکار کر دیں۔ تب تمہیں ہمت کر کے اپنی ماں سے کہنا ہوگا۔ تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہے اور یہ کہ اس رشتے سے انکار نہ کیا جائے۔''

''لیکن وہ انکار کیوں کریں گے......؟''

میں نے تھوڑا حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ جب وہ انکار کریں گے تب تمہیں پتا چل جائے گا۔''

عروج نے کہا پھر میری تعریف کرنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''فرح......! تم بہت خوب صورت ہو۔ ایسا مکمل حسن میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ اگر تم میری بن گئی تو یہ میرے لئے بہت خوشی کی بات ہوگی۔''

اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر بیٹھے میرے تعریف کرتے رہے اور میں مسرور سی سنتی رہی کہ یہ موقع میری زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔ میں بچپن سے لے کر اپنے بابا جان کے گھر آنے تک محبت کے لئے ترسی ہوئی لڑکی تھی۔ اپنے والد کے گھر آ کر مجھے پہلی بار محبت ملی تھی۔ بابا ہی نہیں، اماں سوتیلی ماں ہونے کے باوجود مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ دادی اور سب بہن بھائی بھی مجھ سے محبت کرتے تھے۔

یہ سب محبتیں اپنی جگہ لیکن ایک مرد کی محبت کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ خاص کر اس مرد کی محبت جو واقعی آپ کو دل سے چاہتا ہو۔ باقی کی سب باتوں کے بعد یہ محبت بھی مجھے مل گئی تھی۔

عروج کے آنے کے بعد میں اور دادی ایک ہفتہ ان کے گھر میں رہے۔ رات میں جب سب سو جاتے تو عروج میرے کمرے میں آجاتے۔ پتا نہیں عروج کے دل میں میرے لئے سچی محبت تھی کہ نہیں، مگر میں ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ ان کی باتیں مجھے بے خود کر ڈالتی تھیں۔

کوئی مجھے اس طرح چاہے گا......؟ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ سارا ٹائم میرے گالوں پر گلاب کھلے رہتے تھے۔ ایک ہفتہ بعد میں دادی کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ عروج ہمیں خود چھوڑنے آئے تھے۔ رات کو جب ان کو پتا چلا

تھا کہ کل میں جا رہی ہوں تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

"ایک دو دن تک مما تمہارا ہاتھ میرے لئے ماموں سے مانگنے آئیں گی۔ نانو جی سے تو مما نے بات کر لی ہے۔ نانو کو تو کوئی اعتراض نہیں۔ سارے بچوں میں میں ان کا لاڈلا ہوں مگر اصل بات ماموں کے راضی ہونے کی ہے اور اس کے لئے تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔"

اور میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ میں ایسا ہی کروں گی جیسا انہوں نے کہا تھا۔

اور پھر دو دن بعد ہی بڑی پھوپھو پھوپھا جی کو ساتھ لے کر میرا ہاتھ مانگنے چلی آئیں۔ بابا جان نے فوری طور پر نہ ہاں کی تھی، نہ ناں۔ انہوں نے پھوپھو سے کہا۔

"ہم سوچ کر اور اماں سے مشورہ کر کے جواب دیں گے۔"

ان کی بات سن کر پھوپھو نے کہا۔

"جلدی سوچنا......! عروج کی چھٹی زیادہ نہیں۔"

پھر رات کا کھانا کھا کر جب وہ لوگ چلے گئے تو اماں بابا دادی کے روم میں چلے گئے اور میں اپنے روم میں چلی آئی۔ صبح جب بابا جان آفس چلے گئے تو اماں نے مجھے بتایا۔

"تمہاری پھوپھو عروج کے لئے تمہارا رشتہ لینے آئی تھیں۔ ابھی تو تمہارے بابا جان نے نہ ہاں کی ہے اور نہ ہی ناں۔ مگر مجھے یقین ہے وہ انکار ہی کریں گے۔"

"مگر کیوں اماں جان......؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم تو بائیس برس تک اپنے خاندان سے دُور رہی ہو اس لئے تمہیں نہیں پتا۔ ایک تو عروج غصے والا بہت ہے اور اس پر بدتمیز بھی۔ بڑے چھوٹے کی تمیز تو چھو کر نہیں گزری۔ میٹرک کرنے کے بعد تعلیم چھوڑ دی اور آوارہ پھرنے لگا، پھر فریج میکینک بن گیا۔ بہت اچھا میکینک ہے، پر دل چاہا تو کام کر لیا یا پھر اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ رات گئے تک گھر کے باہر آوارہ پھرتا رہا۔

وہ تو تمہارے پھوپھا کے والد تین سال پہلے فوت ہو گئے، ان کے بعد خاندانی جائیداد سے جو حصہ ملا، اس میں سے انہوں نے آدھے پیسوں کا تین مرلے کا چھوٹا سا گھر لے لیا۔ باقی پیسے خرچ کر کے لندن کا ویزہ حاصل کر کے عروج کو لندن بھیج دیا اور اللہ کا شکر ہے وہاں کام کرتا ہے اور تھوڑا تمیزدار بھی ہو گیا ہے۔"

"اگر وہ لندن کام کرتا ہے تو پھر آپ کو انکار نہیں کرنا چاہئے......!"

فرح نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ اس کی بات سن کر اماں نے چونک کر اس کو دیکھا پھر منہ سے ایک لفظ بھی کہے بغیر سر ہلاتی ہوئی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں......؟ مگر میں نے پرواہ نہیں کی کہ میں نے جو کہنا تھا کہہ چکی تھی۔

اگلے روز جب وہ دوپہر کا کھانا بنا رہی تھیں اور میں ان کی مدد کے خیال سے ان کے پاس کھڑی تھی، وہ مجھے بتانے لگیں۔

"تمہارے بابا جان نے عروج کے رشتے کے لئے تمہاری بڑی پھوپھو سے معذرت کرنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کیا پتا عروج اندر سے پوری طرح درست ہوا ہے یا نہیں......؟"

یہ سن کر مجھے دُکھ ہوا اور غصہ بھی آیا کہ چھوٹی پھوپھو کو وہ خود رشتہ دینا چاہتے تھے مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اب بڑی پھوپھو پوری محبت سے میرا ہاتھ مانگ رہی ہیں تو وہ خود انکار کر رہے ہیں۔ میں اماں سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اماں مجھے بتانے لگیں۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں، ندا اور عروج کی بات بچپن سے طے تھی مگر عروج کی عادتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ندا کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔"

اماں کی یہ بات سن کر مجھے عروج کے لئے ندا کا بے تاب ہونا یاد آیا۔ پھر اس کی وہ حقارت بھری نگاہیں مجھے یاد آئیں جن سے وہ دو دن مجھے دیکھتی رہی تھی اور وہ باتیں کہ لڑکے موٹی لڑکیوں کی پسند نہیں کرتے اور یہ کہ عروج بھی اسمارٹ لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔

میں نے سوچا، بچپن سے بات طے تھی تو یقیناً وہ عروج سے محبت کرتی ہوگی، جب ہی میرے پاس بیٹھتی تھی تو عروج کا ذکر کرنے لگتی تھی۔ مجھ سے کہتی تھی، موٹی لڑکیوں کو لڑکے پسند نہیں کرتے۔

اب میں عروج سے شادی کر کے اس کو بتا سکتی ہوں اور کوئی لڑکا تو کیا تمہارے سابق منگیتر نے ہی مجھے پسند کر لیا ہے۔ اپنی توہین کا بدلہ لینے کا یہ ایک اچھا موقع ہے اور پھر عروج مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں خود بھی تو

ان کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگی تھی۔ میں نے اماں سے پوچھا۔

"ندا کو منگنی کا پتا ہے......؟"

میری بات سن کر اماں نے کہا۔

"ہاں......! معلوم ہے اس کو، اور وہ عروج کو پسند کرتی ہے مگر والدین اپنی اولاد کے بارے میں بہتر فیصلہ کرتے ہیں اس لئے وہ والدین کے انکار کے بعد خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے اور میں نے سوچا وہ خاموشی نہیں اختیار کئے ہوئے ہے بلکہ دل میں اب بھی عروج کے ساتھ شادی کی خواہش رکھتی ہے اور اب میں اس کو بتاؤں گی میں کیا چیز ہوں، کمینی لڑکی......!"

"اماں......!"

میں نے ندا سے بازی جیتنے کے لئے کہنا شروع کیا۔

"آپ بابا جان سے کہہ دیں وہ بڑی پھوپھو کو انکار نہ کریں۔ میں نے عروج کو دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھا ہو چکا ہے اور مجھے وہ پسند بھی ہے اور پھر بڑی پھوپھو مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں۔"

"مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ تمہاری پھوپھو جو تمہیں اپنے گھر لے کر گئی ہیں، تو پھر ضرور وہ تمہیں بہکائیں گی۔ ہوسکتا ہے انہوں نے خود ہی فون کر کے عروج کو بلا لیا ہو مگر میں تمہیں بتا دوں، کل جب تم نے کہا تھا کہ اگر وہ لندن کام کرتا ہے پھر تو آپ کو انکار نہیں کرنا چاہئے، تو رات میں نے تمہاری یہ بات تمہارے بابا جان کو بتا دی۔ اس کے بعد ہی انہوں نے فوری طور پر انکار کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور رشتے کرانے والی سے ہم نے تمہارے لئے اچھا

رشتہ تلاش کرنے کا کہہ دیا ہے۔''

''میری بات سنیں اماں جان......! میرے بابا جان کو میری خواہش بتا دیں۔ میں صرف عروج سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور میری پھوپھو کے بارے میں کچھ غلط نہ سوچیں۔ انہوں نے مجھے نہیں بہکایا۔ میں سمجھ دار ہوں۔ اپنا اچھا برا خود سوچ سکتی ہوں۔ عروج ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ایک بہن ہے وہ بھی شادی شدہ اور ملک سے باہر رہتی ہے۔ ایسا اچھا رشتہ باہر سے نہیں مل سکتا۔''

میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

''ایک بار پھر سوچ لو......!''

اماں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''شادی ایک دو دن یا ہفتے کی بات نہیں۔ عمر بھر کے معاملات ہوتے ہیں۔ اس لئے خوب اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرو......!''

''اماں......! عروج میری سگی پھوپھو کے بیٹے ہیں۔ میں ان کے ساتھ خوش رہوں گی۔ آپ بابا جان سے کہہ دیں۔ وہ پھوپھو کو انکار نہ کریں......!''

اب کے میں نے بھی پوری سنجیدگی سے کہا اور اماں جواباً کچھ کہنے کی بجائے خاموش ہی رہی تھیں۔

بہرحال میری خواہش پر بابا جان نے عروج کے رشتے کے لئے ہاں کر دی تھی۔ نہ صرف ہاں کر دی بلکہ فوراً شادی کی تیاری بھی شروع کر دی گئی کہ عروج کو واپس بھی جانا تھا۔

اور پھر میری شادی والا دن بھی آ پہنچا۔ کراچی سے چھوٹی پھوپھو بھی اپنے بچوں کے ساتھ آئی تھیں۔ میں نے دیکھا ندا اُداس اور بجھی بجھی سی تھی۔ میرے ہاتھوں میں مہندی ندا نے ہی لگائی تھی۔ جب وہ مجھے مہندی لگا رہی تھی تو میں نے مزے لے لے کر اس کو بتانا شروع کیا۔

''جب عروج لندن سے واپس آئے تو میں ان کے گھر میں ہی موجود تھی۔ عروج نے مجھے پہلی نظر میں ہی پسند کر لیا۔ یہ رشتہ عروج کی خواہش پر ہوا ہے۔ عروج کہتے تھے، انہوں نے ایسا مکمل حسن اپنی زندگی میں کم ہی دیکھا ہے اور مجھے دل سے چاہتے ہیں۔''

''پلیز فرح......! خاموش رہو، ورنہ مہندی خراب لگے گی۔''

ندا نے تیزی سے کہا جیسے وہ مہندی میرے ہاتھوں پر نہیں چہرے پر لگا رہی ہو۔ میں نے اس کو مزید تپانے کا سوچا۔

''میں نے سنا ہے تمہاری اور عروج کی بات بچپن سے پکی تھی۔ پھر یہ رشتہ کیوں ٹوٹ گیا......؟''

اب کے ندا چپ رہی اور میں نے پھر کہا۔

''تمہیں دُکھ تو ہوگا رشتہ ٹوٹنے کا......؟''

ندا نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر طبیعت کی خرابی کا کہہ کر اپنے روم میں چلی گئی۔ بقایا مہندی مجھے پھر اماں نے لگائی تھی۔ مگر میں دل ہی دل میں ندا کو تپا کر خوش تھی۔ انہوں نے اسامہ کے لئے میرے رشتے سے انکار کیا تھا اور کتنی باتیں بنا کر آج میں نے ندا سے ان سب باتوں کا بدلہ لے لیا تھا۔ یعنی میں نے بازی جیت لی تھی۔

شادی کے بعد میں تھی۔ عروج کے علاوہ پھوپھو کی محبتیں اور میرے ناز نخرے۔ سب ہی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میرا خیال رکھتے تھے۔ میری عمر بھر کی تشنگی مٹ گئی تھی۔ پھر عروج کی چھٹی ختم ہوگئی۔ وہ جانا تو نہیں چاہتے تھے، وہ کہتے تھے۔

"یہاں پر ہی اب کام کروں گا۔"

چاہتی تو میں بھی یہی تھی کہ وہ اب مجھے چھوڑ کر باہر نہ جائیں مگر پھوپھو نے یہ کہہ کر زبردستی ان کو واپس بھیج دیا۔

"اگر تم نہ گئے تو تمہارے ماموں خفا ہوں گے اور کہیں گے۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔"

یہ سن کر میں بھی چپ رہی کہ شادی کے بعد بابا جان جتنی بار بھی آئے تھے، مجھ سے یہ ضرور پوچھتے تھے۔

"تم خوش تو ہو اور یہ کہ عروج لندن واپس کب جا رہا ہے......؟"

اگرچہ خوشی اتنی زیادہ تھی کہ ہر وقت میرے چہرے سے دمکتی رہتی تھی پھر بھی نہ جانے کیوں وہ پوچھتے تھے......؟

عروج واپس لندن چلے ہی گئے۔

عروج شادی کے تین ماہ بعد گئے تھے اور ان کے جانے سے پہلے ہی میں ان کو باپ بننے کی خوش خبری سنا چکی تھی اور ابھی شادی کا ایک برس مکمل بھی نہ ہوا تھا جب اللہ نے مجھے پیارے سے بیٹے سے نوازا۔ میں تو خوش تھی ہی کہ اللہ نے مجھے ماں بنا دیا، عروج مجھ سے بھی زیادہ خوش تھے، اور سب خاندان والے بھی، پھوپھو بھی۔ میں ابھی چھلے میں تھی جب عروج واپس

آ گئے۔

میں بہت خوش تھی مگر آہستہ آہستہ یہ خوشی ماند پڑنے لگی۔ جب عروج نے کہا کہ وہ اب واپس نہیں جائیں گے۔ یہاں پر ہی کام کریں گے۔ پھوپھو نے بہت کوشش کی کہ وہ واپس چلا جائے مگر اب کے انہوں نے پھوپھو کی بھی پرواہ نہ کی۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش تھی کہ چلو اچھا ہے باہر نہیں گئے۔ آخر روٹی ہی تو کھانی ہے، وہ یہاں سے بھی کما لیں گے۔ یہی بات میں نے پھوپھو کو بھی سمجھا دی۔

پھوپھو نے کچھ کہنا چاہا پھر نہ جانے کیا سوچ کر چپ رہیں......؟

اپنے پہلے بیٹے کی سالگرہ سے پہلے ہی میں دوسرے بیٹے کی ماں بن چکی تھی اور تب تک گھر کے حالات بھی کافی بدل چکے تھے۔

عروج نہ واپس لندن گئے اور نہ یہاں سنجیدگی سے کام کرتے تھے۔ کبھی کبھی دُکان پر چند دن لگاتے پھر وہاں سے دل اُکتا جاتا اور دوسری دُکان تلاش کرنے لگتے۔ ایسے میں میرا اور میرے بچوں کا بلکہ سارے گھر کا کرخرچہ پھوپھو کے ذمے تھا۔ یہاں تک کہ بچوں کا دودھ بھی۔ پھوپھا اچھا کما لیتے تھے۔ بابا جان جب ملنے آتے تو پوچھتے۔

"عروج کام کر رہا ہے......؟"

اور میں ان کی عزت رکھنے کے لئے جھٹ سے کہہ دیتی۔

"جی بابا جان......! اپنی دُکان کھولی ہے انہوں نے۔"

تب تک ندا کی شادی لاہور کی ایک بہت بڑی کاروباری فیملی میں ہو چکی تھی۔ ہماری شادی کو پانچ برس ہو چکے تھے اور اب زندگی کے اصل رُخ

میرے سامنے تھے۔ پھوپھو نے مجھے الگ کر دیا اور خود پھوپھا کے ساتھ اوپر والے پورشن میں چلی گئی تھیں۔

"میرا بوڑھا شوہر کب تک تم لوگوں کے خرچے پورے کرے.....؟ اور نہ ہی اب مجھ میں تم لوگوں کو پکا کر کھلانے کی اتنی طاقت ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام.....!"

میں بھلا کیا کہہ سکتی تھی کہ ان کی ساری باتیں سچی تھیں۔

میرا جسم شادی سے پہلے ہی تھوڑا بھاری تھا اور اب مزید بھاری ہو چکا تھا۔ اس پر دو چھوٹے چھوٹے بچے۔ سارے گھر کا کام اور کھانا پھوپھو ہی بناتی تھیں اور یہ بات انہوں نے شادی سے پہلے ہی کہی تھی کہ مجھے گھر کی رانی بنا کر رکھیں گی۔ کبھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیں گی مگر اب وہ ٹائم نہیں تھا۔

ماں بیٹا آپس میں خوب لڑائی جھگڑا کرتے تھے کیونکہ عروج اکثر ان سے پیسے مانگتے تھے۔ شاید اس لئے پھوپھو الگ ہوگئی تھیں۔

"ایک تو خرچہ ہمارا، اس پر کام بھی۔ کھانے پکانے سے لے کر صفائی وغیرہ بھی میں ہی کروں اور تمہیں پیسے بھی میں ہی دوں۔ اپنی پکاؤ اور کھاؤ.....!"

پھوپھو الگ ہوئی تو عروج نے مجھ سے کہا۔

"تم اگر اپنے بابا سے ایک لاکھ مجھے لا دو تو میں اپنا کام شروع کر لوں گا اور پھر تمہیں پیسوں کی بھی کوئی تنگی نہ ہوگی۔ بابا جان سے میں شادی کے بعد پہلی بار پیسے مانگنے آئی تھی۔ انہوں نے انکار تو نہیں کیا مگر ایک لاکھ کے بجائے پچاس ہزار روپے دے دیئے۔ اس کے بعد بھی تین چار بار میں

کبھی بیس ہزار، کبھی دس ہزار لے کر آتی تھی تو اماں نے الگ جا کر پہلی بار سوتیلی ماں ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"آج کے بعد ہمیں ملنے کے لئے ہزار بار آنا مگر اُدھار مانگنے نہیں۔ ہمارے اپنے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تمہیں خود ہی سوچنا چاہئے۔ نوٹ درختوں پر نہیں لگتے جو وہ توڑ توڑ کر تمہیں دیتے رہیں گے۔"

میں ان کی بات سن کر چپ رہی۔ کہتی بھی تو کیا.....؟ انہوں نے پھر کہا۔

"دیکھ لو ندا نے والدین کی پسند سے شادی کی ہے تو کتنے عیش کر رہی ہے۔ کتنی خوش ہے وہ، حالانکہ عروج اس کے بچپن کا منگیتر تھا۔ والدین جو فیصلہ کرتے ہیں، وہی بہتر ہوتا ہے۔ چار دن تم پھوپھو کے گھر رہنے کیا گئی، اپنا رشتہ بھی خود ہی طے کر کے آگئیں.....؟ جب سب کچھ خود کیا ہے تو اب خود ہی بھگتو.....! ہمیں کیوں پریشان کرتی ہو.....؟

عروج کا مسئلہ تو ایک دو دن یا ایک دو ماہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ تو ساری عمر کا مسئلہ ہے۔ وہ شروع ہی سے ایک بگڑا ہوا لڑکا تھا اور پرانی عادتیں کبھی نہیں جاتیں۔ آج کے بعد پیسے مانگنے مت آنا.....!"

کچھ اور سننے سے پہلے ہی عروج نے باہر کھڑی بائیک کا ہارن دیا تو میں تھکے تھکے قدموں سے باہر آگئی۔

اس کے ایک ماہ بعد جب عروج نے پھر مجھے بابا جان سے دس ہزار لانے کا کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے پہلے تو پیار سے منانے کی کوشش کی اور جب میں نہ مانی تو پھر مار مار کر میرا حلیہ بگاڑ دیا اور خود گھر سے

نکل گیا اور میں بچوں کے پاس بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ پھوپھو اتنی مکار تھیں کہ جب انہوں نے ہمیں الگ کیا تو پہلے دن میں نے مٹن کڑاہی بنائی پھر عروج کے کہنے پر ایک پلیٹ سالن ان کو دینے گئی تو انہوں نے سالن لینے کی بجائے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔

”تم لوگ خود ہی کھاؤ......! میں نے بھی آج کڑاہی بنائی ہے چکن کی۔“

تاہم تھوڑی دیر بعد ساتھ والی پڑوسن آئی تو میں نے صاف سنا۔ پھوپھو اس کو کہہ رہی تھیں۔

”آج فرح کڑاہی کا سالن لے کر آئی تھی مگر میں نے واپس کر دیا۔ میں ایک دن یہ سالن لے لیتی تو خود وہ روز ہی بچے بھیج دیا کرتی کہ جاؤ اپنے لئے دادی سے سالن لے آؤ۔ شوہر آتا تو خود آجاتی۔ آپ کے بیٹے نے روٹی کھانی ہے، سالن دے دیں۔ ہم نہ ایک پلیٹ سالن لیتے ہیں اور نہ روز کی دو پلیٹ دیتے ہیں۔

میں نے محبت سے سمجھایا کہ عروج کو واپس لندن بھیج دو مگر کہنے لگی، روٹی ہی تو کھانی ہے، یہاں پر ہی کما کر کھالیں گے۔ اب بھگتے......! ہم میاں بیوی کا سکون برباد کر کے رکھ دیا تھا......؟ اس کا شوہر کماتا نہیں، اور خود یہ موٹی سارا ٹائم سستی سے پڑی رہتی ہے۔ کام کی نہ کاج کی، دشمن اناج کی۔

کھانا ابھی پورا تیار بھی نہیں ہوتا تھا کہ کچن کے چکر لگانے شروع کر دیتی تھی۔ اس وقت سستی ختم ہو جاتی تھی اور بچوں کا شور الگ۔ اب ہم میاں

بیوی یہاں سکون سے رہتے ہیں، سکون سے کھاتے ہیں۔ یہ جانے اور اس کا کام......!“

اس کے بعد میں کبھی ان کو سالن دینے نہ گئی بلکہ بلانا بھی کم کر دیا تھا اور ان سے بات کرنے کا ٹائم ہی کب تھا......؟ گھر کے کام ہی ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ اس پر دو بچے گھر میں اور تیسرا ہونے والا۔

جس روز پہلی بار عروج نے مجھے جی بھر کر مارا، اگلے روز اچانک ندا اپنی بڑی سی گاڑی میں ہمارے گھر آئی۔ میرے چہرے پر جو مکے پڑے کل، وہ اب گہرے نیل کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ندا نے مجھے بغور دیکھا۔ پھر ہنسنے لگی۔

تب میں نے شدت سے یہ بات محسوس کی، میں نے ندا سے بازی جیتنے کے چکر میں اپنی زندگی بھر کا سکون اور خوشیوں کی بازی ہار دی تھی۔ ندا مسکراتی رہی اور میں جلتی رہی۔

وہ میرا حال چال پوچھ کر اوپر پھوپھو کے پاس چلی گئی۔ اس کے بعد اکثر یہ ہوتا جس روز میری ٹھکائی ہوتی، اگلے روز ندا ضرور آتی تھی۔ پہلی بار تو وہ چپ رہی۔ میرا حلیہ دیکھ کر صرف ہنسی تھی لیکن اب وہ مجھے دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں پوچھتی۔

”ارے فرح بھابی......! یہ آپ کے چہرے پر نشان کیسے ہیں......؟“

ذلیل انسان، مکے مارتا بھی زیادہ منہ پر ہی تھا۔ ایک تو ندا کا یہ پوچھنا، اس پر مجھے تپانے کو بھابی کہتی، کیونکہ ولیمے والے دن میں نے بطورِ خاص عروج کو ندا کی بہن کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس لمحے جیت کا جو مزہ میں

نے لیا تھا، وہ صرف ایک لمحے کا تھا۔ اب بار بار میری ذِلت کا تماشا دیکھنے ندا آن موجود ہوتی تھی۔

مجھے تو لگتا ہے جیسے میری ساس ہی اس کو بتاتی ہے کہ آج پھر میری ٹھکائی ہوئی ہے۔ کیونکہ پھوپھو کو وہ اکثر فون کرتی رہتی تھی اور میری ٹھکائی کا وہ سنتے ہی تماشا دیکھنے چلی آتی ہے۔

اور اب اس وقت وہ پانچ سبزیاں لے آیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے میتھی کا ٹکڑا رکھا پھر مٹر نکال رہی تھی کہ دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا سامنے ہی گاڑی میں بیٹھی تھی اور دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

گھر میں داخل ہونے والی ندا تھی لیکن آج وہ اکیلی نہ تھی، ساتھ اس کا شوہر اور بیٹا بھی تھا۔ قیمتی لباس اور تیز پرفیوم جس کی خوشبو ان کے داخل ہوتے ہی پورے گھر میں پھیل جاتی تھی۔

عروج ان کو دیکھتے ہی ان کے استقبال کو اُٹھا اور میں مارے شرمندگی کے وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ایک تو میرا چہرہ بازو مار کھانے سے نیلے ہو رہے تھے، دوسرا میں نے آج گھر کا کام بھی نہیں کیا تھا۔ مارے غصے کے سبزی بناتے ہوئے مٹر کے چھلکے اِدھر اُدھر پورے صحن میں پھینک رہی تھی جس کی وجہ سے سارا صحن گندا ہو رہا تھا۔ ندا میرے قریب آئی، بغور مجھے دیکھا پھر پہلی بار کھل کر چوٹ کرتے ہوئے بولی۔

''لگتا ہے چہرے پر یہ نیلا میک اَپ ہمارے عروج بھائی ہی نے کیا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں......؟''

جواباً میں تو چپ رہی، البتہ عروج نے ندا کی بات سن لی تھی اور وہ

خود بے عزت بندہ تھا، اس لئے کسی دوسرے کی عزت کا خیال کیسے کر سکتا تھا......؟ کہنے لگا۔

''ندا......! مرد کا دماغ خراب نہیں ہوتا کہ وہ عورت کو مارے۔ بعض عورتوں کی عقل موٹی ہوتی ہے۔ اپنے جسم کی طرح۔ مار کھائے بغیر ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔''

عروج کی بات پر وہ دونوں مسکرانے لگے۔ میرا دل تو چاہا کہ کہہ دوں۔

''تم جیسے نالائق مرد اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے عورت پر ہاتھ اُٹھا کر اپنی کمینگی کا ثبوت دیتے ہیں۔''

مگر میں چپ رہی کہ میری بات سنتے ہی عروج پھر مجھے مارے گا اور میں ندا کے سامنے کم از کم مار کھانا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی آج اس کے ساتھ اس کا شوہر تھا۔ ندا کہہ رہی تھی۔

''مما نے بتایا تھا کہ بڑی خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سوچا چھٹی ہے جا کر دیکھ آئیں۔''

پھر وہ مجھے طنز بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ عروج بھی یہ سن کر کہ پھوپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں، ان کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ ندا چلی گئی مگر وہ ذلیل لڑکی جاتے ہوئے پھر میرے پاس کچن میں آئی۔ کچھ دیر مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ جیسے مزہ لے رہی ہو۔

پھر میرے ساتھ ساتھ صحن میں مٹر کے بکھرے چھلکوں کے درمیان بیٹھے بچوں پر ایک وہی پرانی حقارت بھری نگاہ ڈال کر یہ کہہ کر چلی گئی۔

"والدین اولاد کے لئے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں، وہی اچھا ہوتا ہے۔ شکر ہے میں بچ گئی، فرح بھابی......!"

اس نے "فرح بھابی" طنز سے کہا تھا۔

جواباً میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی اور ہارے ہوئے لوگ کسی کو کہہ بھی کیا سکتے ہیں......؟ میں بھی بازی ہار چکی تھی۔



محبت مار دیتی ہے

کالج میں یہ ان چاروں کا تیسرا سال تھا اور یہ تینوں سال پرسکون انداز میں گزرے تھے۔ سمن آباد کالج گو کہ ان تینوں کے گھروں سے کوئی ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا مگر وہ چاروں پیدل ہی کالج آتی تھیں۔

زینب اور فرح مقبول روڈ کی رہنے والی تھیں جبکہ عذرا اور خالدہ مقبول روڈ سے تھوڑا آگے شمال کی طرف رہتی تھیں۔ چاروں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ پڑھائی سے چاروں کو پیار تھا، اس لئے والدین پڑھا رہے تھے۔

وہ جون کی جھلستی ہوئی دوپہر تھی جب وہ سمن آباد کالج کے پچھلے گیٹ سے نکلیں اور تیز تیز قدموں سے راستہ طے کرنے لگیں۔ وہ ہمیشہ گلیوں سے جانا پسند کرتی تھیں مگر بیچ میں دو چار سڑکوں سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔

ابھی وہ کالج والی سڑک سے پہلا موڑ ہی مڑی تھیں کہ ایک کوٹھی کا گیٹ کھلا اور ایک نوجوان لڑکا ہاتھ میں کتے کی زنجیر پکڑے باہر نکلا اور دُور سے آتی ہوئیں ان چاروں پر نظر ڈالی اور معاً دانستہ یا نادانستہ کتے کی زنجیر اس

کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ کتے کی گویا ان سے کوئی پرانی دشمنی تھی، وہ منہ کھول کران کی جانب لپکا تو لڑکے نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے آواز دی۔

"زرغون......! کم آن......!"

مگر زرغون نے جیسے سنا ہی نہیں، وہ چاروں چیختی چلاتی کتے سے بچنے کو جس کا جدھر منہ اُٹھا، اُدھر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ افتاد ایسی آن پڑی تھی کہ ایک کو دوسری کا ہوش نہیں رہا تھا۔

زینب جہاں وہ لڑکا کھڑا تھا، اس کے ساتھ والے گیٹ کی کھڑکی کھلی تھی اور وہ بغیر سوچے سمجھے اندر گھس گئی اور سامنے سے آتے ہوئے مرد سے ٹکرائی تو فائل اور بکس ہاتھ سے گر گئیں۔ یہ بھی ایک ینگ بوائے تھا جو حیران کھڑا زینب کو دیکھ رہا تھا۔

زینب نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ...... کک...... کک...... کتا......!"

اسد نے بغیر کچھ کہے جھک کر پہلے بکس اُٹھائیں اور پھر فائل اُٹھائی تو فائل پر لکھا نام پڑھا۔

"زینب جمیل......!"

"لیجئے......!"

اسد نے بکس اور فائل اس کو تھمائی پھر کہا۔

"آئیں......! اندر آجائیں......!"

"نہیں نہیں......! مجھے جانا ہے۔ پلیز......! آپ یہ روڈ مجھے کراس کروا دیں، پلیز......!"

اس نے گویا منت کی۔

"ضرور کروا دوں گا مگر پہلے آپ اندر آکر ایک گلاس پانی پی لیں......!"

اسد نے کہا تو زینب بولی۔

"نہیں......! آپ رہنے دیں اور مجھے چھوڑ آئیں۔"

اسد مزید کچھ کہے بغیر اندر گیا اور چند پل بعد ہی ٹھنڈی کولڈرنک کا بھرا گلاس لئے اس کے قریب آیا اور بغیر کچھ کہے گلاس زینب کو تھمایا اور زینب نے بھی چپ چاپ پکڑ لیا۔ ایک تو گرمی بہت تھی، دوسرا وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ کولڈرنک پی رہی تھی، نگاہیں جھکائے، اور اسد بغور اس کو دیکھ رہا تھا۔

وائٹ ڈریس میں سہمی گھبرائی ہوئی پیری سی وہ لڑکی اس پل اسد کو بہت اچھی لگی تھی۔ اس نے رُک رُک کر گلاس ختم کیا اور خالی گلاس نیچے گملے کے قریب زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"پلیز......! مجھے چھوڑ آئیں......!"

"آئیے......!"

اسد پہلے باہر نکلا اور بعد میں زینب اور اسد نے دیکھا کہ ٹیپو اپنے گیٹ کے آگے زرغون کی زنجیر تھامے کھڑا تھا جو اس کا چہیتا کتا تھا۔ اسد نے اس کو دیکھ کر کہا۔

"تم باز نہیں آؤ گے اپنی حرکتوں سے......؟"

جواب میں ٹیپو نے اسد کے پیچھے سہمی ہوئی زینب پر نظر ڈالی۔ منہ پھاڑ کر ہنسا اور گویا وضاحت کی۔

"یار......! تم دیکھ رہے ہو گرمی کتنی ہے۔ زرغون پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا اس کو باغ میں لے جاؤں۔ مگر باہر نکلتے ہی زنجیر میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔"

وہ پھر ہنسا تو اسد زینب کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ روڈ سے گلی میں داخل ہوتے ہی زینب نے کہا۔

"تھینک یو......! اب آپ جا سکتے ہیں۔"

"آپ لائیک کریں تو میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

"نہیں......! وہ سامنے میری تینوں فرینڈز کھڑی ہیں۔ اب ہم چلے جائیں گے۔"

اور اسد کچھ کہے بغیر واپس مُڑ گیا تو زینب اپنی دوستوں کی سمت بڑھی تو فرح نے کہا۔

"ہم تمہارے ہی انتظار میں کھڑے تھے۔ تم ٹھیک ہو......؟"

"ہاں......! میں ٹھیک ہوں......! اگر کتا ہم میں سے کسی کو پکڑ لیتا تو کیا ہوتا......؟"

زینب کے لہجے میں ہی نہیں، چہرے پر بھی ابھی تک خوف تھا کہ کتا لپکا اس کی جانب تھا۔ اس لئے وہ کتے کے قریبی گھر میں گھسی تھی۔

"اس ذلیل لڑکے نے جان بوجھ کر زنجیر چھوڑی تھی۔"

عذرا نے کہا اور چاروں اس کتے والے نوجوان کو برا بھلا کہتی ہوئیں اپنے گھروں کی سمت روانہ ہوئیں تھیں جبکہ اسد واپس آیا تو ٹیپو ابھی تک باہر کھڑا تھا۔ اسد نے ایک بار پھر کہا۔

"انسان بن کر رہا کرو......! خواہ مخواہ معصوم لڑکیوں کو پریشان کرتے ہو......!"

جواب میں وہ مسکراتا رہا اور اسد اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

اسد کل چھ بہن بھائی تھے۔ پانچ بھائی اور ایک بہن اور اس کا نمبر لاسٹ تھا اور وہ سارے گھر کا لاڈلہ تھا۔

دوسرے روز چھٹی تھی۔ تیسرے دن جب وہ چھٹی کے بعد باہر آئیں تو موڑ موڑتے ہی ٹیپو پر نظر پڑ گئی جو پھر کتے کی زنجیر تھامے کھڑا تھا۔ وہ چاروں جہاں تھیں، وہیں رُک گئیں۔ ان چاروں کی یہ عادت تھی کہ چھٹی ہوتے ہی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کالج سے باہر نکل پڑتی تھیں۔ معاً اسد پر نظر پڑی جو اپنے گھر سے نکل کر ٹیپو کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

ان چاروں کو کچھ حوصلہ ہوا اور وہ ان کے قریب سے تیز تیز قدم اُٹھاتیں گزر گئیں تو اسد نے ایک سرد سانس کھینچ کر کہا۔

"کمینے......! تمہاری شرارت نے میرا سکون غارت کر دیا ہے۔ جانتے ہو میں پرسوں سے زینب کے بارے میں سوچے جا رہا ہوں۔"

"اوہ......! تو وہ لڑکی جو تمہارے گھر پناہ کے لئے بھاگی تھی، اس کا نام زینب ہے......؟"

ٹیپو نے ہنس کر اس کو دیکھا پھر کہا۔

"وقت ضائع بے وقوف کرتے ہیں، کل اس کو پکڑ کر اظہارِ محبت کر ڈالو......!"

"یہ اتنا آسان نہیں اور پھر اتنی جلد بازی بھی اچھی نہیں۔ اور وہ اکیلی

بھی تو نہیں ہوتی۔ ویسے لڑکی پیاری ہے ناں......؟''

جواب میں ٹیپو منہ پھاڑے ہنستا رہا اور اسد اس کو وہیں چھوڑ کر گھر کے اندر چلا گیا۔

ایک ہفتہ بعد اس کو موقع مل گیا۔ اس دن موسم بے حد خراب تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی اور دن میں بھی یہ سلسلہ جاری تھا۔ کبھی رُک جاتی، کبھی شروع ہو جاتی۔

کالج میں حاضری بھی خاصی کم تھی۔ زینب کے ساتھ آنے والی تینوں لڑکیاں خراب موسم کی وجہ سے نہیں آئی تھیں مگر زینب کا چونکہ آج پریکٹیکل تھا، اس لئے وہ رُک نہیں سکتی تھی۔

اور اس کو تنہا دیکھ کر اسد نے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وہ روڈ کراس کر کے گلی میں داخل ہوئی، اسد بھی اس کے پیچھے گلی میں داخل ہوا اور کہا۔

''پلیز......! میری بات سن لیں......!''

زینب کو غصہ تو بے حد آیا مگر وہ رُک گئی اور اسد نے بغیر کسی تمہید کے زینب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپ کو کیسا لگتا ہوں......؟''

''جی......؟ کیا مطلب......؟''

زینب نے حیرانی سے پہلے اس کو دیکھا پھر چند قدموں کے فاصلے پر پیچھے کھڑے ٹیپو کو، جو کتے کی زنجیر تھامے کھڑا تھا۔ مگر دیکھ ان دونوں کو رہا تھا۔

''میرا مطلب ہے میں آپ کو اچھا لگتا ہوں یا برا......؟ بتا دیں

پلیز......!''

اسد نے وضاحت کی تو زینب نے کتے کے ساتھ پیچھے کھڑے ٹیپو کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''اگر میں نے انکار کیا تو وہ کتا نہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ظاہر ہے اگر وہ کتے والے دوست کو ساتھ لایا ہے تو یہی ہو سکتا ہے......؟''

''اب کیا کروں......؟''

وہ گم سم سوچ میں پڑ گئی۔

''پلیز......! بتائیں ناں......!''

اسد نے پھر پوچھا۔

''جی......! مجھے معلوم نہیں......!''

اس نے کتے کے ڈر سے گول مول جواب دیا۔

''لو بھلا......! یہ کیا بات ہوئی......؟ معلوم نہیں......؟ اگر اچھا لگتا ہوں تو ہاں کہہ دیں۔ اگر برا لگتا ہوں تو......''

اس نے دانستہ بات اُدھوری چھوڑ دی تو زینب نے کہا۔

''جی......؟ میں سوچ کر بتاؤں گی۔''

اور پھر کتا تھامے کھڑے ٹیپو کو دیکھا۔

''کل بتائیں گی......؟''

اسد نے پوچھا اور زینب سر ہلا کر فوراً چل دی۔

اسد واپس مڑا تو پیچھے کھڑے ٹیپو کو دیکھ کر غصے سے پوچھا۔

''تم یہاں کیا لینے آئے تھے......؟''

''تمہیں بچانے......! ورنہ جوتیاں پڑسکتیں تھیں۔ ویسے کیا کیا باتیں ہوئیں......؟''

اسد جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

اسد کو کل کا شدت سے انتظار تھا مگر افسوس، وہ کل نہ آئی۔ کیونکہ دوسرے روز زینب نے بھی چھٹی کر لی اور مزید دو دن بعد کالج گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند ہوگیا تو اسد بے چین ہوگیا۔ ٹیپو نے اس کی یہ حالت دیکھی تو کہا۔

''اس لئے کہتا تھا، وقت ضائع نہ کرو......!''

''مجھے اس کے گھر کا پتا بھی تو نہیں......!''

اسد نے بے بسی سے کہا۔

''یار......! اب صبر کرو......! بلکہ چلو، گھومنے پھرنے چلتے ہیں۔''

ٹیپو نے کہا مگر اسد جواب دیئے بغیر کھڑا زینب کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ وہ دانستہ نہیں آئی تھی، یا کوئی مجبوری ہوگئی تھی......؟

زینب گھر پہنچی تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب چھٹیوں کے بعد ہی کالج جائے گی۔ رہا چھٹیوں کا ہوم ورک تو وہ کسی بھی فرینڈ سے فون کر کے پوچھا جا سکتا تھا۔ اس لئے وہ کالج ہی نہ گئی۔

اس کو اسد پر بے حد غصہ تھا۔ وہ اس کو ایک شریف لڑکی سمجھتی تھی مگر وہ کتا اس کے سر پر کھڑا کر کے جواب طلب کر رہا تھا کہ وہ اس کو اچھا لگتا ہے یا برا......؟ خوب صورت لڑکی دیکھ کر لڑکے آپے میں نہیں رہتے۔

''کمینہ......! ذلیل......!''

وہ بڑبڑائی پھر چھوٹی بہن کی آواز سن کر باہر نکل آئی۔



زینب کے والد ایک سرکاری ملازم تھے وہ چار بہنیں اور تین بھائی تھے۔ ایک بھائی زینب سے بڑا تھا، باقی میں بھائی زینب سے چھوٹے تھے۔ والد صاحب ذرا سخت مزاج تھے اور ماں ایک عقل مند اور نرم مزاج عورت تھی۔ جس کی عقل اور سلیقے سے گھر کا ماحول پرسکون رہتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کی تربیت اور تعلیم پر ان پڑھ ہونے کے باوجود پوری توجہ دے رہی تھی۔ زینب کو اپنی ماں پر فخر تھا۔

عام دنوں میں تو ماں اس کو کسی کام کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی تھیں مگر چھٹی والے دن زینب کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ماں کا ہاتھ بٹائے مگر ماں اس کو منع کر دیتیں کہ تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اگر وہ برتن صاف کرنے کی ضد کرتی تو ماں کہتی۔

''نہ نہ......! برتن تو ہرگز صرف نہیں کرنا، ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔''

پھر وہ زینب کو پیار سے گلے لگا کر گویا خود کلامی کے انداز میں کہتیں۔

''حسن خدا نے میری چاروں بیٹیوں کو دل کھول کر دیا ہے اور تعلیم و تربیت میں خود ایسی کروں گی کہ بڑے بڑے امیر خاندانوں کے رشتے آئیں گے میری سب بیٹیوں کے لئے۔ وہ جہاں بھی جائیں گی، رانیاں بن کر راج کریں گی۔''

زینب ان کی یہ بات سن کر دل ہی دل میں ہنس دیتی لیکن ماں کا دل رکھنے کو وہ ان کی بات پر آمین ضرور کہتی تھی۔

زینب نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، تب سے اپنی ماں کو اترن ہی پہنتے دیکھا تھا۔ زینب کے تین ماموں تھے۔ وہ بہت زیادہ امیر تو نہ تھے مگر پھر بھی ان کی حیثیت زینب کے گھر والوں سے کافی اچھی تھی۔ زینب کی امی اپنی بھابیوں کے کپڑے ہی پہنا کرتی تھیں اور ایک بڑی بہن بھی اپنے گھر میں ٹھیک ٹھاک تھی۔ وہ بھی اپنے اور اپنے شوہر کے علاوہ بچوں کے کپڑے بھی امی کو ہی دیتی تھیں۔

امی سارے کپڑے لے آتیں مگر بچوں کو کبھی اُترن نہ پہنائی۔ البتہ ان کے شوہر اور بچوں کے پکڑے جوتے دے کر وہ ہمیشہ گھر کے لئے کانچ کے اچھے برتن لے لیا کرتی تھیں۔ زینب تو یہ سوچا کرتی تھی۔

"امی جو مہینے دو مہینے بعد ماموں یا بڑی خالہ کے گھر جاتی ہیں تو ملنے نہیں، شاید کپڑے وغیرہ ہی لینے جاتی ہیں......؟"

وہ چاروں بہنیں اپنی امی پر گئی تھیں۔ ان کی امی بہت خوب صورت تھی اور ابو کے نقش تو تیکھے تھے مگر رنگ گہرا تھا اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ وہ سب بہنیں ماں پر گئیں تھیں تو تینوں بھائی باپ پر۔ کبھی کبھی زینب کہتی۔

"امی......! کیا اچھا ہوتا ہم ابو پر چلی جاتیں اور بھائی آپ پر۔"

ماں فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ ویسے اب بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر کہتی۔

"ایسا نہیں کہتے......! ہمیشہ منہ سے اچھی بات نکالتے ہیں۔"

زینب کی امی جتنی نرم مزاج تھیں، ابو اتنے ہی سخت مزاج تھے۔ بلکہ اکثر بیوی پر ہاتھ اُٹھا لیا کرتے مگر ماں نے اس کے باوجود ان کو کبھی پریشان نہیں کیا۔ اگر کبھی زینب یا بھائی ابو کے سخت مزاج کی شکایت کرتے کہ وہ آپ سے بہت زیادتی کر جاتے ہیں تو وہ مسکرا کر کہتیں۔

"سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیشہ دونوں میں سے ایک کا سخت مزاج ہوتا ہے۔"

انہوں نے کبھی بچوں کے دل میں باپ کے لئے نفرت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔

"نانا ابو تو ایسے نہیں......!"

زینب فوراً کہتی تو امی کہتیں۔

"اللہ جنت بخشے تمہاری نانی بہت گرم مزاج تھیں۔ اگر ہمارے ابو ایسے نہ ہوتے تو ہم زندہ ہی نہ رہ سکتے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر وہ بچوں کو بے رحمی سے مارتی تھیں۔"

بہر حال وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ وہ کالج پہنچ گئی۔ بھائی کالج چلے گئے مگر ابو کے مزاج میں نرمی نہ آئی۔ بڑے ماموں نے اپنے بڑے بیٹے کے لئے زینب کا رشتہ چاہا مگر ماں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ زینب ابھی پڑھنا چاہتی ہے۔ ماموں کو شادی کی جلدی تھی۔ انہوں نے بڑی خالہ کی ارم کا رشتہ لے لیا اور ماں نے زینب سے کہا۔

"میری بیٹی تو کسی بڑے بنگلے یا محل میں جائے گی۔"

زینب چپ رہی۔

وہ عملی لڑکی تھی۔ جانتی تھی ماں جو سوچتی ہے، وہ ناممکن ہے مگر وہ ماں کا دل نہیں توڑ سکتی تھی۔ اس لئے ان کی باتوں پر چپ رہتی۔

چھٹیاں ختم ہوگئیں اور وہ فرح کے ساتھ کالج آئی کہ باقی دو فرینڈز خالدہ اور عذرا ابھی اپنے نانا کے گاؤں سے واپس نہیں آئیں تھیں۔ جب وہ کتے والی کوٹھی کے قریب پہنچی تو اچانک ساتھ والی کوٹھی سے وہ ہی لڑکا نکلا جس نے زینب سے پوچھا تھا۔

''کیا میں آپ کو اچھا لگتا ہوں......؟''

اِدھر اُدھر ایک نظر ڈال کر وہ تیزی سے زینب کے سامنے آیا اور فرح کی پرواہ کئے بغیر کہا۔

''میں نے تین ماہ پہلے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا اور آپ ایسی غائب ہوئیں کہ آج شکل دکھائی......؟''

سچی بات تو یہ تھی کہ زینب کے ذہن سے یہ لڑکا نکل چکا تھا۔ اب اس نے سامنے آکر پھر پہلے والی بات کی تو زینب کو سب کچھ یاد آگیا۔ مگر اس نے فرح کی وجہ سے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا سوال......؟''

''میں آپ کو کیسا لگتا ہوں......؟''

اس نے فرح کی پرواہ کئے بغیر زینب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ زینب کو بے حد غصہ آیا اور اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو ایک شریف لڑکا سمجھتی تھی مگر آپ......''

وہ رُکی پھر تلخی سے کہا۔

''بہت شوق ہے اپنے بارے میں میرے خیالات جاننے کا تو سن لیں......! آپ مجھے بہت برے لگتے ہیں۔ غنڈے اور بدمعاش لگتے ہیں۔ پھر کبھی میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''

پھر وہ فرح کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی تو فرح نے پوچھا۔

''یہ کیا چکر ہے......؟''

اور زینب نے چھپانا مناسب نہ سمجھا اور سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

پہلا دن ہونے کی وجہ سے کالج میں حاضری کم رہی۔ ٹیچرز کلاسز میں آئیں مگر صرف ہائے، ہیلو کرنے۔ یہی وجہ تھی ٹائم سے کچھ پہلے ہی زینب اور فرح کالج سے چلی آئیں۔ جب وہ کتے والی کوٹھی کے قریب پہنچیں تو صبح والا لڑکا پھر اپنے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔

فرح اور زینب نے دُور سے دیکھ لیا تھا اور زینب نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر اب اس نے کوئی بکواس کی تو اچھی طرح طبیعت صاف کرے گی۔ وہ اس کے سامنے سے گزریں تو وہ چپ ہی رہا۔ کچھ آگے جانے کے بعد جب وہ گلی میں مڑنے لگیں تو پتا چلا وہ پیچھے آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر فرح نے کہا۔

''پوچھو اس سے وہ ہمارے پیچھے کیوں آرہا ہے......؟''

''چپ چاپ چلتی رہو......! رُکنے کی ضرورت نہیں۔''

زینب نے کہا۔

مگر پھر ان کو رُکنا ہی پڑا کہ اسد نے زینب کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے راستہ روک لیا تھا۔

''آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں۔ مجھے تو آپ سے پہلے دن ہی محبت......''

مگر اسد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی زینب نے شدید غصے سے کہا۔

''میں کوئی بکواس سننا نہیں چاہتی۔ راستہ چھوڑ دیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

اور اسد نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے اس کی فائل پر ایک کاغذ رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کو پھاڑنے سے پہلے پڑھیئے گا ضرور......!''

اور تیزی سے واپس مڑ گیا اور زینب کی بجائے وہ رقعہ فرح نے اُٹھا کر اپنی فائل میں رکھتے ہوئے کہا۔

''تم اس کو پھاڑ دو گی لیکن اب جب وہ دے ہی گیا ہے اتنی محنت کر کے، تو پڑھنا چاہیئے کہ اس میں لکھا کیا ہے......؟''

پھر وہ اپنے گھر جانے کی بجائے زینب کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی۔ ابھی کوئی بھی اسکول سے نہیں آیا تھا۔ زینب کی امی کچن میں کھانا بنا رہی تھیں۔ وہ دونوں امی کو سلام کر کے اندر روم میں آئی اور بیٹھتے ہی فرح نے لیٹر کھول لیا اور اونچی آواز میں پڑھنے لگی تو زینب نے ٹوک دیا۔

''کیا کرتی ہو......؟ امی سن لیں گیں، منہ میں پڑھو......!''

''ڈیئر زینی......!

دیکھو، تم جو مجھے سمجھتی ہو، میں ویسا نہیں ہوں۔ میں ایک اچھا لڑکا ہوں اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگلش کر رہا ہوں۔ تم یقین کرو، جس دن تم کتے سے ڈر کر گھبرائی ہوئی ہمارے گھر گھسی، میں سامنے سے آ رہا تھا۔ تم پہلی نظر میں ہی مجھے اچھی لگی۔ میں تمہیں چھوڑ کر آیا۔ سو فیل ہوا، میرا دل میرے اختیار میں نہیں۔ رات سونے لیٹا تو نیند کی بجائے تمہاری آنکھوں میں اُتر آئی۔

وہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جو پوری رات جاگ کر گزاری۔ تب مجھے پتا چلا کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ تم نے جس نفرت بھرے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہ میرے لئے دُکھ کا باعث ہے۔

زینی......! یقین کرو......! مجھے تم سے محبت ہے اور اب میں تمہارے علاوہ کی لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی تمہارے بغیر جی سکتا ہوں۔

ارے......! تمہارے بغیر جینا تو کیا جینے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ سانسوں کے بغیر شاید میں کچھ پل جی سکتا ہوں مگر یقین کرو......! تمہارے بغیر نہیں۔

تم......! ہاں تم پہلی لڑکی ہو جسے میں زندگی سے بڑھ کر چاہنے لگا ہوں۔ میرا آج، میرا کل، میرا دل، میرا

پل صرف تمہارے دم سے ہے۔ میری عبادت میں، میری دُعاؤں میں، میری خاموشی میں، میری صداؤں میں، صرف تم ہو۔ تارے ٹوٹ جائیں گے، چاند بجھ جائے گا، وقت وہیں ٹھہر جائے گا لیکن اُمید کی آخری کرن جلنے تک آخری سانس چلنے تک میں تمہارا راستہ دیکھوں گا۔ تمہارا انتظار کروں گا۔

دیکھو......! میرا دل نہیں توڑنا۔ مجھے لیٹر کا جواب ضرور لکھنا اور محبت کے اقرار کے ساتھ......!

مجھے کسی لڑکی کو لیٹر لکھنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں یقین کرو تم پہلی لڑکی ہو جس کو میں لیٹر لکھ رہا ہوں۔ یہ سب بھی لکھ نہ پاتا اگر میرا دل ساتھ نہ دیتا جو دل میں تمہارے لئے تھا وہ سب کہہ ڈالا اُمید ہے تم مایوس نہیں کرو گی۔"

"لو تم بھی پڑھ لو......!"

فرح نے خود پڑھنے کے بعد لیٹر زینب کو دیا اور جب پڑھ چکی تو فرح نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لو لیٹر لکھنے کا تو اچھا خاصا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ لکھا اس نے یہ ہے کہ کسی بھی لڑکی کو خط لکھنے کا پہلا تجربہ ہے۔"

"اس لو لیٹر کو آخری سمجھو......! ایسی طبیعت صاف کروں گی کہ لیٹر لکھنا تو دُور کی بات......! عمر بھر کبھی کسی لڑکی کو دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر

پائے گا۔ محبت...... ہونہہ......! یہ محبت ہوتی کیا بکواس ہے......؟ ذلیل......! کمینہ......!"

زینب گالیاں دیتی رہی جب کہ فرح ایک بار پھر لیٹر پڑھ رہی تھی۔ لیٹر پڑھنے کے بعد جب وہ جانے لگی تو زینب نے اس کو کھانے پر روک لیا۔

دوسرے روز زینب پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی اور اسد بھی اپنے گھر کے باہر موجود تھا۔ زینب نے خود اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"یہ جو بکواس آپ نے لکھ کر مجھے دی تھی، میں نے پڑھ لی ہے اور یاد رکھنا اس کے بعد نہ مزید بکواس پڑھنے کا موڈ ہے نہ سننے کا۔ آپ کو مجھ سے محبت ہے، تو ہوتی رہے۔ مجھے نہ آپ سے محبت ہے نہ کبھی ہوگی۔"

کہتے ہوئے زینب نے اس کا لیٹر پھاڑ کر اس کے سامنے پھینکا تو اسد جو بت بنا اس کی باتیں سن رہا تھا، چونک پڑا۔ مگر تب تک زینب فرح کے ساتھ آگے بڑھ چکی تھی۔

دوپہر میں وہ کالج سے پڑھ کر آئیں تو اسد اپنے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ٹیپو بھی تھا۔ جب وہ دونوں ان کے قریب سے گزریں تو وہ دونوں ہی ان کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

فرح کو غصہ تو بے حد آیا مگر چپ چاپ آگے بڑھتی رہیں۔ چند لمحوں بعد ہی ان کو محسوس ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ان کے پیچھے ہیں۔ کچھ دیر تو زینب ضبط کرتی رہی پھر رُک کر پوچھا۔

"آپ ہمارے پیچھے کیوں آ رہے ہیں......؟"

زینب کی بات پر اسد تو چپ رہا جب کہ ٹیپو نے منہ بگاڑ کر کہا تھا۔

"آپ کو یہ خوش فہمی کیسے ہوگئی کہ ہم آپ کے پیچھے آ رہے ہیں......؟ یہ راستہ ہے اور ہم اپنے کام سے جا رہے ہیں۔"

زینب نے پھر کچھ نہیں کہا اور وہ زینب کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر واپس مڑ گئے تھے جبکہ فرح کا گھر کچھ آگے تھا اور وہ اپنے گھر کی جانب چل دی تھی۔

اس کے بعد زینب نے اسد کو نہیں دیکھا تھا مگر چھٹی کے بعد جب وہ ان کے گھر کے قریب سے گزرتی تو اس نے فل آواز میں ڈیک لگا کر ڈرائنگ روم کی ونڈو اوپن رکھی ہوئی تھی اور شاید خود بھی ونڈو میں کھڑا ہوتا ہو۔ ایک روز ڈیک پر گانا چل رہا تھا۔

"نہیں یہ ہو نہیں سکتا
کہ تیری یاد نہ آئے
بنا تیرے اب یہ دِل
کہیں بھی چین نہ پائے
تجھے بھولنے سے پہلے
میری جان چلی جائے"

مگر زینب کوئی خاص توجہ نہ دیتی تھی۔

البتہ فرح کہتی۔

"وہ یہ دردناک سانگ صرف تمہیں سنانے کو لگاتا ہے کہ شاید بات بن جائے یا...... اچھا خاصا ہے پھر کیوں یہ برہمی......؟"

"اس لئے کہ میں ان فضول باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

"یہاں اس کی بات کبھی نہیں بنے گی۔"

زینب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا تو فرح چپ ہوگئی۔

چند ہفتے یوں ہی گزرے۔ پھر ایک دن ٹیپو نے اس کا راستہ روک لیا۔ زینب اس کو برا بھلا کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے کہہ دیا۔

"بہن پلیز......! میری بات سن لیں۔ بعد میں بے شک پاؤں سے جوتا اُتار لیجئے گا۔"

پھر اس نے کہا۔

"آپ نے غلط سمجھا ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور آپ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ ایک بار اس کو مل لیں۔ وہ اپنی امی کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ پلیز......! آپ ایک بار اس کو مل کر اس کی بات سن لیں۔ وہ بہت ڈسٹرب ہے۔ اس کے فائنل سمسٹرز سر پر ہیں مگر اس کو پڑھنے کا بھی ہوش نہیں۔ دیکھیں محبت پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔"

"آپ نے جو کہنا ہے کہہ چکے......! اب میری سن لیں۔ میں محبت جیسی بات پر یقین نہیں رکھتی اور کالج میں پڑھنے کے لئے آتی ہوں، اپنا رشتہ تلاش کرنے نہیں۔ میرے گھر والے اس بات کو کبھی پسند نہیں کریں گے اور آپ پھر کبھی میرا راستہ مت روکنا۔ میری شادی میرے والدین اپنی مرضی سے کریں گے۔"

کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ تو شکر تھا، آج وہ اکیلی تھی ورنہ فرح کے ساتھ باقی فرینڈز بھی مذاق اُڑاتیں۔

اس واقعہ کے بعد ڈیک والا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ جب بھی وہ اس کے گھر کے قریب سے گزرتی، ایک خاموشی سی چھائی ہوتی۔

مگر پھر اچانک ایک ایسا حادثہ ہوا کہ زینب کو محبت جیسے منہ زور جذبے پر یقین کرنا پڑا، بلکہ ایمان لانا پڑا۔

ہوا یوں کہ اس کی کلاس فیلو روبی جو کہ بہت گہری دوست بھی تھی اور تھی بھی بے حد امیر خاندان سے، اس کے بھائی کی شادی تھی۔ اس نے زینب اور فرح کو دعوی دی۔ فرح نے تو معذرت کر لی کہ اس کے گھر والے اس کو اجازت نہیں دے سکتے تھے، جبکہ زینب اس کی گہری دوست تھی، اس لئے روبی نے کہا۔

"تمہیں ہر حال میں آنا ہوگا۔ فکر نہ کرنا، واپس چھوڑنے میں خود آؤں گی۔"

اور زینب نے امی سے اجازت لے کر اس کو بتا دیا کہ وہ آئے گی۔

مہندی والی رات وہ بھائی کے ساتھ آئی اور بھائی باہر ہی سے اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ روبی اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور اپنی بہنوں اور امی سے بھی اس کا تعارف کروایا تھا اور کزنز سے بھی۔

پھر لڑکی والے مہندی لے کر آ گئے۔ خوب ہنگامہ رہا اور جب لڑکی والے چلے گئے تو زینب نے بھی جانے کی اجازت مانگی۔

"اچھا آؤ......! میری ایک کزن نے بھی جانا ہے۔ تم دونوں ایک ساتھ چلی جاؤ......!"

پھر اس نے سیمی کو آواز دی اور کہا۔

"ٹیپو بھائی......! تم دونوں کو چھوڑنے جائیں گے، جلدی کرو......!"

وہ دونوں روبی کے ساتھ باہر آئیں تو ابھی تک گاڑیوں کی لمبی لائن تھی۔ مہمان رُخصت ہو رہے تھے۔ روبی ان کو ٹیپو کی گاڑی کے پاس لائی۔ ٹیپو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی تھا۔ روبی نے دروازہ کھول کر ان دونوں کو بیٹھنے کا کہتے ہوئے ٹیپو بھائی سے کہا۔

"یہ میری دوست زینب ہے، جب تک اس کے گھر والے دروازہ کھول کر اس کو پک نہ کر لیں تب تک آپ نے واپس نہیں آنا۔"

ٹیپو بھائی نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے صرف سر ہلایا تھا اور کار چل پڑی۔

پہلے سیمی کا گھر آیا، وہ اُتری تو زینب گھبرا گئی۔ مگر مجبوری تھی، کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ سیمی کے اُترنے کے چند منٹ بعد ہی گاڑی پھر رُک گئی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے زینب سے کہا۔

"پلیز......! ذرا باہر نکلیں، گاڑی شاید خراب ہوگئی ہے۔"

زینب جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر نکلی، فرنٹ سیٹ والا لڑکا بھی نیچے اُترا اور اس کو دیکھ کر زینب مارے خوف کے کانپ کر رہ گئی۔ وہ کوئی اور نہیں، اسد تھا۔ اس نے ایک نظر زینب پر ڈالی پھر پلٹ کر ٹیپو سے کہا۔

"آدھے گھنٹے بعد آ جانا۔"

"اب موقع ملا ہے تو اطمینان سے بات کرو۔ میں ایک دو گھنٹے بعد آؤں گا۔ سب کو پتا ہے کہ مہندی کا ہنگامہ فجر تک چلتا رہتا ہے۔"

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے جو دیکھا، زینب نے مڑ کر اس کو

دیکھا، اب گاڑی کے اندر کی لائٹ جل رہی تھی اور کتے والا لڑکا زینب کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا مگر قبل اس کے زینب کچھ سوچتی، گاڑی چل دی۔ اسد جس کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا، اس کی ڈور بیل پش کی اور پاس کھڑی زینب سے کہا۔

‘‘گھبراؤ نہیں......! بات کرنے کے بعد میں تمہیں خود تمہارے گھر چھوڑ کر آؤں گا۔’’

‘‘مجھے اندر نہیں جانا......! یہاں پر ہی بات کرلیں۔’’

زینب نے گویا ہار مان لی۔

‘‘یہاں پولیس پکڑ لے گی کہ آدھی رات کو یہاں تمہارا کیا کام......؟ اور صبح اخبار میں اسٹوری لگ جائے گی، اور سنو......! یہ گھر میرے دوست کا ہے۔ اس کے سامنے چپ رہنا۔’’

اتنے میں گیٹ کے ساتھ والی کھڑکی کھلی، اسد کا ہم عمر لڑکا باہر نکلا اور اسد پر نظر پڑتے ہی ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

‘‘آؤ آؤ......! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔’’

پھر وہ اندر چلا گیا تو اسد نے زینب کو دیکھا۔ انکار فضول تھا، وہ اس کے پیچھے چل دی۔

اسد کا دوست ان دونوں کو گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر بنے اپنے روم کی سمت لایا۔ ابھی وہ اندر داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ پھر ڈور بیل ہوئی اور اسد کے دوست نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

‘‘تم بیٹھو......! میں دیکھتا ہوں، کون ہے......؟’’

اور اسد زینب کے ساتھ روم میں داخل ہوا۔ خاصا بڑا روم تھا جس

میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ صوفے بھی لگے ہوئے تھے اور ڈبل بیڈ بھی تھا۔ ٹی وی، ڈیک، کمپیوٹر، سی ڈی۔

‘‘بیٹھو......!’’

اسد نے زینب سے کہا۔ زینب جواب چپ چاپ کھڑی رہی تو اسد نے کہا۔

‘‘ٹیپو ایک گھنٹہ بعد گاڑی لے کر آئے گا تب تک تو تمہیں بیٹھنا ہی ہوگا۔’’

زینب بغیر جواب دیئے بیٹھ گئی تو اسد نے اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

‘‘اگر تم سیدھی طرح میری بات مان لیتی تو مجھے یہاں اس طرح نہ لانا پڑا۔’’

زینب جواب میں اس کو برا بھلا کہنا ہی چاہتی تھی کہ اسد کا دوست دو لڑکوں کے ساتھ روم میں داخل ہوا۔ اسد نے چونک کر ان کو دیکھا پھر اُٹھتے ہوئے اپنے دوست سے کہا۔

‘‘اظہر......! مجھے تنہائی میں......’’

مگر اظہر نے اس کو بات پوری کرنے کا موقع دیئے بغیر کہا۔

‘‘تم آرام سے اپنی باتیں کرو......! وہ اپنی کریں گے۔’’

کہتے ہوئے اظہر دونوں لڑکوں کے ساتھ اسد کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ تیسرا کھڑا زینب کو گھورنے والے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ پھر بغیر نام لئے بولا۔

"بیوٹی فل......!"

اور زینب کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ زینب نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اسد کو دیکھا۔

اس کو اندازہ ہو چکا تھا، اس نے اظہر پر اعتبار کر کے غلطی کی ہے مگر اس وقت غصہ کرنا یا دکھانا بے وقوفی تھی۔ اس لئے زینب کو اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اظہر سے کہا۔

"ہم لوگ باہر لان میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"

"تم لان میں چلے گئے تو ہم یہاں کیا کریں گے......؟"

زینب کے ساتھ بیٹھنے والے لڑکے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

اسد نے اس لڑکے کو جواب دینے کی بجائے اظہر سے کہا۔

"میں تمہیں اچھا لڑکا سمجھتا تھا۔"

"اچھا لڑکا......؟"

اظہر نے بیٹھے بیٹھے قہقہہ لگایا پھر کہا۔

"میں اگر اچھا لڑکا ہوتا تو اس وقت تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوتا۔ جبکہ میں نے تو کالج کی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی۔"

اسد اس کی بات کا جواب دیئے بغیر دروازے کی سمت بڑھا تو اظہر کے ساتھ جو دو لڑکے بیٹھے تھے، ان میں سے ایک واش روم میں جا چکا تھا جبکہ دوسرے لڑکے نے اُٹھتے ہوئے نرمی اور سکون سے کہا۔

"تم اظہر کے دوست ہو تو ہمارے بھی دوست ہو اور دوستوں میں کسی چیز کا پردہ نہیں ہوتا۔ دوست اپنی چیز مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ تم اس کو لائے

ہو اس لئے پہلا حق تمہارا تسلیم کرتے ہیں۔ باقی دوسرا تیرا حق کسی کا ہوگا۔ اس کے لئے قرعہ اندازی...... کیونکہ ہم میں سے جب بھی کوئی لڑکی لاتا ہے، ہم سب مل کر...... تم شاید پہلی بار...... خیر......! کام شروع کرو......! ویسے کیا چیز لائے ہو......! کیا فگر ہیں......!"

"یو شٹ اَپ......!"

اسد ضبط نہ کر سکا اور ایک زور دار تھپڑ اس کے مِنہ پر رسید کیا تو دوسرے لڑکے کے ساتھ اظہر بھی مارے غصے کے کھڑا ہوگیا۔ اسد نے سہی ہوئی زینب کو دیکھا اور کہا۔

"تم باہر چلو......! میں ان سے بات کر کے آتا ہوں۔"

زینب ڈور کی سمت بڑھی تو دوسرے لڑکے نے لپک کر زینب کی کلائی تھام کر کہا۔

"تم کہاں چلی......؟ تمہاری وجہ سے تو دوست دُشمن بن گئے ہیں۔"

اسد نے پوری قوت سے اس کو دھکا دیا۔ وہ پیچھے کھڑے اظہر اور دوسرے لڑکے پر گرا۔ یہ دیکھ کر زینب بھاگ کر کمرے سے نکلی اور پیچھے اسد بھی نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر کے لاک لگا کر چابی پکڑ کر زینب کو لئے گیٹ کی سمت بھاگا۔

جب وہ آیا تھا تو دروازہ کھولتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ چابی لاک کھول کر کی ہول میں ہی چھوڑی ہوئی تھی، گیٹ کے قریب پہنچ کر اسد نے گیٹ کی کھڑکی کھول کر زینب کو دیکھا۔ وہ بے حد خوفزدہ اور سہی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس کے چہرے اور آنکھوں میں اسد کے لئے جو نفرت تھی، وہ

صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''کیا تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں دھوکے سے یہاں لایا تھا......؟''

''اس میں شک کی گنجائش نہیں......!''

اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

''جانتی ہو میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ شدید محبت......! بلکہ عشق کرتا ہوں اور یہ ہوس سے بہت آگے کا مقام ہے۔''

اسد نے اس کو یقین دلانا چاہا۔

''مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ اگر وہ لڑکے نہ آ جاتے تو آپ کا اپنا پروگرام یہی تھا۔''

''تمہیں میری بات کا، میری محبت کا یقین نہیں......؟''

''فضول میں وقت ضائع نہ کریں۔ وہ درندے آجائیں گے۔''

زینب نے نفرت سے اسد کی بات کاٹی۔

''ٹھیک ہے......! اب تمہیں میری موت ہی میری بے گناہی اور محبت کا ثبوت دے گی۔ اب تم جاؤ......!''

اس نے گیٹ کی کھڑکی کھول کر کہا۔

''اکیلی...... کیسے......؟ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

زینب نے باہر پھیلی تاریکی دیکھ کر کہا۔

''اگر میں نے تمہیں ان درندوں سے بچا لیا ہے تو اب تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ جاؤ......! میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے تم خیریت سے اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔''

''آپ بھی آئیں، پلیز......! میں اکیلی نہیں جا پاؤں گی۔''

زینب نے اب کے منت کرنے والے انداز میں کہا۔

''اس کو زندہ چھوڑ کر تمہارے ساتھ چلا جاؤں جس نے تمہارا ہاتھ تھامنے کی گستاخی کی......؟ جب تک وہ ہاتھ کاٹ نہیں دوں گا، تب تک بے سکون رہوں گا اور وہ جس نے تمہارے لئے گرے ہوئے گندے الفاظ استعمال کیئے، جب تک وہ زبان کاٹ کر نہیں پھینک دوں گا، بے چین رہوں گا اور جس کی وجہ سے یہ صورتِ حال پیش آئی، اس کو چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زینی......! میں نہیں جا سکتا۔ تم جاؤ......! ہری اَپ......!''

مگر زینب نے پھر کہنا چاہا۔

''ضد نہ کرو...... پلیز......! چلی جاؤ......!''

اظہر کا یہ روم رہائشی حصے سے ذرا الگ تھلگ ہی تھا اور یہاں صرف اس کے دوستوں کو آنے کی اجازت تھی، کسی اور کو نہیں۔ روم میں ایک ہی دروازہ تھا البتہ دریچہ بہت بڑا تھا۔ بڑے بڑے شیشوں والا، مگر رات کے وقت تو کیا، دن میں بھی اظہر دریچے کو کم ہی کھولتا تھا کہ اس کی ہابی کی ایسی تھیں اکثر فرینڈز لڑکیاں لے کر آتے تھے۔ ڈور کی ہمیشہ ہول میں ہی لگی رہتی تھی اور اس کے ساتھ دریچے کی چابیاں بھی اسی کی رنگ میں تھیں۔ تیسرا لڑکا واش روم سے باہر آیا تو اسد اور لڑکی غائب تھے۔

وہ تینوں دوست اچانک آئے تھے اور انہوں نے اسد کے ساتھ روم میں داخل ہوتی زینب کو دیکھ لیا تھا۔

اظہر نے ان کے پوچھنے پر بتایا۔

’’وہ میرا ایک شریف دوست ہے جو مجھے بھی اپنی طرح شریف سمجھتا ہے۔‘‘

’’مگر نہ ہم شریف ہیں نہ تم......! چلو مل کر عیش کرتے ہیں۔‘‘

’’نہیں یار......! ہم یہاں لان میں بیٹھیں گے۔ وہ پہلی بار لڑکی لایا ہے۔‘‘

’’پہلی بار ہو یا دوسری بار......! یہاں جو بھی لڑکی آتی ہے، وہ سب کی ہوتی ہے۔‘‘

’’موقع ضائع کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔‘‘

اظہر کے دوست نے کہا اور جب باقی دوستوں نے بھی تائید کی تو وہ ان کے ساتھ روم میں آ گیا تھا۔ ان کا اپنا کام تو بنا نہیں تھا اور وہ اسد کی نظروں سے بھی گر گیا تھا اور اب دریچہ بھی بند تھا۔ آخر انہوں نے شیشہ توڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

مگر شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر اسد نے جلدی سے زینب کو کھڑکی سے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

’’سیدھی چلتی جانا اور کافی آگے جا کر رکشہ ٹیکسی جو بھی ملے، لینا۔ گھبرانا یا ڈرنا نہیں اور نہ ہی اب یہاں رُکنا۔ میں ان کو روک لوں گا۔ خدا حافظ......!‘‘

اس نے زینب کا ہاتھ نرمی سے دبا کر چھوڑ دیا اور کھڑکی بند کر کے ان کے آنے کا انتظار کئے بغیر وہ ان کی سمت آیا تھا۔

’’اے......! لڑکی کہاں ہے......؟‘‘

اس کو اکیلا دیکھ کر ان میں سے ایک غرایا۔ اسد پینٹ کی بیلٹ کھول کر پہلے ہی ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔

’’وہی بتانے آیا ہوں۔‘‘

اسد نے کہا پھر اظہر کو دیکھا۔

’’مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنے گھٹیا نکلو گے......؟‘‘

کہہ کر وہ ان پر ٹوٹ پڑا کہ بلیک بیلٹ تھا وہ جوڈو کراٹے کا۔

ٹیپو نے اسد سے کہا تو یہ تھا کہ وہ اس کو ایک گھنٹے بعد پک کر لے گا مگر دل میں اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اسد کو کھل کر حالِ دل سنانے کے لئے ٹائم دے گا کہ سب کو معلوم ہے مہندی کا ہنگامہ اکثر صبح فجر تک جاری رہتا ہے اور فجر ہونے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔

اسد کو اس کے دوست کے گھر چھوڑ کر وہ خود اپنے ایک دوست کے ہاں چلا آیا تھا اور دوسرا گھنٹہ پورا ہونے میں چند منٹ باقی تھے، جب وہ اسد کے غصے کا خیال کر کے اُٹھ آیا۔ ابھی وہ اظہر کی کوٹھی سے چند قدم دُور ہی تھا، جب اس نے دیکھا، کوٹھی کے باہر بہت زیادہ پولیس کے علاوہ ایمبولینس کھڑی تھیں۔ گاڑی کوٹھی سے ذرا فاصلے پر روک کر وہ پیدل پولیس کی جانب آیا اور اپنے کزن حماد کو دیکھا تو کچھ حوصلہ ہوا کہ وہ پولیس آفسر تھا۔

ٹیپو نے قریب آ کر پوچھا۔

’’کیا ہوا ہے یہاں حماد......؟‘‘

’’تم اس وقت یہاں کیسے......؟‘‘

حماد نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"آج عامر کی مہندی تھی، وہاں سے آ رہا ہوں۔ تم کیوں نہیں آئے......؟"

ٹیپو نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"بس......! کام تھا مجھے ایک اور، میں تمہیں خود فون کرنے والا تھا کہ وہ تمہارا دوست ہے ناں اسد......؟"

"ہاں ہاں......! کیا ہوا اسے......؟"

ٹیپو نے انجان بن کر پوچھا۔

"یہاں چار لڑکے قتل ہوگئے ہیں اور پانچواں جو شدید زخمی ہے وہ تمہارا دوست اسد ہے۔"

حماد نے جلدی جلدی بتایا۔

"کہاں ہے وہ......؟"

ٹیپو بے چینی سے اندر کی جانب لپکا۔

"اندر کہاں چلے......؟ اس کو سب سے پہلے ہسپتال بھیجا تھا۔"

حماد نے بتایا۔

"ہوا کیا......؟"

ٹیپو اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

"لگتا ہے چاروں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے۔ وہ چاروں ایک طرف اور تمہارا یہ دوست اکیلا ایک طرف......!"

"کسی لڑکی وغیرہ کا چکر......"

ٹیپو نے حماد کی بات کاٹ کر پوچھا تاکہ زینب کے بارے میں معلوم

ہو سکے۔ وہ کہاں اور کس حالت میں ہے......؟

"لڑکی ہوتی تو وہ بھی یہاں ہوتی۔ خیر......! جو بھی چکر ہے، سمجھ میں آ ہی جائے گا۔ ذرا تمہارا دوست اسد ہوش میں آ جائے......!"

حماد نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں فوراً ہسپتال جانا چاہتا ہوں۔"

ٹیپو نے کہا۔

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ تم میری گاڑی میں بیٹھو......! میں بات کر کے آتا ہوں۔"

گاڑی میرے پاس ہے۔"

پھر وہ دونوں آگے پیچھے ہسپتال آئے۔ پتا چلا اسد آپریشن تھیٹر میں ہے تو وہ ان چاروں کی لاشوں کی سمت آئے اور حماد نے بتایا۔

"ایک لاش کی زبان کٹی ہوئی تھی، ایک کا ہاتھ کٹا ہوا تھا اور باقی آخری لاشیں تو بے حد زخموں سے چور ہیں اور یہ بات طے ہے کہ ان سب کو تمہارے دوست نے مارا ہے۔ مگر وہ خود بھی شدید زخمی ہے۔ اس کا زندہ بچنا مشکل لگتا ہے۔"

حماد خاموش ہوا تو ٹیپو نے کہا۔

"میں اس کے گھر اطلاع کرتا ہوں۔"

اور فون کرنے چلا گیا۔ دل میں وہ زینب کا سوچ رہا تھا۔ حماد اس کا کزن تھا مگر تھا تو پولیس والا ہی۔ اس لئے ٹیپو نے اس کو زینب کا بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ٹیپو کو اس بات کا پکا یقین تھا کہ یہ جھگڑا زینب کی وجہ سے ہوا

ہوگا۔ یقیناً اسد کے دوست کی نیت زینب کو دیکھ کر خراب ہوگئی ہوگی۔

"اوفو......! اگر وہ ایسا بے اعتبار دوست تھا تو اسد زینب کو لے کر یہاں آیا ہی کیوں......؟ یا پھر باقی لڑکیوں کی وجہ سے بات بگڑی ہوگی......؟ جو بھی ہوا ہے صرف زینب ہی بتا سکتی ہے مگر وہ ہے کہاں......؟"

اس نے پریشانی سے سوچا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا ایسا ہوگا تو میں بھی اس کو تنہا نہیں چھوڑتا۔"

پھر اسد کے گھر فون کر کے وہ واپس حماد کے قریب بیٹھ گیا اور حماد نے بتایا۔

گھر والوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ گھر کے ایک حصے میں کیا ہو رہا ہے......؟ پڑوسیوں میں سے کسی نے پولیس کو فون پر اطلاع دی کہ وہ چاروں لان میں ہی لڑ رہے تھے۔

"تمہارا دوست اسد تو بے حد شریف لڑکا ہے۔ جبکہ اظہر کے بارے میں مشہور ہے، ضرورت سے زیادہ خراب لڑکا تھا۔"

"میں کبھی نہیں ملا اظہر سے......!"

ٹیپو نے جواب دیا اور پریشانی سے زینب کا سوچنے لگا۔



زینب کو کافی دیر چلنے کے بعد ایک ٹیکسی ملی تھی اور وہ گھر کا بتا کر اس میں بیٹھ گئی اور باحفاظت اپنے گھر پہنچ بھی گئی تھی۔ دروازہ اماں نے کھولا تھا۔ وہ ان کو سلام کر کے اپنے روم میں آئی۔ لباس بدل کر پہلے وضو کر کے شکرانے

کے عزت بچ جانے پر نفل ادا کئے پھر سو گئی۔

آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ اس نے اماں سے کہا۔

"مجھے کالج جانا تھا۔ آپ نے مجھے اُٹھایا کیوں نہیں......؟"

"رات دیر سے تو آئی تھی، میں نے سوچا چھٹی کرنی ہوگی......؟"

"افوہ اماں......! میرا ٹیسٹ تھا آج انگلش کا۔"

پھر وہ جلدی سے تیار ہو کر گھر سے نکل پڑی۔ دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر آج اسد ملا تو خیر نہیں......! پاؤں سے جوتی اُتار لوں گی اور ان کے گھر والوں سے بھی شکایت کروں گی۔ لیکن جب وہ اس کی کوٹھی کے قریب پہنچی تو اسد کے بجائے ٹیپو اپنے گھر کے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ زینب کو دیکھ کر ٹیپو رُک گیا۔ پھر قریب آنے پر زینب کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"پلیز......! بات سن لیں......!"

"میرا راستہ چھوڑ دیں ورنہ بری طرح پیش آؤں گی......!"

ٹیپو کو دیکھ کر زینب کو یاد آیا رات ٹیپو کتنی بدمعاشی سے مسکراتا ہوا اس کو اسد کے ساتھ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یعنی دونوں نے مل کر پروگرام بنایا تھا اس کو پھانسنے کا۔

"رات وہاں کیا ہوا تھا......؟"

ٹیپو نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے دوست نے نہیں بتایا......؟ یا اب کوئی اور چال چلنے کا پروگرام ہے......؟"

زینب نے زہر خند سے کہا اور نفرت سے ٹیپو کو گھورا۔

"میری بات سن لیں بہن......! اسد شدید زخمی حالت میں آپریشن تھیٹر میں بے ہوش پڑا ہے اور باقی چاروں لڑکے مر چکے ہیں۔ اس حالت میں کہ ایک کی زبان کٹی ہوئی تھی اور دوسرے کا ہاتھ۔ وہاں کیا ہوا ہے......؟ یہ بتانے کو شاید اسد بھی زندہ نہ رہے۔ میں نے ابھی پولیس کو آپ کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہاں کیا ہوا تھا......؟ تو مجبوراً مجھے پولیس کو بتانا ہوگا۔"

اب کے ٹیپو نے دھمکی دی اور زینب نے سب کچھ صاف صاف بتا کر کہا۔

"اب اگر آپ نے مجھے بہن کہا ہے تو میری عزت بھی رکھئے گا۔ آپ جانتے ہیں میں بے قصور ہوں۔ آپ لوگ دھوکے سے مجھے وہاں لے گئے تھے۔"

"آپ یہ بات نہ بھی کہتی تو اپنے دوست کی محبت اور عزت کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ اب آپ جائیں......!"

ٹیپو نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر خود بھی چلا گیا۔

جبکہ کالج کی جانب بڑھتے ہوئے زینب کی سماعتوں میں اسد کی باتوں کی بازگشت تھی۔

"اس کو زندہ چھوڑ کر تمہارے ساتھ چلا جاؤں جس نے تمہیں چھونے کی گستاخی کی......؟ جب تک وہ ہاتھ کاٹ نہیں دوں گا، بے سکون رہوں گا اور وہ جس نے تمہارے لئے گرے ہوئے الفاظ استعمال کئے، جب تک وہ زبان نہ کاٹ دوں گا، بے چین رہوں گا اور جس کی وجہ سے یہ سب ہوا اس کو زندہ چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

بمشکل وہ کالج تک آئی اور نہ جانے کیسے ٹیسٹ دیا......؟ اور کیسے باقی ٹائم گزارا......؟ وہ اسد کی زندگی کے لئے دُعائیں مانگتی رہی مگر شاید دیر ہو چکی تھی۔ اس کے اپنے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا۔

"وہ نہیں بچے گا......!"

چھٹی کے بعد جب وہ ہزاروں خدشات دل میں لئے سہیلیوں کے ساتھ کالج سے باہر آئی تو پہلا موڑ مڑتے ہی اس نے اپنے خدشات کو حقیقت کے روپ میں دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اسد کے گھر کے باہر ٹینٹ لگا کر راستہ بند کر دیا گیا تھا۔

"کیا اسد واقعی مر گیا......؟"

اس نے سوچا اور قریب آنے پر رونے کی آوازیں سنیں۔ پتا چلا وہ مر چکا تھا۔

"آؤ دیکھیں کیا ہوا ہے......؟"

زینب نے سہیلیوں سے کہا اور جواب سنے بغیر گھر میں داخل ہوگئیں۔ اندر کفن میں لپٹی میت چارپائی پر رکھی تھی اور میت کے قریب ٹیپو سوگوار کھڑا تھا۔ شاید اس کے انتظار میں زینب کو دیکھ کر اس نے اس کے منہ سے کفن ہٹا دیا۔

اب اسد کا بے جان چہرہ زینب کے سامنے تھا۔ چند پل وہ اس کو دیکھتی رہی پھر فرینڈز کے پکارنے پر وہ ان کے ساتھ چل دی۔ آنکھوں میں آنے والے آنسو اس نے کیسے ضبط کئے......؟ یہ وہ ہی جانتی تھی۔

سہیلیاں چھیڑتی رہیں۔

"بیچارہ تمہارا عاشق مر گیا......!"

مگر وہ چپ رہی اور پھر گھر پہنچ کر وہ چارپائی پر ایسی گری کہ کئی دن تک اُٹھ نہ سکی۔ سارا وقت سماعتوں میں اسد کی آواز گونجتی۔

"اب میری موت ہی تمہیں میری محبت اور بے گناہی کا ثبوت دے گی۔"

وہ زینب کو اپنی بے گناہی اور محبت کا ثبوت دے گیا تھا اور زینب کو محسوس ہوتا تھا، اس ثبوت کے سوا اب اس کی زندگی میں جیسے کچھ بھی نہ بچا تھا۔ وہ سارا وقت لیٹی، بیٹھی سوچوں میں گم خلاؤں میں گھورتی رہتی۔

اماں بار بار پوچھتیں۔

"یہ تمہیں ہوا کیا......؟"

مگر وہ چپ رہتی کہ جو ہوا تھا وہ بتانے والا کب تھا......؟ اماں کے سوالوں سے بچنے اور اماں کو پریشانی سے بچانے کے لئے اس نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ مگر مسکرانا تو کیا......؟ وہ تو بات کرنا بھول چکی تھی۔



کالج میں سالانہ کنونشن تھا۔ مہمانِ خصوصی صوبائی وزیر تعلیم تھے جن کے ساتھ ان کے ایک دوست بھی تھے۔ زینب نے کمپیئرنگ کرنے کے لئے معذرت کی تھی لیکن مس رابعہ مانی ہی نہیں تھیں۔

تاہم اس کی مدد کے لئے ایک اور لڑکی کو زینب کے ساتھ کر دیا تھا۔

پروگرام حسب معمول ہوتے رہے اور زینب کمپیئرنگ کرتی رہی۔ تقریب ختم

ہونے پر جب مہمان مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے، صوبائی وزیر تعلیم نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"کیوں بھئی تاڑو شاہ......! کتنی لڑکیاں تاڑ چکے......؟"

"کمپیئرنگ والی لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ زندگی میں پہلی بار......"

حسن شاہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو حیدر نے چونک کر اس کو دیکھا اور پوچھا۔

"مسئلہ حل ہو گیا......؟"

"ہاں......! پرنسپل سے کمپیئرنگ کرنے والی لڑکی کے گھر کا پتہ اور فون نمبر لینا مت بھولنا......!"

حسن شاہ نے کہا تو حیدر نے سر ہلا دیا جبکہ زینب تقریب ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے گھر چلی گئی تھی۔

دوسرے روز جب زینب کالج سے واپس گھر آئی تو اماں بے حد خوش تھیں۔ ان کو سلام کرتے ہوئے اپنے روم میں آئی تو اماں بھی اس کے ساتھ ہی روم میں آئیں اور کہا۔

"لباس بدل کر فوراً ڈرائنگ روم میں آجانا، تمہیں دیکھنے چند خواتین آئی ہیں۔"

"کیوں اماں......؟"

زینب نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"کیوں کا جواب بعد میں......! پہلے جو کہا ہے، وہ کرو......!"

امّاں نے کہا اور باہر چلی گئیں۔ زینب نے ڈریس چینج کیا اور ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں اماں کے علاوہ ایک اماں کی عمر کی عورت، ایک ذرا اماں سے ذرا کم عمر کی عورت اور ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی موجود تھی کہ زینب ان کو سلام کرکے ادب سے اماں کے پاس بیٹھ گئی تو لڑکی ان عورتوں کے پاس سے اُٹھ کر زینب کے پاس آئی اور اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پیار سے کہا۔

"میرے بھائی کا انتخاب تو لاجواب ہے......!"

زینب نے خالی ذہن سے اس کی بات سنی۔ مطلب کیا تھا......؟ وہ نہیں سمجھی کہ اسد کی موت کے بعد اس کا ذہن اسد میں لگا رہتا تھا۔ اماں نے اس کو یوں بے زار بیٹھے دیکھا تو کہا۔

"تم اب جاؤ......!"

اور زینب اپنے روم میں آگئی۔ چند منٹ بعد ہی اماں پھر زینب کے کمرے میں داخل ہوئیں اور ایک تصویر زینب کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کو جانتی ہو......؟"

زینب نے ایک نظر تصویر پر ڈالی۔ یہ ایک تیس سال کا نوجوان تھا، بے حد وجیہہ تصویر دیکھ کر زینب نے اماں کو دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔ بولنا تو جیسے وہ بھول ہی گئی تھی۔

"اس نے کل تمہیں کالج میں دیکھا تھا۔ آج اس کی پھوپھی، ماں اور بہن تمہیں دیکھنے آئی تھیں اور انہیں بھی تم بے حد پسند آئی ہو......!"

"کیوں اماں......؟"

زینب اب بھی خالی ذہن تھی، اس لئے پوچھا۔ اماں نے حیران ہو کر اس کو دیکھا اور کہا۔

"کیوں کا کیا مطلب......؟ یہ تمہیں ہوتا کیا جا رہا ہے......؟ جب کوئی لڑکا کسی لڑکی کو دیکھ کر اپنی ماں بہن کو بھیجتا ہے تو مطلب صاف یہی ہوتا ہے کہ وہ اس لڑکی سے شادی......"

"اماں......!"

زینب چیخ پڑی۔ مجھے شادی نہیں کرنی، کبھی بھی نہیں......!"

"یہ کیا بات کی تم نے......؟ اور کس لہجے میں کی ہے......؟"

اماں کے لہجے اور چہرے پر غصے کی بجائے حیرانی تھی۔ زینب نے خاموش رہنا اب زیادہ مناسب سمجھا اور اماں نے ہاتھ سے اس کا چہرہ اُوپر کرتے ہوئے بغور اس کو دیکھا اور پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے، تم نے کیا کہا ہے......؟"

"مجھے شادی نہیں کرنی......!"

اب کے زینب نے آہستگی سے کہا۔

"مگر کیوں نہیں کرنی......؟ وضاحت کرو......!"

اماں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"ویسے ہی...... میرا جی نہیں مانتا۔"

زینب اماں کو اسد کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اماں کے مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بڑی مامی اور ماموں اندر داخل ہوئے اور وقتی طور پر بات ختم ہوگی۔ اماں نے اس کو مامی، ماموں کے لئے چائے بنانے کہا

اور وہ اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔

ٹیپو نے اسد کی موت کے بعد اس کو بتایا تھا۔

''شادی والے گھر سب سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا تھا اور پھر اسد کو بھی بتایا تھا۔ تمہارے گریز کی وجہ سے اسد بے حد بے چین اور پریشان رہتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کو تم سے سچی محبت ہو گئی تھی اور وہ تم سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر تم نہ ملنے پر آمادہ تھی نہ بات سننا گوارہ کی تھی۔

تمہیں دیکھ کر میں نے سوچا، یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اس کو ضائع کرنا بے وقوفی ہوگی۔ جو کچھ بھی ہوا میری خواہش پر ہوا۔ میں تو اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس کو خوشی دینا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سب اس کی موت کا سبب بن جائے گا اور میں اپنے دوست کو ہمیشہ کے لئے کھو دوں گا۔''

اور خود زینب بھی سمجھتی تھی اسد کی موت کی ذمہ دار وہ خود ہے۔ اور اگر وہ اس کے لیٹر کا جواب دے دیتی یا مل کر بات سن لیتی تو یہ نہ ہوتا۔ اسد چاہتا تو اس کے ساتھ خود بھی بھاگ سکتا تھا مگر وہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرنا چاہتا تھا جن لوگوں نے زینب کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ محبت کرتا تھا زینب سے، اور اپنی محبت کی توہین کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔

''زینب......! چائے نہیں بنی ابھی......؟''

اماں کی آواز سن کر وہ چونکی۔ کیتلی میں رکھا پانی کب کا سوکھ چکا تھا......؟

اس نے دوبارہ پانی چولہے پر رکھا اور جلد سے چائے بنا کر ساتھ کیک اور بسکٹ رکھ کر ٹرے اُٹھائے اندر چلی آئی۔

رات کا کھانا کھا کر ماموں لوگ گئے تھے اور زینب ان کے جانے سے پہلے ہی سونے چلی گئی تھی۔ اماں کھانا پکا کر ابا اور بھائی کے ساتھ کہیں چلی گئیں تھیں۔ نہ انہوں نے بتایا نہ زینب نے پوچھا۔

رات واپسی پر تینوں بے حد خوش تھے۔ اماں لباس بدل کر اس کے روم میں آئیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھر کر کہا۔

''بے حد امیر لوگ ہیں، جدی پشتی دولت مند اور خاندانی رئیس۔ زینب......! تیری دُنیا بھی سنور گئی اور آخرت بھی۔ جو خواب میں نے دیکھا تھا، وہ پورا ہو گیا۔ تمہارے ابا نے ہاں کر دی ہے۔''

اماں نے بات ختم کر کے اس کا منہ چوما اور زینب نے آہستگی سے کہا۔

''اماں......! میں نے آپ سے کل بھی کہا تھا کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔''

''کیوں نہیں کرنی......؟ وجہ بتاؤ......!''

اماں نے پھر پوچھا۔

''وجہ کوئی نہیں......! بس میرا دل نہیں مانتا۔''

زینب اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکی۔

''ناشکری مت بنو......! کتنے اونچے لوگوں کا رشتہ آیا ہے تمہارے لئے۔''

پھر انہوں نے رازداری سے پوچھا۔

''کسی کو پسند کرتی ہو......؟''

"ایسی کوئی بات نہیں اماں......!"

زینب نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر آنسو بہہ نکلے۔ یہ دیکھ کر اماں نے کہا۔

"میں نے اپنے دُکھ درد کبھی تمہیں نہیں بتائے، نہ تمہارے باپ کی سختی تمہیں دکھائی نہ ہی گھر کی غربت کو تم تک پہنچنے دیا۔ ہر دُکھ پریشانی کو تم بہن بھائیوں سے دُور رکھا۔ ہمیشہ تمہاری ماں کی بجائے دوست بنی رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ......! کیا بات ہے......؟ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو میں انکار کر دوں گی۔ تب بے ساختہ اماں کے گلے لگ کر روتے ہوئے زینب نے ساری کہانی کہہ سنائی۔"

اماں نے حیرت سے یہ سب سنا پھر پوچھا۔

"تمہیں اسد سے محبت تھی......؟"

"اس کی زندگی میں نہیں اماں......! مگر اس کے مرنے کے بعد مجھے اس سے سچی محبت ہوگئی ہے۔ اس کی موت میری وجہ سے ہوئی۔ اب میں بھی ہر خوشی سے منہ موڑ لوں گی۔"

زینب خاموش ہوئی تو اماں چند لمحے اس کو دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"اگر وہ زندہ ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں تمہاری شادی اس کے ساتھ بغیر کسی اعتراض کے کرتی لیکن اب تمہاری ان باتوں کو بے وقوفی ہی سمجھا جاسکتا ہے۔"

"آپ اس کو جو سمجھیں، مگر مجھے شادی کے لئے مجبور نہ کریں......!"

"کیسی بدشگونی کی باتیں کرتی ہو......؟"

اماں نے کہا پھر اس کو سمجھانے لگیں۔

"دیکھو میں نے جو خواب اپنی اولاد کے بارے میں دیکھا تھا، یہ اس کا آغاز ہے۔ تمہارا انکار تمہارے ساتھ ساتھ باقی تمام بہن بھائیوں کا مستقبل بھی ویران کر دے گا۔ اپنا نہیں تو اپنے بہن بھائیوں کا ہی سوچو......! بڑے بہن بھائی تو ویسے بھی خاندان کے لئے قربانی دینا فرض سمجھتے ہیں۔ یوں بھی زندگی بہت طویل اور بے حد بے رحم ہوتی ہے۔ تنہا نہیں گزرتی اور نہ ہی دُنیا گزارنے دیتی ہے۔

دیکھو اگر اللہ نے اپنا فضل کیا ہے تو اس طرح مت کرو......! کہا ناں، تم بڑی ہو، اپنا نہیں تو چھوٹوں ہی کا سوچو......! ویسے بھی تمہارے ابا نے ہاں کہہ دی ہے۔ وہ بھی تمہارے انکار کو نہیں مانیں گے اور پھر کوئی معقول وجہ بھی تو ہو انکار کی......؟"

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے بتانے یا مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی......؟ جو آپ کے جی میں آتا ہے کریں......!"

اماں نے زینب کی اس بات کو غنیمت جانا اور مزید کچھ کہے بغیر خاموشی سے اُٹھ گئیں۔

اور پھر پوری دھوم دھام سے زینب کی شادی سیّد حسن شاہ سے ہوگئی اور شادی کی رات حسن شاہ نے پوری ایمانداری سے اس کو بتایا تھا۔

"اس کے حلقہ احباب میں مردوں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو بیگم حسن شاہ کہلانے کے لائق ہوتی لیکن جب تمہیں دیکھا تو لگا تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ جب تمہیں دیکھا

تھا تو اسی وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ مزید وقت ضائع کرنا بے وقوفی ہو گی، میں نے وہیں حیدر سے کہہ دیا کہ وہ آج ہی مجھے تمہارے گھر کا نمبر اور ایڈریس لے کر دے اور اس نے لے دیا۔"

بات ختم کر کے وہ مسکرایا تھا۔ زینب جواباً مسکرا نہ کی۔ یہ دیکھ کر حسن نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا۔

"زینی......! تم خوش ہو......؟"

زینب نے جواب دینے کی بجائے نگاہیں جھکا لیں اور یوں بات ختم ہوگئی۔ شادی کے بعد حسن ہنی مون کے لئے اس کو ملک سے باہر لے گیا۔ کتنے ملک گھومے پھرے، پھر زینب کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اماں نے اس کو شادی کے بعد بطورِ خاص کہا تھا۔

"اب یہ سوگ اور سنجیدگی چھوڑ دو......! ہنسا بولا کرو شوہر کے ساتھ......! حسن بھی کہہ رہا تھا کہ تم بہت چپ چپ سی رہتی ہو۔ گو کہ میں نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ تمہاری بچپن ہی سے یہی عادت ہے مگر پھر بھی خود کو بدلنے کی کوشش کرو......!"

زینب نے ماں کو جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شادی کر لی تھی، یہی بہت تھا۔ اگر بڑی بہن یا اولاد ہونے کے ناطے چھوٹوں کے لئے قربانی اس پر فرض تھی، تو وہ اس نے دے ڈالی تھی۔

حسن شاہ زینب کو پا کر بے حد خوش تھا۔ زینب کی سنجیدگی سے متاثر ہو کر سیّد حسن شاہ نے زینب سے شادی کی تھی۔ وہ اس کو دوسری لڑکیوں سے الگ اور منفرد لگی تھی۔ لیکن اب کبھی کبھی زینب کی یہ سوگوار قسم کی سنجیدگی چبھنے

لگتی تھی۔

مگر بہرحال وہ پھر بھی اس پر جان دیتا تھا کہ وائف ہونے کے ناطے وہ اس پر چیک نہیں رکھتی کہ وہ دیر سے کیوں آیا ہے......؟ وہ اس کے سامنے بھی پینے لگتا تو زینب نے کبھی ٹوکا نہیں تھا۔ وہ جو کہتا، جب کہتا، وہ ویسا ہی کرتی۔ ابھی تک اس نے حسن سے کوئی فرمائش تک نہ کی تھی مگر حسن نے اس کو کلب چلنے کا کہا تو زینب نے پہلی بار آہستگی سے کہا۔

"کلب لے جا کر آپ مجھے ہرٹ کریں گے۔ مجھے وہ ماحول پسند نہیں......!"

یہ بات زینب نے اس لئے کہی کہ شادی کے فوراً بعد حسن شاہ نے اپنے سب دوست احباب کو شادی کی خوشی میں کلب میں دعوت دی تھی۔ وہ تیار ہو کر حسن کے ساتھ کلب گئی مگر کلب کا ماحول اس کو پسند نہیں آیا تھا۔ حسن شاہ کی ایک دوست نے زینب سے کہا۔

"حسن آج بھی پرانی دوستوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ اب آپ اس کو کنٹرول کر لیں۔"

وہ چپ رہی تھی۔ حسن کے میل فی میل دوست اس کی موجودگی میں فری باتیں کرتے رہے۔ حسن بھی سن کر مسکراتا رہا، ڈانس ہوتا رہا۔ یہ تھی شادی کی دعوت، آنا مجبوری تھی مگر زینب نے سوچ لیا تھا، وہ دوبارہ یہاں نہیں آئے گی اور اب ملک واپسی پر حسن نے جانے کا کہا تو اس نے ہمت کر کے انکار کر دیا کہ اگر ایک دن ساتھ چلی گئی تو روز جانا ہوگا۔

ویسے بھی وہ اُمید سے تھی اور اس کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہ تھی۔ اس

کا انکار سن کر حسن شاہ چند پل بغور اس کو دیکھتا رہا پھر برہم اور تیز لہجے میں یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

''تم خود کو زندہ سمجھتی ہو......؟ ہونہہ......! تم زندہ ہی کب ہو جو مرنے کی نوبت آئے گی......؟''

وہ تو چلا گیا اور زینب کی سماعتوں میں انہیں الفاظ کی بازگشت تھی۔

''تم زندہ ہی کب ہو جو مرنے کی نوبت آئے گی......؟ تم زندہ ہی کب ہو......''

اور زینب کو حال میں پڑھی ہوئی سعد اللہ شاہ کی نظر یاد آگئی۔

''محبت بھی عجیب شے ہے
کہ جب بازی پہ آتی ہے
تو سب کچھ جیت لیتی ہے
تو سب کچھ ہار دیتی ہے
محبت مار دیتی ہے
محبت بھی عجیب شے ہے
کہ جب آئی پہ آجائے
تو سب کچھ چھین لیتی ہے
یا سب کچھ وار دیتی ہے
محبت مار دیتی ہے
محبت بھی عجیب شے ہے
کہ کاروبارِ ہستی میں

کبھی یہ پھول بنتی ہے
کبھی یہ خار دیتی ہے
محبت مار دیتی ہے......''

زینب کو بھی یہی لگتا تھا کہ وہ اسد کے ساتھ ہی مر گئی تھی۔ اب وہ ایک زندہ لاش تھی اور یہ زندگی مجبوری کی زندگی تھی جو اس نے ماں کی خواہش پر اختیار کی تھی۔ وہ بہت کوشش کرتی تھی مسکرانے کی مگر کامیاب نہیں ہو پاتی تھی۔ ماں نے کہا تھا۔

''تمہاری دُنیا بھی سنور گئی اور آخرت بھی۔ خاندانی سیّد ہیں۔''

مگر حسن کے گھر کا ماحول بے حد کھلا اور آزاد خیال تھا۔ حسن گھر کے اندر ہی پینے پلانے کا اسٹاک رکھتا تھا۔ ماں، بہن، بیو، پھپھو جو ساتھ ہی رہتی تھیں، سب کو معلوم تھا مگر کسی نے کبھی اس کو منع نہیں کیا تھا۔ بہن سلیوس بازو والی شرٹ بھائی کے سامنے پہن کر گھومتی تھی۔ کوئی شرم نہیں۔ میں نے گھر میں کسی کو بھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک بار یوں ہی اس نے اپنی نند سے کہہ دیا۔

''تم نماز نہیں پڑھتی......؟''

پاس بیٹھی ساس نے فوراً کہا۔

''ارے بہو......! ہم بخشے ہوئے لوگ ہیں۔ بڑی قربانیاں دی ہیں ہم نے کربلا میں۔''

اس نے پھر کبھی نہیں پوچھا۔

حسن شاہ ایک رنگین مزاج نوجوان تھا۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اسے

وائف ایسی ملی تھی جو اس کی عیاشی کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی آزاد زندگی گزار رہا تھا۔

زندگی یوں ہی گزرنے لگی۔ اس نے دو بچے پیدا کیے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ مگر وہ نہ بدلی۔ اماں کی خواہش البتہ پوری ہوگئی۔

زینب کے گھر ہونے والے فنکشن میں اماں بیٹیوں بیٹوں کو پوری تیاری کے ساتھ بھیجتی۔ زینب کے گھر ہی بہنوں کے رشتے بڑے بڑے گھروں میں طے ہوئے۔ شادیاں بھی ہوگئیں۔ بیٹے بھی بڑے خاندانوں میں بیاہے گئے۔ اماں بے حد خوش تھیں۔ ماں کو خوش دیکھ کر وہ مطمئن ہوگئی کہ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ ساس فوت ہوگئیں مگر ساس کی جگہ پھپھو ساس موجود تھیں۔ بچے آیا اماں نے پالے تھے۔

بچے بڑے ہوگئے۔ بیٹا اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جا چکا تھا جبکہ بیٹی یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔

بہت سارا ٹائم گزر گیا تھا مگر اسد کی یاد آج بھی اس کے دل میں تازہ تھی۔ وہ اس کو کبھی نہیں بھولی تھی جو اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے جان دے گیا تھا۔

حسن کے ساتھ اس کا جسم رہا، روح نہیں۔ اس نے خود سے کبھی حسن سے کچھ نہ کہا تھا۔ مگر حسن کی کسی بات سے انکار بھی نہیں کیا تھا۔ اس لئے زندگی آرام سے گزر گئی تھی۔ بچے بھی اس کے مزاج کو سمجھ گئے تھے۔ اس لئے اپنے مسئلے ماں سے کہنے کی بجائے باپ سے کہتے تھے۔

مگر رات اچانک کیا ہوا تھا......؟ سب معمول کے مطابق کھانا کھا رہے تھے۔ سب تھے ہی کتنے......؟ وہ خود، حسن اور بیٹی زری۔

پھپھو ناشتہ اور کھانا اپنے روم میں ہی کھاتی تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے حسن شاہ نے کہا۔

”زینب......! سہ پہر اسلام آباد سے زری کو دیکھنے لوگ آ رہے ہیں۔ سہ پہر کی چائے اور رات کا کھانا وہ یہیں کھائیں گے۔ انتظام کر لینا......!“

زینب نے اثبات میں سر ہلا دیا گویا اقرار تھا کہ وہ انتظام کرے گی مگر اس نے دوسری ماؤں کی طرح یہ نہیں پوچھا۔

”کون لوگ ہیں......؟“

وہ تو خاموش رہی مگر منہ میں نوالہ رکھتی ہوئی زری نے باپ سے پوچھا۔

”وہ لوگ کون ہیں......؟ اور مجھے کیوں دیکھنے آ رہے ہیں......؟“

حالانکہ باپ کی بات کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

”فارن منسٹر اشرف کے بیٹے ظفر نے تمہیں تقریب میں چند ہفتے پہلے دیکھا تھا۔ تم اسے بے حد پسند آئی ہو۔ میری اشرف سے بات چیت تو تھی کہ کلب میں اکثر ملاقات ہو جاتی تھی، جب وہ لاہور میں تھا، مگر دوستی نہیں۔ اس نے ایک ہفتہ پہلے فون کیا اور پوری تفصیل سے بات کی۔

لڑکا میرا دیکھا ہوا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا......؟ میں نے ہاں کہہ دی ہے۔ اب کل وہ پوری فیملی تمہیں دیکھنے آ رہی ہے۔ لڑکا بھی ساتھ ہوگا

اور پرسوں ہم لوگ لڑکا دیکھنے چلیں گے۔"

حسن شاہ نے پوری بات بیٹی کو بتا دی۔ ان کے خیال میں یہ بہت اچھا رشتہ تھا اور زری بہت خوش ہوگی سب سن کر۔ مگر زری کا ردِعمل ان کے لئے حیران کن تھا۔ اس نے نوالہ نگل کر ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"پاپا جان......! بات اگر میری ذات سے تعلق رکھتی تھی تو آپ کو مجھ سے پوچھ کر ہاں کرنی چاہئے تھی۔ مجھ سے پوچھ کر ان کو آنے کی اجازت دینی چاہئے تھی۔ بہرحال اب بھی ان کو منع کر دیں۔ وہ ہمارے یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔"

"کیوں روک دوں آنے سے ان لوگوں کو......؟ وجہ بتاؤ......!"

حسن نے پوچھا۔

"وجہ تو صاف ہے۔ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں......!"

زری نے بغیر کسی شرم وخوف کے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو......؟ اتنے اچھے رشتے سے انکار......؟ اصل ریزن بتاؤ......!"

اب کے حسن نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

"اصل وجہ یہ ہے کہ میں اپنے کلاس فیلو سلیم کو پسند کرتی ہوں اور شادی بھی سلیم ہی سے کروں گی۔"

زری نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس خاندان سے ہے......؟ والد کیا کرتا ہے......؟"

حسن شاہ نے پوچھا۔

"شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ والد سرکاری ملازم ہے۔"

بیٹی کی بات سن کر حسن شاہ نے خشک لہجے میں کہا۔

"میری طرف سے صاف انکار سمجھو......! تمہاری شادی اشرف کے بیٹے ہی سے ہوگی۔"

"میری طرف سے بھی صاف انکار سمجھیں......! بہتر ہے آپ ان لوگوں کو آنے سے روک دیں ورنہ میں ان کے منہ پر انکار کر دوں گی۔"

زری نے باپ سے بھی زیادہ خشک لہجے میں کہا۔

"تم ایسا نہیں کرو گی......! اگر تم نے ایسا کیا تو یاد رکھو......! میں تمہیں شوٹ کر دوں گا یا خود کو۔"

حسن شاہ نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا مگر زری پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی بلیک میلنگ میں آنے والی نہیں ہوں۔ آپ مجھے شوٹ کریں یا خود کو......! یہ فیصلہ آپ ہی بہتر کر سکتے ہیں مگر مجھے اشرف کے بیٹے سے شادی نہیں کرنی۔"

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں کرو گی......؟"

حسن شاہ غصے سے اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے تو زری نے خاموش تماشائی کی حیثیت سے بیٹھی ماں سے کہا۔

"اپنے حقوق کے لئے تو آپ نہیں بولیں، مگر اولاد کے حقوق کا تو خیال کریں......! مجھے سلیم سے محبت ہے اس کے علاوہ کسی سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

زینب خاموشی سے اس کو دیکھتی رہی کچھ نہیں بولی۔ زری غصے سے بولتی ہوئی چلی گئی تو زینب بھی اُٹھ کر اپنے روم میں آئی۔ حسن مارے غصے کے روم میں ٹہل رہے تھے۔ زینب کو دیکھ کر بولے۔

''محبت......؟ محبت......؟ سب بکواس ہے......! تمہارے خیال میں میں نے جو یہ سب کیا ہے، غلط کیا ہے......؟ لائف میں سب سے اہم پیسہ ہے پیسے کے بغیر نہ عزت ملتی ہے نہ شہرت اور عزت، دولت، شہرت خاندانی لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ غریب لوگ ان تینوں چیزوں سے محروم ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کس فقیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ محبت......؟ پیٹ محبت سے نہیں بھرتا۔''

''آپ نے ٹھیک کیا مگر بچی سے پوچھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کرتے تو......!''

وہ اُدھوری بات کہہ کر لیٹ گئی اور دل میں سوچا۔

''زری کو میری کیا ضرورت......؟ وہ خود اپنا حق لینے کی طاقت رکھتی ہے۔''

حسن اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور کہا۔

'تم ماں ہو......! سمجھانا اس کو کہ پیسے کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ کیا کمائے گا وہ فقیر خاندان کا لڑکا......؟ کتنا بھی پڑھ لے...... جبکہ یہ ظفر اشرف آنے والے انتخاب میں سں کو بھی کھڑا کر رہا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ایک بڑا مشہور سیاسی خاندان ہے۔''

حسن نے بات ختم کی تو زینب نے کروٹ بدل لی۔ دونوں سونے کی

کوشش کرنے لگے اور پھر شاید حسن بھی سو گئے۔ مگر زینب کو نیند بہت دیر بعد آئی بھی تو بے چین کرنے والی۔ پھر خواب میں اس نے اسد کو دیکھا تھا۔

وہ لان میں بیٹھی تھی۔ وہ چند قدم دُور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور چپ چاپ اس کو دیکھتا رہا۔ زینب ہی بے تاب ہو کر اُٹھ کر اس کی سمت بڑھی۔ پھر نہ جانے کیسے گر پڑی اور آنکھ کھل گئی۔ فضاء میں مؤذن کی آواز گونجی تھی۔

آج پچیس سال بعد اس کو دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

''وہ کیوں آیا تھا......؟''

یہی سوچتے ہوئے اس نے بستر چھوڑ دیا۔ نماز پڑھ کر وہ ناشتے کی ٹیبل پر بے مقصد ہی بیٹھ کر اسد کے بارے میں سوچنے لگی۔ نہ جانے کتنا ٹائم گزرا تھا کہ ملازمہ اخبار ان کے سامنے رکھ گئی تو وہ اسد کو سوچتے ہوئے ہی یوں ہی اخبار دیکھنے لگی اور پھر ایک خبر پر ہیڈ لائن نے زینب کو چونکا دیا۔

''چار افراد نے شادی کی خواہش مند طالبہ کو بے آبرو کر دیا۔''

زینب سری خبر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

''حجرہ شاہ مقیم میں لو میرج کی خواہش مند کمپیوٹر کی طالبہ سے چار افراد کا گینگ ریپ......! تفصیلات کے مطابق تھانہ چوچک کی رہائشی طاہرہ ثمر کمپیوٹر کالج اوکاڑہ میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ گزشتہ دنوں اس کے اوکاڑہ کے رہائشی نوجوان لطیف سے دوستی ہوئی اور انہوں نے شادی کا ارادہ کیا۔ ایک یوم قبل دونوں حجرہ شاہ مقیم کے

نواحی گاؤں میں کسی شخص سے رقم لینے گئے جو نہ مل سکی تو واپس حجرہ شاہ مقیم آگئے اور ایک واقف کار عمران نامی نوجوان کے ہمراہ رات ٹھہرنے کے لئے ایک مکان واقع نئی آبادی حجرہ میں چلے گئے۔ جہاں عمران، لطیف، انور اور ایک نامعلوم شخص نے مل کر طاہرہ ثمر کو بے آبرو کر دیا۔ اسی دوران اہل محلّہ نے چیخ و پکار کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع دی جس پر پولیس نے چھاپہ مار کر لطیف اور انور کو موقع پر گرفتار کر لیا جبکہ دو افراد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس نے اسلامک لاء کے تحت مقدمہ درج کر لیا ہے۔"

پوری خبر پڑھ کر بھی زینب کی نظریں خبر پر جمی تھیں اور ذہن میں اسد سے، آخری ملاقات کا منظر۔

معاً زری غصے سے بولتی ہوئی ڈائنگ ہال میں داخل ہوئی۔

"ممی......! پاپا کو سمجھا لیں مجھ بغاوت کرنے پر مجبور نہ کریں۔ لڑکے والوں کو فون کر کے منع کر دیں۔ یہاں نہ آئیں ورنہ میں ابھی یہ گھر چھوڑ کر نہ صرف چلی جاؤں گی بلکہ آج ہی سلیم سے لو میرج کر لوں گی۔ سنا آپ نے......؟"

اس نے پیر پٹخ کر بات ختم کی تو زینب نے غیر حاضر دماغی سے ایک لمحہ کو بیٹی کو دیکھا اور نظریں پھر اسی خبر پر جما دیں اور دل میں سوچا۔

اسد بھی اظہر پر اعتبار کر کے اس کو لے کر اس کے گھر گیا تھا مگر ہوا کیا......؟ اگر اسد ہوش سے کام لے کر اس کو بھاگنے کا موقع نہ دیتا تو اس کا

حشر بھی جیسا ہوتا اور تو اور وہ خود بھی اسد کو ہی مجرم سمجھتی کہ وہ اس کو پلان بنا کر لایا تھا کہ بچ کر گھر آنے کے باوجود وہ اسد کو مجرم ہی سمجھتی رہی تھی۔ اسد زندہ رہتا تو وہ کبھی اس کو بے گناہ نہ مانتی مگر اسد نے اپنی جان دے کر یقین دلا دیا تھا کہ وہ بے گناہ تھا اور زینب سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

زری نے ماں کی غیر حاضر دماغی کو محسوس کیا اور پھر خود بھی اس خبر پر نظر ڈالی جہاں ماں کی نظریں جمی تھیں۔ پھر پوری خبر پڑھ کر اس نے ماں کو دیکھا اور سوچا۔

"اوہ......! تو یہ بات ہے......!"

"ممی......!"

اس نے ماں کو کاندھوں سے تھام کر اونچی اور تیز آواز میں کہا۔

"سلیم ایسا نہیں ہے ممی......! وہ غریب ضرور ہے مگر مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ ممی......! پلیز میری بات کا یقین کریں۔ میری عزت کے لئے وہ خود کو موت کے حوالے کر سکتا ہے۔"

مگر زینب وہاں تھی ہی کب......؟ کھلی آنکھوں سے سامنے اسد تھا اور سماعتوں میں اس کی آواز۔

جب گیٹ کی کھڑکی کھول کر اس نے سہمی ہوئی زینب کو دیکھا پھر پوچھا۔

"کیا تم اب بھی یہی سمجھتی ہو کہ میں تمہیں دھوکے سے یہاں لایا ہوں......؟"

اور اس کا کورا جواب سن کر اس نے کہا تھا۔

"اب میری موت ہی تمہیں میری محبت اور بے گناہی کا ثبوت دے گی۔"

اور وہ اپنی جان دے کر اس کو اپنی محبت اور بے گناہی کا ثبوت دے گیا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو زینب کے ساتھ بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا تھا۔ مگر وہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرنا چاہتا تھا جنہوں نے زینب سے بدتمیزی کی تھی اور ان کو سزا دیتے ہوئے وہ خود بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

زینب نے بہت ضبط کرنا چاہا مگر وہ سب کچھ یاد آتے ہی آنسو بہہ نکلے اور وہ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے......! ارے......! ممی......! پلیز ممی......! یہ آپ کو کیا ہوا......؟"

زری نے ماں کو پہلی بار روتے دیکھا تو گھبرا گئی مگر زینب نے جیسے سنا ہی نہیں اور زری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کرے تو کیا......؟

جب سے ہوش سنبھالا تھا، تب سے ماں کو خود میں ہی گم سم دیکھا تھا۔ ان دونوں بہن بھائی کی پرورش آیا اماں نے کی تھی۔ ماں اپنے بچوں کو جس طرح پیار کرتی ہے، ویسے کبھی ماں نے پیار نہیں کیا تھا۔ وہ خود ہی ماں کے قریب آ کر گلے میں بانہیں ڈال دیتے تو ماں ان کو چوم کر تھوڑی دیر پیار کر لیتی۔ خود سے کبھی ماں نے ان کو نہیں بلایا تھا نہ ہی ماؤں والی کوئی روک ٹوک تھی، نہ سرزنش۔

ہاں ایک بار وہ کالج کے مینا بازار جانے کے لئے تیار ہو کر ممی کے پاس آئی تو ممی نے ایک نظر اس کو دیکھا۔ وہ اس وقت جینز پر بغیر بازو کا بلاؤز

پہن کر آئی تھی۔ انہوں نے پہلی بار اس کو قریب بلایا اور محبت سے سمجھایا۔

"شرٹ بدل کر جانا، مجھے بھی یہ پسند نہیں......!"

اس کو ممی کی بات سن کر خوشی ہوئی تھی اور فیل ہوا تھا ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔ کتنی ہی گم سم کیوں نہ ہو......؟ مگر اس نے ماں کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ خود سے کسی سے بات کرتے ہوئے بھی کم ہی دیکھا۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اس نے ماں کو کبھی روتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جو آیا تو یہی کہ جیسے ماں اس کے سیلولیس بلاؤز پہننے پر خفا ہوئی تھیں۔ ویسے یہی اس کی لو میرج پر خفا ہو کر روئیں ہیں، یہ بہت مشکل وقت تھا۔ اس نے فوراً کچھ سوچا، فیصلہ کیا، پھر ماں کو بانہوں میں لیتے ہوئے خود بھی رو پڑی اور کہا۔

"ممی......! اگر آپ میرے لو میرج کرنے پر خفا ہو کر رو رہی ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں وہاں پر ہی شادی کر لوں گی جہاں پاپا کہہ رہے ہیں۔ مگر پلیز......! آپ روئیں تو نہیں......!"

مگر زینب اس کی کب سن رہی تھی......؟ وہ تو صرف اسد کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اب اس کا پچیس سال خواب میں ملنا سمجھ میں آیا تھا۔ وہ گویا اس کو یہ کہنے آیا تھا۔

"خاموش رہ کر ایک اور اسد کو موت کے حوالے مت کرو......! میری موت بھی محبت پر اعتبار کرنا نہیں سکھا سکی تمہیں......؟"

اور پختہ محبت پر اعتبار اسد کی موت کے بعد ہی سہی، مگر آیا تو تھا کہ وہ جان ہار کر بھی بازی جیت گیا تھا اور وہ زندہ رہ کر بھی بازی ہار گئی تھی۔

مگر وہ زندہ کب تھی......؟ ماں کی خواہش اور بہن بھائیوں کے اچھے مستقبل کے لئے اس نے حسن شاہ سے شادی کر لی تھی مگر یہ زندگی اس نے زندہ لوگوں کی طرح تو بسر نہیں کی تھی۔

''کیا ہوا......؟''

حسن شاہ ناشتے کے لئے آئے تھے۔ اس کو روتے دیکھ کر پریشان ہوگئے اور سیدھے اس کی طرف آئے۔

''معلوم نہیں پاپا جان......! کچھ بتاتی بھی نہیں، بس روتی جاتی ہیں۔''

زری خود بھی بتاتے ہوئے رو رہی تھی۔ حسن نے بیٹی کو جواب دیئے بغیر زینب کو سہارا دے کر اُٹھایا اور اپنے روم میں لے گئے۔

زری ان کے پیچھے پیچھے آئی تو انہوں نے بیڈ پر زینب کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

''پہلے جا کر اپنی ممی کے لئے جوس لے کر آؤ......!''

زری چلی گئی تو حسن نے زینب کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا زینب......؟''

اور زینب نے جواب دینے کی بجائے حسن شاہ کا ہاتھ تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ میری ایک بات مانیں گے......؟''

حسن نے چونک کر اس کو دیکھا اور چند پل دیکھتا ہی رہا۔ وہ اس کی

تھی نہ مطالبہ، نہ جھگڑا۔ حسن شاہ کے دوست جب بیویوں کے سخت روّیے کی شکایت کرتے تو وہ زینب کا سوچتے۔ جھگڑا کرنا تو دُور کی بات، دیر سویر سے آنے پر اس نے کبھی اعتراض، شکایت بھی نہ کی تھی۔

ان کو زینب کی سنجیدگی نے متاثر کیا تھا۔ مگر اب کبھی کبھی وہ اُکتا جاتے کہ وہ کبھی مسکرائی بھی نہ تھی اور شادی کے بعد آج اس وقت پہلی بار وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہہ رہی تھی۔

''آپ میری ایک بات مانیں گے......؟''

انہوں نے محبت پاش نظروں سے زینب کو دیکھا پھر کہا۔

''ایک نہیں......! ایک ہزار کہو......! تمہیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں میری پیاری وائف......!''

''اگر یہ بات ہے تو پھر زری کی شادی سلیم سے کر دیں۔ پلیز......! پلیز......!''

زینب نے کہا تو حسن شاہ چند ساعتیں اس کو دیکھتے رہے پھر سائیڈ ٹیبل سے موبائل اُٹھایا اور اشرف صاحب کا نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر ہائے ہیلو کے بعد معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''اشرف صاحب......! آپ شوق سے آج ہمارے گھر تشریف لائیں مگر رشتے والی بات مکمل طور پر ختم سمجھیں۔ میری وائف اپنی مرضی سے بیٹی کا رشتہ طے کر چکی ہیں۔''

اُدھر سے اشرف صاحب نے کیا کہا......؟ یہ زینب نہ سن سکی۔ موبائل آف کر کے حسن شاہ نے کہا۔

"بس......! اتنی سی بات کے لئے یہ آنسو......؟ تم کہہ کر تو دیکھو۔ جان بھی میری جان......! تمہارے لئے حاضر ہے۔"

زری جوس لے کر آئی تو مما پاپا سے سلیم سے اس کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔ وہ دروازے پر ہی رُک گئی اور اب جب پاپا اشرف صاحب کو شادی کے لئے انکار کا فون کر چکے تو وہ مارے خوشی کے ماں کی سمت بڑھی تو زینب نے چونک کر اس کو دیکھا جبکہ حسن شاہ نے ہاتھ بڑھا کر جوس کا گلاس اس کے ہاتھ سے تھام لیا۔

خود اپنے ہاتھوں سے پلانا چاہتے تھے مگر جب گلاس زینب کے منہ کے قریب لائے تو زینب نے جوس کا گلاس ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے زری کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

زری جلدی سے ان کے قریب آئی اور سینے پر سر رکھ کر سکون سے آنکھیں بند کر لیں اور زینب نے اس کے کھلے شولڈر کٹ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے زیرلب کہا۔

"میں سلیم کو دوسرا اسد نہیں بننے دوں گی نہ اپنی بیٹی کو دوسری زینب بننے دوں گی کہ محبت مار دیتی ہے۔"

ان کی بات سن کر زری ایک منٹ میں ساری کہانی سمجھ گئی۔ اب پتا چلا تھا کہ ماں عمر بھر مسکرائی کیوں نہیں تھی......؟ معاً وہ پاپا کی آواز سن کر چونکی۔

"زری......! سلیم کو فون کرو......! میں آج ہی اس کو ملنا چاہتا ہوں۔"

"آئی ایم سوری پاپا جان......! میں اپنی بدتمیزی کی آپ سے......"

زری نے کہنا چاہا مگر حسن شاہ نے اس کو روک دیا۔

"کوئی سوری نہیں......! تمہاری اس وقت کی بغاوت نے تو بتایا ہے کہ میری وائف زندہ ہے۔ میں اکیلا نہیں کہ اپنی مرضی سے فیصلہ کرتا۔"

انہوں نے مسکرا کر زینب کو دیکھا تو زینب نے نظر جھکا لی اور دل میں سوچا۔

"شاید میں نے اسد کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا کفارہ ادا کر دیا ہے......!"



بدنام

"کہا ناں میں کھانا نہیں کھاؤں گی......! نہیں کھاؤں گی......!"

شہناز نے روٹی والی چنگیر پٹختے ہوئے کہا۔

"نہیں کھاتی تو نہ کھا......!"

ماں کی کرخت آواز سنائی دی۔ شہناز نفرت سے ناک سکیڑ کر فرش پر لیٹ گئی۔

"چاہے دس دن روٹی نہیں کھاؤ......! مگر اسکول میں داخلہ لے کر ہرگز نہیں دوں گی۔ نواب کی بیٹی ہے ناں......! جو آگے پڑھے گی......؟"

ماں کی آواز میں زہر گھلا ہوا تھا۔ غصہ تو شہناز کو بھی تھا مگر وہ کچھ کہنے کی بجائے چپ رہی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کچھ کہا تو ماں کی زبان کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی چلے گا۔

رات کو ابا کام سے آئے تو اس نے ان کو بتایا۔

"ابا......! باجی شہناز نے روٹی نہیں کھائی۔"

"کیوں بیٹا......؟ بیٹا......! کیا بات ہے......؟"

ابا نے شفقت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ابا......! میں آگے پڑھوں گی۔"

شہناز روتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا......! ہم تمہیں آگے داخلہ لے دیں گے۔"

"اے جی......! تم کہاں سے داخلہ لے کر دو گے......؟"

شہناز کی ماں چولہے کے پاس سے اُٹھ آئی۔

"بہت پڑھ لیا، اب گھر کا چولہا چکی سنبھالے۔ اسے کون سا نوکری کرنا ہے......؟"

"تم چپ رہو......! آج کے دور میں اچھے رشتے کے لئے لڑکی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔"

"رہنے دو اپنی یہ سیاست......! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ......؟ اپنی اوقات دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ دوسروں کی نقل کرنے کا فائدہ......؟"

"تم گھبراؤ نہیں شہناز......! میں تمہیں داخلہ دلاؤں گا۔"

وہ بیوی کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے۔

"ابا......! تم نے اگر اسے آگے داخلہ دلایا تو میں آگے نہیں پڑھوں گا۔"

شہناز کے بھائی شہباز نے دھمکی دی جو اس وقت میٹرک میں تھا۔

"تمہیں بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں......!"

شہناز بھائی کو کاٹنے کو دوڑی۔

"دیکھ......! دیکھ بے شرم......! بھائی کے ساتھ زبان درازی کر رہی ہے......؟"

ماں گرجی۔

"تو وہ کیوں میرے راستے کا روڑا بن رہا ہے......؟ میں آگے پڑھوں گی اور ضرور پڑھوں گی۔"

"میں دیکھوں گی تو آگے کیسے پڑھے گی......؟"

شہناز کی ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ شہناز کے باپ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کھانا کھانے لگا۔ شہناز نے ابھی حال ہی میں مڈل پاس کیا تھا۔ اس کا ارادہ آگے پڑھنے کا تھا جبکہ ماں اسے آگے پڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

شہناز کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جہاں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا پسند نہیں کرتے۔ اس کی پھوپھو اور چچا نے تو پانچ پانچ جماعتیں پڑھا کر لڑکیاں اسکولوں سے اُٹھالی تھیں۔ یہ شہناز کی ہمت تھی۔ وہ مڈل تک آگئی تھی اور اب مزید پڑھنا چاہتی تھی۔

اگلے روز جب شہناز کا باپ واپس آیا تو داخلے کا انتظام کر چکا تھا۔ شہناز کی ماں نے بہت اُدھم مچایا مگر شہناز کا اسکول جانا نہ چھوٹ سکا۔ البتہ جب پہلے دن وہ اسکول جانے لگی تو باپ نے کہا۔

"شہناز......! میں نے سب سے جھگڑا کر کے تمہیں اسکول میں داخلہ لے کر دیا ہے۔ تم میری عزت رکھنا۔ کسی کو اچھا پہنتے دیکھ کر اچھے کی تمنا نہ کرنا کیونکہ تمہارا باپ تمہیں اچھا پہننے کو نہ دے سکے گا اور تمہاری تمنا تمہیں

غلط راستے کی طرف لے جائے گی۔ تمہارا مقصد صرف علم حاصل کرنا ہے سو وہ کرتی رہنا۔"

شہناز نے باپ کے کہے کا بھرم رکھا۔ سادگی اپنائی، وہ باپ کو ماں کی طرف سے شکایت کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ بھائی ہمیشہ شہناز سے پہلے اسکول جاتا کبھی ساتھ جانا اس نے پسند نہ کیا تھا۔

اچھے خاصے دن گزر رہے تھے کہ اچانک ایک حادثہ ہوا۔ جیسے ہی وہ اسکول سے نکل کر سڑک پر آتی ایک لڑکا اس کے تعاقب میں لگ جاتا۔ دو تین دن تو شہناز نے زیادہ توجہ نہ دی مگر آخر کب تک......؟

خیریت یہ تھی، وہ کچھ کہنے کی بجائے صرف مسکرا کر شہناز کو دیکھتا اور شہناز کو گھبراہٹ سی ہونے لگتی۔ ایسے میں وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی۔ جی چاہتا وہ اُڑ کر گھر کی چار دیواری میں پہنچ جائے جو کچی ہونے کے باوجود اس کی پکی پناہ گاہ تھی۔

"گھر بھی کتنی محفوظ جگہ ہوتی ہے۔"

وہ سوچتی۔

"گھر کا احساس ہوتے ہی ایک تحفظ کا یقین ہوتا ہے۔"

وہ لڑکا مسلسل اس کے تعاقب میں تھا بلکہ اب تو وہ قریب سے گزرتے ہوئے ہنس کر ایک آدھ جملہ بھی کستا۔ یہ اور بات تھی، گھبراہٹ میں شہناز کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا۔ شہباز چپ چاپ اس اذیت کو برداشت کر رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی اگر گھر میں اس واقعہ کا ذکر کیا تو ماں اسے بہانہ بنا کر فوراً اسکول سے اُٹھا لے گی۔ اسی لئے وہ چپ تھی۔

کچھ دنوں سے وہ لڑکا شہناز سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ شہناز نے اس لئے محسوس کیا کہ پہلے وہ شہناز کو گلی میں داخل ہوتے ہی واپسی کے لئے مُڑ جاتا مگر اب جیسے ہی شہناز گلی میں داخل ہوتی، وہ بھی داخل ہو جاتا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ گلی بالکل سنسان ہوتی۔ شہناز گلی میں داخل ہوتے ہی ریس کے گھوڑے کی طرح بھاگ کھڑی ہوتی اور گلی پار کر جاتی۔ ایسے میں تعاقب کرنے والے کا قہقہہ اسے دُور تک سنائی دیتا۔ اپنے دروازے کے باہر رُک کر وہ اپنی سانس ہموار کرتی اور پھر سیدھی اسے چھوٹے سے کمرے میں گھس جاتی جو اسے اور اس کے تین چھوٹے بہن بھائیوں کو دے رکھا تھا۔

آج بھی وہ شہناز کے ساتھ ہی گلی میں داخل ہوا۔ قبل اس کے کہ شہناز بھاگتی، وہ خود بھاگ کر شہناز کے بالکل سامنے آ گیا۔ شہناز نے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بھیگی آواز میں بولی۔

"خدا کے لئے میرا راستہ چھوڑ دو......! اگر کوئی گلی میں آ گیا تو تم نہیں جانتے، میری بدنامی ہو جائے گی۔"

"تم آخر مجھ سے بھاگی بھاگی کیوں رہتی ہو......؟"

اجنبی بھدّے انداز میں مسکرایا۔

"میں شاید تمہیں پسند کرنے لگا ہوں......!"

اس نے چبا چبا کر الفاظ کہے۔

"مگر تم آخر میری طرف دیکھتی کیوں نہیں......؟ تم ڈرتی کیوں ہو مجھ سے......؟ بات کیوں نہیں کرتی......؟"

دہشت سے شہناز کا رنگ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

"یا اللہ......! تو ہی میری مدد کر......!"

اس نے گڑگڑا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"میں تم سے بات کرتا ہوں کتے......!"

شہناز کے کانوں سے آواز ٹکرائی، آواز کے ساتھ ہی شہناز نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ بھلا یہ کون ہو سکتا ہے......؟ آواز تو اجنبی تھی مگر جب شہناز نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو چہرہ مانوس تھا۔ اس کے سامنے محلے بھر کا بدنام لڑکا ظفر کھڑا تھا۔

"شہناز......! تم ایک طرف ہٹ جاؤ......!"

اس نے خونخوار نظروں سے تعاقب میں آنے والے لڑکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شہناز دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

"ہاں بھئی......! تم بتاؤ......! تم نے اپنی بہن کا راستہ کیوں روکا تھا......؟"

"بہن ہو گی تمہاری......!"

تعاقب میں آنے والے لڑکے نے ایک مُکا ظفر کے جبڑوں پر مارنا چاہا مگر وہ ظفر تھا، مُکا لگنے سے پہلے اسے کاندھے سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔ شہناز ان دونوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر بھاگتی ہوئی گلی سے نکل گئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کا سامنا ہوا۔

"کیوں ری......؟ کیا ہوا تجھے......؟ کیا کوئی پیچھا کر رہا ہے جو یوں رنگ اُڑا ہوا ہے......؟"

"ماں......! تم نہ کچھ دیکھتی ہو اور نہ کچھ سنتی ہو......! بس یوں ہی باتیں کرنا شروع کر دیتی ہو۔ ایک تو گرمی، اس پر میرے سر میں درد......!"

شہناز نے سنبھل کر جواب دیا۔

"تو کیا میں نے اسکول میں داخلہ لینے کو کہا تھا......؟"

ماں نے اس کا حال پوچھنے کی بجائے اُلٹا ڈانٹ دیا۔ شہناز بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔

"چلو......! تم سب جا کر باہر برآمدے میں کھیلو......!"

اس نے بچوں کو ڈانٹتے ہوئے کمرے سے نکال دیا اور خود چارپائی پر گر گئی۔ اسے یقین تھا، مار پٹائی کے بعد ظفر گھر بتانے ضرور آئے گا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر کوئی نہ آیا۔ شہناز اطمینان کی سانس لے کر چار پائی سے اُٹھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

"یا اللہ......! خیر......!"

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا تو بھائی اندر داخل ہو رہا تھا۔

"اُف......! یہ خوف بھی کیا چیز ہے......؟"

وہ زور سے ہنس پڑی۔

صبح وہ اسکول جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ جی میں آیا چھٹی کر لے مگر پھر سوچا۔

"ماں سے کیا کہوں گی......؟ وہ تو پہلے ہی پڑھائی کے خلاف تھی۔

کہے گی، چھٹی کرنے سے تو بہتر ہے تم گھر میں ہی بیٹھی رہو۔"

یونیفارم پہن کر وہ باہر آئی تو ماں بولی۔

"یہ تیرے نخرے آج آسمان سے کیوں باتیں کر رہے ہیں......؟ اسکول کا ٹائم ہو گیا اور تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا......؟ آج کیا اسکول جانے کا ارادہ نہیں......؟"

"ماں......! آج ناشتے کو جی نہیں چاہتا۔ صرف لسّی دے دو......!"

شہناز نے کتابیں سنبھالتے ہوئے کہا اور پھر لسّی کا ایک گھونٹ پیتے ہی نفرت سے بولی۔

"ماں......! یہ لسّی ہے یا کوّے کے آنسو......؟ آدھا کلو دہی ہوتا ہے، اس میں سے بھی تم شہباز کے لے الگ نکال لیتی ہو اور ہمیں یہ لسّی پینے کو دیتی ہو......؟ خود ہی پیئو ایسی لسّی......! مجھ سے نہیں پی جاتی۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گلی میں داخل ہوتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ظفر گلی کی نکڑ پر تنہا ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"کیا مصیبت ہے......؟"

شہناز بڑبڑائی۔

"اب نہ جانے یہ کیا کہنے کے لئے کھڑا ہے......؟"

اس کے جی میں آیا، واپس لوٹ جائے مگر پھر وہی ماں کا ڈر۔ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی ظفر کے قریب پہنچی تو نہ جانے کیوں قدم من من بھاری ہو گئے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ظفر کی طرف دیکھا تو وہ گہری گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہناز خود کو گھسیٹتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف

بڑھنے لگی۔ چلتے چلتے اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ وہیں کھڑا تھا۔ شہناز کو تھوڑا سا اطمینان ہوا۔ وہ مطمئن انداز میں چلنے لگی۔

ظفر اس محلے کا بدنام لڑکا تھا۔ اس کا اُٹھنا بیٹھنا بھی اپنے جیسے آوارہ لڑکوں کے ساتھ تھا۔ محلے کا کوئی شریف لڑکا اس سے بات کرنا پسند نہ کرتا۔ جوا کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ شہناز نے اپنے بھائی کی زبانی سن رکھا تھا، وہ ہمیشہ اپنی لات کے ساتھ خنجر باندھ کر رکھتا ہے اور کمر کے ساتھ بیلٹ۔ سگریٹ بہت زیادہ پیتا ہے بلکہ شاید چرس بھی۔

اس کی ماں بچپن میں مر چکی تھی۔ پانچویں میں تھا کہ باپ بھی مر گیا۔ تب اسکول کی دُنیا سے نکل کر وہ غنڈوں کی دُنیا میں پہنچ گیا۔ جسے ہمارا معاشرہ اور سماج اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔

ظفر دن کے وقت اپنے محلے میں بہت کم نظر آتا اور اگر آتا بھی تو اپنی چھوٹی سی بیٹھک کا دروازہ کھول کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا جوا کھیلتا۔ بے تحاشہ سگریٹ پیئے جاتا۔ مگر محلے کے چھوٹے آدمی سے لے کر بڑے آدمی تک کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ اسے منع کر سکیں اور شاید وہ اس لئے منع نہیں کرتے تھے کہ وہ انہی کا دیا ہوا کلچر تھا۔

ظفر کے باپ کی وفات کے بعد اگر کوئی اس کی سرپرستی کرتا تو آج وہ سماج کا مجرم ہونے کی بجائے ایک اچھا شہری ہوتا۔ ویسے وہ محلے کی ہر بیٹی کو اپنی بہن تصور کرتا تھا۔ آج تک اس نے کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ظفر نے کسی کی بہو بیٹی پر بری نظر نہیں ڈالی تھی۔ اس کے برعکس محلے میں اگر کسی کو اس کی ضرورت ہوتی تو وہ ہر کام آگے بڑھ چڑھ کر کرتا۔ یہ لوگ نہ

اس سے ناراض تھے اور نہ خوش۔ یعنی ایک قسم کا گزارا ہو رہا تھا۔

اسکول سے چھٹی کے وقت شہناز اسکول سے باہر آئی تو اسے خدشہ تھا۔

''کہیں وہ لڑکا آج کوئی بڑا ہنگامہ نہ کرے......؟''

مگر اس کا خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ آج اس جگہ کوئی نہیں تھا۔ شہناز خوشی خوشی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ مگر گلی میں داخل ہوتے ہی رنگ فق ہوگیا۔ ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت گلے پڑ گئی۔

ظفر اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ شہناز نے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے کترا کر گزرنا چاہا مگر اس کی سنجیدگی سے بھرپور آواز نے شہناز کے قدم روک دیئے۔

''سنو شہناز......! اس غنڈے نے تمہارا پیچھا تو نہیں کیا......؟''

''اونہہ......! خود تو جیسے بڑا شریف زادہ ہے......؟''

شہناز نے دل میں سوچا۔

''تم نے جواب نہیں دیا......؟''

اس کی دوبارہ آواز اُبھری تو شہناز دبی دبی آواز میں بولی۔

''نہیں......!''

''ٹھیک ہے......!''

وہ بڑبڑایا۔

''کم از کم تین مہینے تک تو وہ تمہارے تعاقب کے قابل ہی نہیں رہا ہوگا۔''

''کک...... کیا مطلب......؟''

شہناز نے پلٹ کر خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں......!''

وہ نہ جانے کیا سوچ کر زور سے ہنسا۔

''بس میں نے اس کی تھوڑی سی ٹھکائی کی تھی۔''

''خن...... خنجر سے تو نہیں......؟''

شہناز نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

''خنجر......؟''

وہ چونک کر شہناز کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

''ایسے گیدڑوں کے لئے میرے ہاتھوں میں بہت طاقت ہے۔''

''تو تم نے اسے خوب مارا......؟''

شہناز کا خوف کچھ کم ہوگیا۔

''ہاں......!''

ظفر نے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''نہ صرف مارا ہے بلکہ کاندھے پر ڈال کر اس کے دروازے پر چھوڑ آیا۔''

''ہائے اللہ......!''

شہناز کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''کیا ہوا......؟''

وہ چونک کر بولا۔

''وہ لوگ اگر تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتے تو تمہارا کیا ہوتا......؟''

نہ جانے کیوں دل کے کسی حصے میں اس کے لئے ہمدردی جاگ اُٹھی......؟

''کوئی نئی بات نہ ہوتی......!''

ظفر نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔

''وہاں تو ہمارا اکثر آنا جانا رہتا ہے۔''

اس نے یوں کہا جیسے کسی ریاست میں جانے کی بات کر رہا ہو۔ ایسے بدنام شخص ایسی باتوں سے بھلا کیا ڈرتے ہیں......؟ شہناز نے نفرت سے سوچا اور پھر گھر چلی آئی۔

گھر جب فرصت ہوئی تو سوچنے لگی۔

''میں ظفر کی کیا لگتی ہوں جو اس نے میری خاطر اتنا بڑا جھگڑا مول لیا......؟''

دن گزرتے رہے مگر اس دن کے بعد سے ظفر پھر نظر نہ آیا اور نہ ہی تعاقب میں آنے والا لڑکا۔ دو مہینے اسی طرح گزر گئے۔

اچانک ایک دن شہناز نے سنا ظفر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس نے راہ چلتے ایک راہ گیر کو جان بوجھ کر مارا پیٹا تھا۔

''جان بوجھ کر تو ہرگز نہ مارا ہوگا......؟''

شہناز کا دل اس کی صفائی پیش کرنے لگا۔

''اس کی طرح پھر اس نے کسی کی مدد کی ہوگی......؟''

"ارے......! پورا لفنگا ہے۔"

اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

"میں کہوں، تم محلے کے چیئرمین سے کہہ کر اسے یہاں سے نکلوا کیوں نہیں دیتے......؟ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے بچے بھی بگڑ گئے تو کیا ہوگا......؟ ماں باپ تو بیچارے شریف تھے مگر یہ کم بخت نہ جانے کس پر گیا ہے......؟ ایسے برے آدمی کو ہمارے محلے میں نہیں رہنا چاہئے......! تم کچھ کرو......!"

"ماں......! وہ دل کا ایسا نہیں......!"

شہناز اس کی توہین برداشت نہ کرسکی۔ وہ صفائی پیش کرنے باہر نکل آئی۔

"کئی شریف زادوں سے وہ اچھا ہے۔ محلے میں اس نے آج تک کسی سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ اس راہ گیر نے ضرور کچھ کیا ہوگا جو ظفر نے اسے مارا پیٹا......؟"

"اے......! تم ظفر کی حمایت میں بولنے والی کون ہو......؟ کیا لگتا ہے وہ تیرا......؟"

ماں نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"شہناز ٹھیک کہتی ہے......!"

باپ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"یہ لڑکا برا نہیں، اگر کوئی اس کی اصلاح کرنے والا ہوتا تو آج شاید وہی اسے محلے کا چیئرمین ہوتا۔"

"چیئرمین کیوں......؟ میں کہتی ہوں اس ملک کا صدر ہوتا......؟ گورنر ہوتا......؟ تم باپ بیٹی کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا......؟ ایک لوفر، آوارہ کے بارے میں ایسے سوچ رہے ہو......؟ دوسرے بچے بھی تو اس کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئے ہیں۔ کوئی ایک بھی ایسا جیسا نہیں......!"

"تم سے بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔"

شہناز کا باپ تو یہ کہتا ہوا اُٹھ کر باہر چلا گیا اور شہناز کی ماں یوں اسے گھورنے لگی جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔

"کیوں ری......؟"

وہ شہناز کے بال پکڑے ہوئے بولی۔

"تجھے اس بات کی خبر کب سے ہوگئی کہ وہ دل کا بہت اچھا ہے......؟ دیکھا ہے تم نے اس لفنگے کو......؟ بول کہاں دیکھا......؟"

"نن......نہیں......!"

شہناز تکلیف سے چلائی۔

"پھر......؟"

ماں نے ڈیلے نکال کر پوچھا۔

"ماں......! میں تو یوں ہی کہہ رہی تھی۔"

شہناز کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ماں دوبارہ پھر چولہے کے پاس جا بیٹھی۔

اب اسکول جاتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کی نگاہیں ظفر کو تلاش کرتیں......؟ مگر وہ ہوتا تو نظر آتا۔

کچھ دن بعد اسے معلوم ہوا، ظفر چھوٹ کر آ گیا ہے۔ اس صبح شہناز سکول جانے کے لئے تیار ہوئی تو دل انجانی خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ گھر سے باہر آئی تو آنکھوں میں انجانے اور خوب صورت تصورات تھے مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ شہناز بجھے دل سے اسکول چلی آئی۔

واپسی پر اس نے سوچا شاید گلی میں وہ کہیں مل جائے......؟ مگر گلی خالی تھی۔ شہناز بے دلی سے چلتی ہوئی گلی سے باہر آئی تو وہ گلی سے چند قدم کے فاصلہ پر پان والے کے کھوکھے کے قریب کھڑا پان کھا رہا تھا۔

شہناز کا جی چاہا، واپس گلی میں پلٹ جائے۔ اسے اشارہ کر کے گلی میں بلائے مگر وہ تو اس کی طرف متوجہ ہی نہ تھا۔ وہ خاموشی سے گھر چلی آئی۔

جب وہ کھوکھے کے قریب سے گزرنے لگی تو لاپرواہی سے منہ چلاتے ہوئے ظفر کی نظر اس پر پڑی۔ شہناز نے ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جن میں شکوہ تھا، شکایت تھی۔ ایسی نظروں کا مفہوم گنوار سے گنوار آدمی بھی سمجھ جاتا ہے۔ وہ تو پھر گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا آدمی تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی شہناز نے دروازے کے سوراخ سے باہر دیکھا۔ ظفر کچھ دیر تو اُلجھا اُلجھا سا کھڑا رہا پھر لاپرواہی سے سر جھٹک کر گلی کی جانب مُڑ گیا۔

''ہو تو آخر گنوار ہی ناں......!''

شہناز بڑبڑاتی ہوئی سیدھی ہوئی تو ماں پیچھے کھڑی تھی۔

''کیوں ری......؟ کسے دیکھ رہی تھی......؟''

ماں نے ایک زوردار ہاتھ اسے جما دیا۔

''وہ...... وہ ماں......! کتا پیچھے لگا ہوا تھا۔''

تھپڑ لگنے کی وجہ سے شہناز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ماں......! تم نہ دیکھتی ہو نہ پوچھتی ہو......! اور مارنا شروع کر دیتی ہو۔ میں اب چھوٹی بچی نہیں ہوں جو تم بار بار مجھ پر ہاتھ اُٹھاؤ......!''

شہناز پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''تیری یہ مجال......؟ تو میرے آگے زبان درازی کرے......؟''

ماں اس کے پیچھے آتی ہوئی چیخی۔

''آ لینے دے اپنے باپ کو......! جس نے تجھے اسکول میں ڈالا ہے۔ آج اس سے بات کر کے رہوں گی۔''

ماں کو پیچھے آتا دیکھ کر اس نے چٹخنی چڑھا دی۔

رات کو شہناز کا باپ آیا تو تو اس کی ماں شہناز کو کوسنے لگی۔ باپ کو دیکھ کر شہناز بھی باہر نکل آئی اور ساری بات بتا دی۔

''تم بھی سوچ سمجھ کر بات کیا کرو تاجی......!''

شہناز کے باپ کو بھی غصہ آ گیا۔

''شہناز اب بچی نہیں کہ تم جب چاہو مار پیٹ پر رکھ دو۔ کبھی کبھی عقل سے بھی کام لے لیا کرو......! تم جیسی ماؤں کی وجہ سے بچیاں گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔''

شہناز کی ماں یوں چپ ہو گئی جیسے روزہ رکھ لیا ہو اور شہناز بھی بات بڑھنے کے ڈر سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صبح وہ گھر سے نکلی تو ظفر پان والے کھوکھے کے قریب اپنے دو تین

دوستوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ شہناز نے محسوس کیا باتیں کرتے کرتے وہ جیسے کسی کا منتظر ہو......؟ شہناز جب اس کے قریب سے گزری تو وہ چونک پڑا۔ مگر پھر لاپرواہی سے باتوں میں لگ گیا۔

شہناز کتنی دیر گلی میں کھڑی رہی کہ شاید وہ آئے مگر اسے نہ آنا تھا اور نہ آیا۔

''سنگ دل......! بے وفا......!''

شہناز نے افسانوں میں پڑھا ہوا جملہ دوہرایا اور بس اسٹاپ کی طرف چلی آئی۔

واپسی پر اس نے سوچا شاید وہ مل جائے......؟ مگر اب کھوکھا بھی بند تھا اور خود اس کے گھر کے دروازے پر بھی تالا پڑا ہوا تھا۔ شہناز غصے سے دندناتی ہوئی گھر میں چلی آئی۔

سردیاں ہوں یا گرمیاں......؟ وہ چھت پر کبھی نہ چڑھی تھی۔ بقول خود اس کے۔

''ایسی چھت پر چڑھنے کا کیا فائدہ جس کی چار دیواری نہ ہو......؟''

مگر آج نہ جانے کیا سوچ کر وہ چھت پر چلی آئی......؟ کتنی دیر کھڑی وہ آس پاس کا جائزہ لیتی رہی۔ مگر وہ ظالم کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر وہ نیچے چلی آئی۔

دو ہفتے وہ پھر غائب رہا۔ تب اسکول سے واپسی پر شہناز اس کے گھر کے قریب سے گزری تو وہ بیٹھک میں بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ ساتھ میں اس کے دو تین دوست تھے۔ شہناز میں نہ جانے کہاں سے اتنی جرأت آ گئی کہ

ایک لمحہ رُک کر اس نے زہر خند سے ظفر کی طرف دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن پھر اس کے گھر پر تالا پڑا تھا۔ شہناز کا جی چاہا پٹرول چھڑک کر آگ لگا دے۔ وہ جتنا اس سے بات کرنا چاہتی تھی، وہ اتنا ہی دُور بھاگ رہا تھا۔ ایک مہینہ گزر گیا مگر وہ پھر اسے نظر نہ آیا۔

شہناز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کس سے پوچھے......؟ کچھ سوچ کر وہ بھائی کے پاس آئی اور لگی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے۔

پھر اچانک بولی۔

''ایک بات کی مجھے بہت خوشی ہے، شکر ہے محلے والوں کا اس غنڈے سے تو پیچھا چھوٹا......!''

''کون سا غنڈہ......؟''

شہباز نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ارے......! وہی ظفر......؟''

شہناز نے نفرت سے ناک سکیڑی۔

''اس محلے کا پیچھا وہ کبھی نہیں چھوڑ سکتا......!''

شہباز اس کی بات ختم ہوتے ہی بول اُٹھا۔

''وہ تین مہینے کے لئے کراچی گیا ہے۔''

شہباز نے گویا اسے اطلاع دی۔

''کراچی میں کیا اس کے رشتہ دار رہتے ہیں جو وہ منہ اُٹھا کر کراچی

چلا گیا......؟"

شہناز نے منہ بنا کر کہا۔

"ایسے لوگوں کے لئے کراچی جیسا شہر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے دھندے کے سلسلے میں گیا ہوگا......؟"

شہباز تو یہ کہہ کر چلا گیا اور شہناز سوچنے لگی۔

"اُف......! یہ تین مہینے کیسے گزریں گے......؟"

مگر یہ تین مہینے بھی گزر گئے۔ شہناز حسب معمول اسکول سے واپس آ رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے گی میں قدم رکھا، سامنے ظفر کو دیکھ کر دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

ظفر جب قریب پہنچا تو شہناز کے قدم خود بخود رُک گئے مگر وہ لاپرواہی سے پان چباتے ہوئے قریب سے گزر گیا۔ شہناز نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ شہناز کا پورا وجود سلگ اُٹھا۔ جی میں آیا، پیچھے سے کتابیں مارنا شروع کر دے۔

"نہ صورت نہ سیرت......! کم بخت پتہ نہیں اکڑتا کس بات پر ہے......؟ اسے ذرا اس بات کی خوشی نہیں کہ میرے قدم اس کے لئے رُک جاتے ہیں......؟ میں جو اپنے خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔"

وہ دانت پیستی ہوئی گھر آئی۔ کھانا کھانے کو بھی جی نہ چاہا۔ ظفر کی لاپرواہی اس کی اَنا پر تازیانے کا کام دے رہی تھی۔

ایک دن، صبح جب وہ گھر سے نکلی تو وہ پان والے کے کھوکھے کے قریب کھڑا تھا۔ شہناز پر نظر پڑتے ہی وہ گلی کی جانب مُڑ گیا۔ شہناز خوشی سے

کانپتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی تو وہ سگریٹ منہ میں دبائے گہری سوچ میں مبتلا تھا۔

"شہناز آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب جا کر رُک گئی۔ وہ اُلجھی اُلجھی نظروں سے شہناز کو دیکھنے لگا۔ شہناز منتظر تھی کہ وہ کوئی بات کرے مگر وہ اُنگلیوں میں سگریٹ دبائے اور شہناز کے چہرے پر نظریں جمائے، اب بھی کچھ سوچ رہا تھا۔

شہناز کو خواہ مخواہ اس پر غصہ آنے لگا۔ سگریٹ کی راکھ جب اس کی اُنگلیوں تک پہنچی تو وہ چونک پڑا اور شہناز مارے غصے کے آگے بڑھ گئی۔ تب اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پکارا۔

"سنو شہناز......! کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو......؟"

"میں......؟"

شہناز نے حیرت سے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

"میں یا تم کچھ کہنا چاہتے ہو......؟"

شہناز نے اپنے دل کی کیفیت چھپا کر پوچھا۔

"میں......؟"

اب کی بار ظفر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"نہیں......! میں تو کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ شہناز کچھ کہنا چاہتی تھی مگر قدموں کی آہٹ سن کر آگے بڑھ گئی۔

وہ پھر غائب ہوگیا اور امتحان شروع ہوئے تو شہناز بھی کچھ مصروف

ہوگئی۔ امتحان آئے اور ختم ہوگئے۔ شہناز میٹرک میں آگئی۔ مگر ظفر کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ انہی دنوں پھر جیل چلا گیا۔ اس کی بار صرف تین ماہ کے لئے گیا تھا۔

ادھر شہناز کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں اور چھٹیوں کے ساتھ ہی ماں نے اس کی شادی کے قصے شروع کردیئے۔ اسے ڈر تھا آگے کہیں کالج جانے کی تیاری نہ کرے......؟ جب تک رشتے کی بات چلتی رہی، شہناز یہ سوچ کر مطمئن رہی۔ مگر جب اس کی منگنی کی بات پکی ہوگئی تو وہ تڑپ اُٹھی۔

’’اس جمعہ کو وہ لوگ تمہیں انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔‘‘

ماں نے اسے اطلاع دی۔

’’نہیں کرنی مجھے شادی......! کیا ضرورت تھی ابھی میری شادی کی......؟ کیا میں پچاس سال کی ہوگئی تھی......؟‘‘

شہناز غصے سے چیخی۔

’’ہوش کی دوا کر لڑکی......! کیوں اُلٹی سیدھی بکواس کرنے لگی......؟ ہم یہ سب کچھ تیرے بھلے کے لئے کر رہے ہیں۔ کوئی دُشمن تو نہیں ہم تیرے......؟‘‘

’’دُشمن نہیں تو دوست بھی نہیں ہیں میرے......!‘‘

شہناز چیخی۔

’’بس......! کہہ دیا میں نے، ابھی نہیں کروں گی شادی......!‘‘

’’میں کہوں، اصل بات کیا ہے......؟‘‘

ماں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تھوڑی نرمی سے پوچھا۔

’’مجھے یہ رشتہ پسند نہیں......!‘‘

شہناز نے دبی دبی آواز میں کہا۔

’’کیا کہا......؟ یہ رشتہ پسند نہیں......؟‘‘

شہناز کی ماں دہاڑی۔

اور پھر دو ہتھڑ شہناز کے مارتے ہوئے بولی۔

’’تجھے یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی......؟ میں قینچی سے تیری زبان کاٹ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گی۔ ارے......! کیا اس دن کے لئے تیرے باپ نے تجھے داخلہ لے کر دیا تھا کہ تو اپنی پسند کی بات کر سکے......؟ آلینے دو آج اسے بھی۔ کرتی ہوں اس سے بات......! یہ گل کھلایا ہے تو نے اسکول جا کر......؟‘‘

شہناز کی ماں اسے کوستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

سارا دن شہناز کمرے میں بند آنے والے واقعات کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے غلط کیا تھا یا صحیح......؟ اس کی اسے پرواہ نہ تھی۔

رات کو اس کے باپ کے آنے پر جو ہنگامہ ہوا، شہناز وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سنتی رہی۔ آج صرف اس کی ماں گرج رہی تھی اور باپ چپ چاپ سن رہا تھا۔ جیسے شہناز کو داخلہ لے کر دینا واقعی بہت بڑا جرم بن گیا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ اُٹھا اور شہناز کے کمرے کی طرف آگیا۔

باپ کو اپنے کمرے کی طرف آتا دیکھ کر شہناز جلدی سے چارپائی پر لیٹ گئی۔

’’شہناز بیٹے......!‘‘

باپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ باپ کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ محسوس کر کے شہناز تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔

''شہناز......! تمہاری ماں جو کچھ کہہ رہی ہے، کیا وہ ٹھیک ہے......؟ اور اگر ٹھیک ہے تو کیا میں نے تمہیں اس دن کے لئے اسکول میں داخل کرایا تھا کہ تو مجھے اپنی ماں کے سامنے شرمندہ کروائے......؟''

''ابا......! میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں......! ابا......! ہمارے مذہب اسلام نے ہمیں اتنا حق تو دیا ہے کہ ہم اپنے لئے پسند یا ناپسند کی بات کرسکیں......!''

''دیکھو شہناز......! جو اصل بات ہے، وہ مجھے بتا دو......! شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں......؟''

''شہناز کے جی میں آیا، باپ کو سب کچھ بتا دے مگر ابھی کوئی سر پیر تو تھا نہیں بات کا، سو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ابا......! اور تو کوئی بات نہیں......! بس میں پڑھنا چاہتی ہوں۔''

''دیکھو شہناز......! اس گھر میں ہمیشہ وہ ہوتا ہے جو تمہاری ماں چاہتی ہے۔ تمہاری خواہش کے مدنظر میں نے تمہیں اسکول میں داخل کرا دیا۔ اب تم بھی میری خاطر چپ چاپ حامی بھرلو۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔''

''مگر ابا......! اسلام کے وہ اُصول، وہ ضابطے، یوں تو ہر بات میں اسلام کی مثال دی جاتی ہے، اسلام کا واسطہ دے کر ہر چھوٹا بڑا کام کروایا جاتا ہے، مگر یہاں یہ پوچھ گچھ کیوں نہیں......؟ جب ہمارے رسولؐ نے خود فرمایا ہے، بیٹی سے پوچھ کر اس کی بات طے کی جائے، پھر دوسری باتوں کے ساتھ

اس بات پر کیوں نہیں عمل کیا جاتا......؟''

''یہ بہت دُور کی بات ہے شہناز......! اپنی ناک اور انا کی خاطر نہ جانے کتنی بیٹیاں مار دی جاتی ہیں۔ تمہیں بھی یہ سب کچھ چپ چاپ سہنا ہوگا۔''

شہناز کا باپ اُٹھ گیا اور شہناز ظفر کے بارے میں سوچنے لگی۔

اگر وہ پیغام بھجواتا تو کیا اس کے گھر والے منظور کر لیتے......؟ ہاں......! شاید ابا کوشش کر کے منظور کروا دیتے اور شادی کے بعد میں یقیناً اسے وہ راستے چھوڑے پر مجبور کر دیتی اور سیدھے راستے پر لے آتی۔ مگر وہ کمینہ بھی تو جیل سے باہر آئے......!''

شہناز دانت پیسنے لگی۔

جمعہ کو اس کے سسرال والے آئے اور شہناز کو انگوٹھی پہنا کر چلتے بنے۔ چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ صبح وہ اسکول جانے کے لئے تیار ہوئی تو ماں اندر آ کر بولی۔

''سہیلیوں کے لئے لڈو لے کر جاؤ گی کیا......؟''

''اگر مرگ پر لڈو تقسیم کئے جاتے ہیں تو ڈبہ بھر کر مجھے بھی دے دو ساتھ......!''

شہناز غصے سے چیخ پڑی

''میری بربادی ہے اور تم لوگ خوشیاں منا رہے ہو......؟''

''بے غیرت......! ہوش کی دوا کرو......!''

ماں اسے گھورنے لگی۔

"ایسے رشتے قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ لڑکا سینئر کلرک ہے۔ آٹھ ہزار روپے تنخواہ ہے۔ اوپر سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی ہے اور کیا چاہئے تجھے......؟"

"ہاں ہاں......! اور کیا چاہئے مجھے......؟"

شہناز پٹخ پٹخ کر کتابیں اُٹھانے لگی۔

"دونوں جہاں کی بادشاہت جو مل گئی ہے مجھے......؟ حرام حلال کی روزی کھایا کروں گی میں......؟ اوپر کی آمدنی سے......؟"

وہ بڑبڑاتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔

واپسی پر وہ سوچ رہی تھی۔ کاش وہ کسی رکشہ یا وین کے نیچے آجائے۔ اچانک ایک رکشہ تیزی سے اس کے قریب آ کر رُکا۔ شہناز نے دھڑکتے دل کے ساتھ سر اُٹھایا تو شروع شروع میں اس کے تعاقب میں آنے والا لڑکا اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

"کیا حال ہے ڈیئر......؟"

اس نے اپنی بے سُری آواز میں پکارا۔

"تم کیا وہ مار بھول گئے ہو......؟ پرانے زخم بھر گئے ہوں گے اس لئے نئے لگوانے آئے ہو......؟"

شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بھولا نہیں شہناز ڈیئر......! بھولا ہوتا تو آج یہاں کیوں آتا......؟"

اس نے کرخت لہجے میں کہا اور رکشہ آگے بڑھ گیا۔

"بدتمیز کو میرا نام کس نے بتایا......؟ کمینہ......! ذلیل......!"

وہ دانت پیستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

گلی ہمیشہ کی طرح آج بھی سنسان تھی مگر جب وہ ظفر کے گھر کے قریب پہنچی تو بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا۔ شہناز کے قدم خود بخود رُک گئے۔ اس نے ایک نظر گلی میں ڈالی اور پھر ہمت کر کے اندر داخل ہوگئی۔

بیٹھک بالکل خالی تھی۔ اس میں انسان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ کتابیں ایک طرف رکھ کر شہناز نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور بیٹھک کا جائزہ لینے لگی۔ صرف ایک دری بچھی تھی اور اس پر دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی ظفر تولئے سے بال خشک کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ شہناز سے بے خبر تولیہ اُتار کر ایک طرف پھینکا اور پھر یک لخت چونک پڑا۔

"شہناز......! تم......؟"

اس نے حیرت سے کہا۔

"تم یہاں کیسے......؟"

"تمہیں اس سے مطلب......؟"

شہناز کاٹنے کو دوڑی۔

"دیکھو شہناز......! یہ اچھی بات نہیں......! اگر کسی نے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ بدنامی ہوگی......؟"

"پہلے کون سے محلے بھر میں تمہاری شرافت کے چرچے ہو رہے ہیں......؟ جو اب بدنامی ہوگی......؟ بدنام کو بدنامی سے کیا خوف......؟ کیا ڈر......؟ بدنامی کا تو ہم شریف لوگوں کو سوچنا چاہئے......!"

’’میں اپنی نہیں، تمہاری ہی بات کر رہا ہوں۔ میرا کیا ہے......؟ جہاں اتنے الزام ہیں، وہاں ایک اور سہی......! مگر بات تمہاری ہے شہناز......! اگر کسی نے دیکھ لیا تو......؟‘‘

اس نے سنجیدگی سے شہناز کو دیکھا

’’میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں......! تم کون ہوتے ہو میری فکر کرنے والے......؟ کب سے جاگی ہیں یہ ہمدردیاں میرے لئے......؟ بولو......! کب سے......؟‘‘

شہناز بے سروپا باتیں کرنے لگی۔

’’آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو......؟‘‘

’’میں کیا کہنا چاہتی ہوں......؟‘‘

شہناز بڑبڑائی اور یک دم دونوں ہاتھوں سے ظفر کا کالر پکڑ کر چیخی۔

’’وہ کہنا چاہتی ہوں جو تم آج تک اشاروں سے نہ سمجھ سکے۔ بولو......! کیا اتنے ہی بے خبر تھے تم......؟ اتنے ہی انجان تھے تم......؟ جو تمہیں اندازہ نہ ہو سکا کہ میں کیا چاہتی ہوں......؟ تمہیں کیا سمجھانا چاہتی ہوں......؟ بولو......! کیا قصور کیا تھا میں نے......؟ یہی ناں کہ تم سے محبت کر بیٹھی تھی......؟ کیوں اپنی شرافت کا سکہ جمایا تھا تم نے مجھ پر......؟ اور پھر اتنا عرصہ مجھ سے بے خبر کیوں رہے......؟

بتاؤ......! کیا تم میری نظروں کو سمجھ نہ سکے جو پلٹ پلٹ کر تمہارے تعاقب میں جاتی تھیں......؟ جو تم سے کچھ کہنا چاہتی تھیں......؟ بتاؤ ظفر......! کیا تم کچھ بھی نہ سمجھے تھے......؟‘‘

شہناز کی آواز بھرّا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ظفر دُکھ سے اسے دیکھنے لگا پھر اپنا کالر چھڑا کر بولا۔

’’سنو شہناز......! سب کچھ سمجھتا تھا میں شہناز......! مگر تم میری مجبوریاں نہیں سمجھتیں۔ وقعت ہی کیا ہے کسی کی نظروں میں میری......؟ جب ماں، بہن جیسی عظیم ہستیاں مجھے نہیں ملیں، پھر بیوی کی تمنا میں کس طرح کر سکتا ہوں......؟

تمہارا ہر اشارہ، ہر بات سمجھتا تھا مگر تمہارے پیچھے کیسے آ سکتا تھا......؟ تم اس معاشرے کا فرد ہو جس میں بظاہر شریف اور نیک لوگ رہتے ہیں۔ جنہیں سماج عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ باطن ان کے بے شک جتنے کالے ہوں اور ہم جس معاشرے کی پیداوار ہیں، وہ بدنام ہے۔ ان کے اندر کتنے ہی سفید دل کیوں نہ ہوں......؟ مگر ان کے چہروں پر وقت اور حالت نے جو سیاہی مل دی ہے، وہ آنے والی نسلیں بھی نہ دھو سکیں گی۔‘‘

’’ظفر......! کیا تم بدل نہیں سکتے......؟ میری خاطر ان حرکتوں کو چھوڑ نہیں سکتے......؟‘‘

’’میں اگر ان حرکتوں کو چھوڑ بھی دوں، تب بھی تمہارے معاشرے کا شریف آدمی نہیں کہلا سکتا۔ یہاں پر ایک بار جو خطاب کسی کو مل جاتا ہے، وہ مٹ نہیں سکتا۔ یوں بھی جب کوئی اپنا ہے ہی نہیں، پھر خود کو بدلنے کا فائدہ......؟

کچھ لوگ بہت بدنصیب ہوتے ہیں، ان کے مقدر میں سدا جلنا لکھا ہوتا ہے۔ یہ میرا نصیب ہے۔ اسے نہ تم بدل سکتی ہو اور نہ میں۔ بہتر ہے تم

گھر واپس چلی جاؤ......!"

"نہیں......! نہیں ظفر......! میں اس وقت تک گھر واپس نہیں جاؤں گی۔ جب تک تم یہ اعتراف نہیں کرو گے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں تب تک نہیں جاؤں گی جب تک تم خود کو بدلنے کا وعدہ نہیں کرو گے۔"

"اس بات سے تمہیں کیا حاصل ہوگا......؟ یہ تو پولیس والوں جیسی زبردستی ہوئی کہ میں مان لوں کہ میں جوا کھیل رہا تھا۔"

"ظفر......! کیا تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا......؟"

شہناز رونے لگی۔

"تم کسی کو میرے گھر پیغام دے کر تو بھیجو......! تمہیں کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔ ایک بار آزماؤ تو سہی ظفر......!"

"نہیں شہناز......! تمہارے ماں باپ کبھی یہ گوارہ نہیں کریں گے۔ تم خود کیوں نہیں سمجھتیں میری مجبوریاں......؟ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے گھر آسکوں۔"

"ظفر صاحب......! ایک بار......صرف ایک بار تم آؤ تو سہی......! تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔"

"اچھی زبردستی ہے......!"

ظفر کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تو پھر آؤ گے ناں ظفر......؟"

شہناز پُراُمید نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ٹھیک ہے شہناز......! تمہاری خاطر یہ ذِلت بھی گوارہ کر کے دیکھ

لوں گا۔ میں شام کو خود تمہارے گھر آؤں گا۔ اب تو خوش ہو......؟"

"سچ......؟"

شہناز خوشی سے بولی۔

"بالکل سچ......!"

"ٹھیک ہے ظفر......! تم ضرور آنا......! مجھے یقین ہے پھر میری منگنی بھی ٹوٹ جائے گی۔"

"تو کیا تمہاری منگنی ہو چکی ہے......؟"

ظفر چونک کر بولا۔

"ہاں......! ہوگئی ہے، صرف گھر والوں کی نظروں میں......! میری نظروں میں نہیں......!"

"سنو شہناز......!"

ظفر سنجیدگی سے بولا۔

"اب میں تمہارے گھر نہ آسکوں گا۔ تمہارے ماں باپ ایک شریف زادے پر ایک اوباش کو ترجیح نہیں دیں گے۔"

"مگر تم وعدہ کر چکے ہو......! اس لئے ضرور آؤ گے۔ میں انتظار کروں گی......!"

"اچھا بابا......!"

ظفر نے ہار مان کر کہا۔ پھر دروازہ کھول کر گلی میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"باہر جاؤ......! اب کوئی نہیں ہے۔"

شہناز نے مسکرائی نظروں سے اسے دیکھا اور ایک سال سے جو غبار اس کے اندر چھپا تھا، وہ نکل چکا تھا۔

ظفر نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر دیا تو وہ چپکے سے باہر نکل آئی۔

’’آج اتنی دیر لگا دی......؟‘‘

شہناز کی ماں نے دروازہ کھلتے ہی مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

’’یوں ہی......!‘‘

شہناز مسکرائی اور اسے مسکراتے دیکھ کر ماں خود بھی مسکرا کر بولی۔

’’چلو بیٹی......! پہلے کھانا کھا لو......!‘‘

’’اچھا ماں......!‘‘

شہناز نے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ آج اس کا انگ انگ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ کھانا کھا کر اس نے کئی دنوں سے بند ریڈیو آن کیا اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ مگر آج نیند کہاں......؟ وہ بیٹھے بیٹھے سپنے دیکھ کر مسکراتی رہی۔

چار بجے اُٹھ کر اس نے دُھوپ میں ہی سارے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ پھر گملوں میں پانی دیا اور بیٹھک میں آئی۔ بیٹھک ٹھیک کرنے کے بعد ایک نظر اس نے خود پر ڈالی اور پھر برآمدے میں بیٹھ گئی۔

چھ بجے کے قریب دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ ماں کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور باپ قریب ہی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ دستک سن کر بولا۔

’’جاؤ بیٹا......! دیکھ تو کون آیا ہے......؟‘‘

’’ابا میں......؟‘‘

شہناز کے دل میں چور تھا، اس لئے ہکلا کر بولی۔

’’کیوں......؟ تمہیں کیا ہے......؟‘‘

باپ نے کہا تو وہ دروازہ کھولنے چلی آئی۔ دروازہ کھلا تو لائٹ بلیو سوٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا ظفر کھڑا تھا۔ ہمیشہ کے بکھرے ہوئے بال سلیقے سے سنوار رکھے تھے۔ شہناز اسے دیکھ کر مسکرائی اور دروازہ بند کر کے اندر چلی آئی۔

’’ابا......! وہ ظفر آیا ہے۔‘‘

’’ظفر......؟‘‘

شہناز کا باپ حیرانگی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

’’ارے......! وہ لُچا لفنگا یہاں کیا لینے آیا ہے......؟‘‘

شہناز کی ماں نے اونچی آواز میں کہا۔

’’ماں......! آہستہ بولو......! اگر اس نے سن لیا تو کیا سوچے گا......؟‘‘

شہناز نے ماں کو چپ کروانے کی کوشش کی۔

’’ارے......! میں کیوں چپ رہوں......؟‘‘

شہناز کی ماں چڑ کر بولی۔

’’ارے......! وہ کیا میرا جوائی ہے......؟‘‘

’’ماں......! چپ رہو......! خدا کے لئے چپ رہو......!‘‘

شہناز نے منت کی۔ اتنے میں شہباز آ گیا۔

’’ماں……! کیا بات ہے……؟ تم کسے برا بھلا کہہ رہی ہو……؟‘‘

’’ارے……! وہی آوارہ لفنگا ہے۔ اس محلے میں رہتا ہے، تیرے باپ سے ملنے آیا ہے اور تیرے باپ سے یہ نہیں ہو سکا کہ باہر کھڑے کھڑے بات کرے، اسے لے کر بیٹھک میں چلا گیا۔ بھلا وہ اس قابل تھا……؟ میں کہتی ہوں، اگر محلے والوں نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تو وہ کیا سوچ رہے ہوں گے ہمارے بارے میں کہ آخر یہ کیا لینے آیا ہے ہمارے گھر……؟ دال میں کچھ کالا تو نہیں……؟‘‘

’’ماں……! خدا کے واسطے……! چپ کرو……! آخر وہ بھی انسان ہے، کوئی پتھر نہیں……! تمہاری باتیں سن کر کیا سوچ رہا ہوگا……؟‘‘

’’جو اس کے دل میں آئے سوچے……! میں کیا اس سے ڈر کر کہہ رہی ہوں……؟‘‘

اسی وقت شہناز کا باپ بیٹھک سے باہر آیا۔

’’کیا لینے آیا تھا وہ……؟‘‘

شہناز کی ماں نے فوراً پوچھا۔

’’چلا گیا ہے یا بیٹھک میں بٹھا کر آئے ہو……؟‘‘

’’چلا گیا ہے……!‘‘

’’کیا……؟ چلا گیا……؟‘‘

شہناز فوراً چونک کر بولی مگر اس کا باپ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر اس کی ماں سے بولا۔

’’تاجی……! تم کبھی عقل کے ناخن بھی لیا کرو……! یوں چیخ چیخ کر اسے برا بھلا کہنے کی کیا ضرورت تھی……؟‘‘

’’مگر ابا……! وہ لینے کیا آیا تھا……؟‘‘

شہباز نے پوچھا۔

’’کہتا تھا ایک ضروری بات کرنی ہے۔ مگر تمہاری ماں کی باتیں سن کر بغیر بات کئے ہی چلا گیا۔‘‘

’’تو کچھ بتا کر نہیں گیا……؟‘‘

’’بتا کر تو کچھ نہیں گیا مگر……‘‘

شہناز کے باپ نے شہناز کی طرف دیکھ کر بات اُدھوری چھوڑ دی جیسے کچھ کچھ سمجھ گیا ہو۔ شہناز خاموشی سے اُٹھ گئی۔

دوسرے دن پھر ظفر کے گھر پر تالا پڑا تھا۔ چند دن بعد نئے سال کی چھٹیاں ہونے والی تھیں اور شہناز آخری بار اس سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ موقع اسے تیسرے دن ملا جب وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی۔

ظفر بھی شاید اس کا منتظر تھا۔ دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ شہناز کو دیکھ کر اندر چلا گیا۔ شہناز بھی اس کے پیچھے چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ شہناز چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے……؟ کیا پوچھے……؟ اور کیا کہے……؟

آخر کچھ سوچ کر بولی۔

’’ظفر……! تم بغیر بات کئے چلے کیوں آئے……؟‘‘

ظفر کچھ دیر تو خاموش رہا پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ تمہارے ماں باپ مجھے کسی شریف زادے پر ترجیح نہیں دیں گے مگر تمہاری خاطر میں تمہارے در پر پہنچ گیا۔ مجھے انجام کی خبر تھی مگر تمہیں مطمئن کرنے کے لئے چلا آیا اور قبل اس کے کہ میں بات کرتا، تمہاری ماں کی رائے مجھ تک پہنچ گئی۔

پھر خود کو ذلیل کروانے کا کیا فائدہ......؟ میں نے اپنی زندگی میں بہت ذِلت اُٹھائی ہے۔ اب اور نہیں اُٹھا سکتا۔ تمہارے میرے راستے جدا جدا ہیں۔ تم جو چاہتی ہو، وہ کبھی نہیں ہوسکتا۔"

"کیا تم ایسا نہیں چاہتے......؟"

شہناز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"میں......؟"

ظفر بے دِلی سے ہنسا۔

"آج تمہاری خاطر اعتراف کرتا ہوں، پہلی ملاقات کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں بھول جاؤں اور شاید بھولنے میں کامیاب بھی ہوگیا مگر تمہاری آنکھوں کے پیغام نے مجھے پھر وہیں لا کھڑا کیا۔ جس بات سے بچنے کے لئے میں اِدھر اُدھر بھاگتا پھرا، وہ پھر بھی ہو کر رہی۔

بات اگر میری اپنی ذاتی کی ہوتی تو کبھی اتنا افسوس نہ ہوتا۔ مگر خیال تو اب تمہارا دُکھ دے گا۔ میرا کیا ہے......؟ میرے وہی راستے ہیں، پھر وہیں لوٹ جاؤں گا۔ میں اپنے ہنگاموں میں کھو جاؤں گا جن سے آہستہ آہستہ ہٹنا شروع کیا تھا۔

چھوڑو......! ان باتوں کو دوہرانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ تم نے جو کچھ کہا، میں نے مان لیا۔ اب تقدیر نے جو فیصلہ دیا ہے اسے تم بھی مان لو اور خاموشی سے گھر چلی جاؤ......! تمہیں دیر ہو رہی ہے۔"

"ظفر......؟"

شہناز تڑپ کر بولی۔

"شادی کرنا کوئی گناہ نہیں......! کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہم شادی کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں......؟"

"بکواس مت کرو......!"

ظفر غصے سے غرایا۔

"تم اس محلے کی بیٹی ہو، میں لوگوں کی نظروں میں آوارہ بدمعاش سہی، مگر میں کیا ہوں......؟ یہ تو میرا خدا جانتا ہے۔ تم جاؤ یہاں سے......! جہاں ماں، باپ شادی کرتے ہیں، چپ چاپ کر لو......!"

"تم یہ سب اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم پھر اپنے ہنگاموں میں کھو جاؤ گے۔ ٹھیک ہے ظفر......! تمہارے میرے راستے الگ سہی، آج کے بعد شاید ہم کبھی نہ مل سکیں۔ مگر ایک وعدہ کرو ظفر......! تم مجھے کبھی بھولو گے نہیں......!"

"شہناز......! میں تمہیں بھولوں یا نہ بھولوں......! مگر تم ضرور بھول جانا۔ کیونکہ اس میں تمہارا بھلا اور بہتری ہوگی۔ اب جاؤ......! خدا حافظ......!"

"خدا حافظ......!"

شہناز نے کہا اور یوں باہر چلی آئی جیسے اپنی ساری خوشیاں، سارے ارمان کسی قبرستان میں دفن کر کے آ رہی ہو۔ گھر آ کر کتابیں اس نے یوں

پھینکیں جیسے اپنی زندگی کی ہر خوشی نوچ کر پھینک رہی ہو۔

وقت کی رفتار تھم گئی تھی یا کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔ شہناز کو اس کا کچھ احساس ہی نہ رہا تھا۔ کچھ دن بعد بڑی خاموشی سے اس کا نکاح ہوگیا۔ رُخصتی کے وقت جب ماں اس کے گلے مل کر رونے لگی تو اس کی اپنی آنکھیں خشک تھیں۔ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کرتے وقت بھی اس کے ذہن میں صرف ظفر ہی کا نام تھا اور ظفر کا ہی خیال۔

سجی ہوئی گاڑی میں بیٹھتے وقت اس کی نظریں بے ساختہ ظفر کی تلاش میں بھٹکیں، مگر ناکام واپس لوٹ آئیں۔

دُلہا کے گھر میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مگر شہناز کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی اس وقت جو لوگ پیار کر رہے ہیں، کل نفرت کریں گے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ محبت نام کی کوئی چیز نہ لائی تھی۔

عروسی کمرے میں بیٹھی وہ بے دلی سے اس شخص کا انتظار کر رہی تھی جو اس کی پوری زندگی سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ تب ہی وہ شخص چلا آیا۔ آتے ہی اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ گھونگھٹ کی طرف بڑھایا۔ شہناز نے نفرت چھپانے کے لئے آنکھیں بند کر لیں مگر دوسرے ہی لمحے کسی نے گھونگھٹ اُٹھا دیا۔

آنے والے کی اس حرکت پر شہناز نے بے اختیار آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔ سانس جیسے سینے میں اٹک کر رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا گلے میں جیسے پھانسی لگ گئی ہو۔ اس نے بار بار پلکیں جھپکا کر دیکھا مگر یہ حقیقت تھی۔ اس کے سامنے اس کے تعاقب میں آنے والا لڑکا اب اس کے شوہر کے روپ

میں کھڑا تھا۔

''اب دیدے پھاڑے کیا دیکھ رہی ہو......؟ میں ہوں......! یعنی تمہارا شوہر......! اب بتاؤ......! آج تمہاری مدد کون کرے گا......؟''

''ایسی باتیں مت کرو......! خدا کے لئے ایسی باتیں مت کرو......!''

شہناز نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

''کیوں......؟ ایسی باتیں کیوں نہ کروں......؟''

وہ شہناز کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دے کر بولا۔

''اگر وہ تیرا کوئی نہ تھا تو اس نے مجھے مارا کیوں......؟ تین مہینے تک میں بستر سے نہ اُٹھ سکا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔''

شہناز کو یک دم ظفر کی بات یاد آگئی۔

''کم از کم تین مہینے تک وہ تمہارے تعاقب کے قابل نہ ہو سکے گا۔''

شہناز نے کرب سے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

''ظفر......!''

اس کے دل نے تڑپ کر پکارا۔

''جس ہستی سے تم نے میرا تین ماہ کے لئے پیچھا چھڑایا تھا، وہی مجھے عمر بھر کے لئے تم سے چھین کر لے آیا۔''

اس کا شوہر اکبر نہ جانے کیا کیا اچھی بری باتیں کرتا رہا......؟ مگر وہ اس کے پاس کب تھی......؟ جو اس کی باتیں سنتی......؟ جی چاہ رہا تھا، کاش اس وقت ماں سامنے ہو تو وہ اس سے پوچھے۔

''شرافت اگر اسی کو کہتے ہیں تو ظفر تم لوگوں سے کہیں زیادہ شریف

ہے۔''

''بد سے بدنام برا......!''

ظفر بدنام تھا مگر اکبر بد تھا۔ لوگ ظفر کی ظاہری برائیوں پر جاتے تھے، مگر اس کے دل کا حال کوئی نہیں جانتا تھا اور اکبر جو بظاہر ایک شریف انسان تھا، مگر وہ کتنی کمینی فطرت کا مالک تھا......؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

صبح ولیمہ تھا۔ شہناز کے میکے سے جب وہ لوگ آئے تو اس کا جی چاہا، جانے سے انکار کر دے۔ مگر رسم دُنیا نبھانے کے لئے چپ رہی اور پھر وہ اکبر کے ساتھ اپنے میکے چلی آئی۔

گلی میں داخل ہوتے ہی اکبر نے اسے نقاب اُٹھا لینے کا حکم دیا۔

شہناز اس کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔

''میں نقاب نہیں اُٹھاؤں گی۔''

''ظفر کو نہیں دیکھو گی......؟''

اکبر نے خود اس کا نقاب اُٹھا دیا۔ ظفر سچ مچ بیٹھک کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ یہ ایک لمحہ قیامت کا لمحہ تھا۔ شہناز کی نظریں ظفر کی نظروں سے ملیں اور جھک گئیں۔ مگر ظفر کے چہرے پر کوئی شکوہ نہ تھا۔

وہ شہناز کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر اکبر کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور دُکھ بھی، مگر اس کے بس میں کیا تھا......؟ وہ ایک بدنام انسان تھا۔ بد جیت گیا اور بدنام ہار گیا۔

ظفر کے قریب سے گزرتے ہوئے اکبر نے رُک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر شہناز کا ہاتھ پکڑ کر گردن اکڑا لی، جیسے کہنا چاہتا ہو۔

''اگر ہمت ہے تو آج ہاتھ چھڑا کر دیکھو بچو......!''

ظفر کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ مُڑا اور اندر چلا گیا۔

شہناز تڑپ کر رہ گئی۔

''ظفر......!''

اس کے دل نے سرگوشی کی۔

''ظفر......! تم نے دیکھا، یہاں کے لوگوں کی شرافت کا معیار......؟ اب اگر میں پلٹ کر تمہاری طرف آنا چاہوں بھی تو نہیں آسکتی۔ یہ زندگی یوں ہی تڑپتے تڑپتے گزر جائے گی مگر شادی کے نام پر زنجیریں میرے پاؤں میں پڑی ہیں۔ انہیں میں کبھی نہ کاٹ سکوں گی۔''

''اچھا میرے محبوب......! خدا حافظ......!''



سب سے بری آواز

کچھ نہ مانگوں گا جو اس بات کو پورا کر دے
جو نہیں میرا الٰہی! اسے میرا کر دے
عمر بھر تیرے خیالوں میں یوں ہی کھویا رہوں
تجھ کو بھولوں تو یہ قدرت مجھے اندھا کر دے

مسرت پارک میں داخل ہوئی تو وہی روز والا ماحول تھا۔ چند موٹی لڑکیاں پارک میں بنی ہوئی پکی روش پر وزن کم کرنے کے لئے پوری قوت سے یوں بھاگ رہی ہوتیں جیسے آپس میں دوڑ لگا رکھی ہو۔

دوسری جانب لان کی سرسبز گھاس پر ہلکی فربہی مائل لڑکیاں تندہی سے رسی کود رہی ہوتیں۔ کچھ بچے بھی تھے جو اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے کھیلنے میں مصروف تھے۔ جبکہ کچھ عورتیں ہاتھوں میں تسبیح لئے ذکر اللہ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ واک بھی کرتی رہتیں۔

پارک کے ایک جانب بڑا اونچا ماربل سے بنا چبوترا بنا تھا۔ جہاں کچھ بزرگ عورتیں بیٹھیں قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھیں۔ مسرت واک کرتے ہوئے جب اس چبوترے کے پاس سے گزرتی تو سفید کپڑے میں ملبوس ایک عورت کو جو کہ تقریباً پچپن اور ساٹھ برس کے درمیان تھی، آہستہ آہستہ کہہ رہی ہوتی۔

''اے میری بہنو......! اور بیٹیو......! جب بات کرو، محبت سے، نرمی سے اور دھیمی آواز میں کرو......! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے بری گدھے کی آواز ہے۔''

اس عورت کی آواز اور چہرے میں نہ جانے کیسی کشش تھی کہ مسرت چند ساعتیں رُک کر نہ صرف اس کی بات سنتی......؟ بلکہ بغور اس کے پرُنور چہرے کو دیکھتی اور پھر واک شروع کر دیتی۔

ٹہلنے کے دوران ایک بار مسرت عقیدت کے ساتھ کھڑی اس کی بات سن رہی تھی کہ واک کرنے والی ایک عورت نے جس کے ساتھ روز پارک میں آنے کی وجہ سے مسرت کی ہلکی پھلکی دوستی ہو چکی تھی، اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

''ہمارے محلے کے مولوی کی بیوی ہے اور بہت لالچی عورت ہے۔''

اس چبوترے پر صرف وہی عورتیں بیٹھی ہوتی ہیں جنہوں نے منت وغیرہ مانی ہوتی ہے۔ یہ عورتوں سے کلامِ پاک بھی پڑھواتی ہے۔ اللہ کے کلام پاک کو پڑھنے سے کون انکار کر سکتا ہے......؟

ویسے بھی بڑی عمر کی بزرگ عورتیں واک کرنے کی بجائے چبوترے

پر بیٹھ کر تازہ ہوا کا مزہ لیتی اور معجزہ بھی سنتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لیٰسین بھی پڑھ لیتی ہیں۔

مگر مسرت کو کبھی کسی نے پڑھنے کے لئے نہیں بلایا۔ ویسے بھی اس کو گھر جلدی جانا ہوتا تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا کالج میں پڑھتا تھا اور اس کو ناشتہ دینا ہوتا تھا۔

مسرت بورے والا کے ایک دیہات کی رہنے والی تھی۔ چھ بھائیوں اور پانچ بہنوں میں اس کا دسواں نمبر تھا۔ صرف ایک بھائی ایوب اس سے چھوٹا تھا۔ ابھی صرف دو ہی بہنوں کی شادی ہوئی تھی کہ اچانک باپ مرگیا۔ صبح اچھا بھلا بیٹوں کے ساتھ کھیتوں پر گیا۔ وہاں بیٹوں سے باتیں کر رہا تھا کہ دل گھبرایا اور فوراً دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھکا، پھر زمین پر گر گیا۔ بیٹوں نے گھبرا کر اُٹھایا تو پتہ چلا باپ زمین پر گرتے ہی دُنیا چھوڑ گیا۔

اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ سب رو دھو کر چپ ہوگئے۔ تھوڑی سی زمین تھی، اور تین بھائی بھی جوان تھے۔ اس لئے کوئی مالی مشکل پیدا نہ ہوئی۔ یوں بھی جانے والے چلے جاتے ہیں، باقی دُنیا کے کام تو ویسے ہی چلتے رہتے ہیں۔

مسرت کی ماں نے بڑے آرام سے شوہر کے بعد باقی کی تین بیٹیوں کی نہ صرف شادیاں کیں بلکہ ساتھ ساتھ ایک ایک کر کے تین بڑے بیٹے بھی بیاہ دیئے۔

شوہر کی موت کے بعد تو کوئی مشکل پیدا نہ ہوئی لیکن اب جب گھر میں ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری بہو آئی تو تھوڑا ہی عرصہ سکون سے گزرا

پھر گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ کبھی کھانے پر، کبھی بچوں پر۔ جب روز روز جھگڑا ہونے لگا تو ماں سے پوچھے بغیر ہی زمین تقسیم ہوگئی۔

گھر خاصا بڑا تھا۔ اس خاصے بڑے گھر کے اندر چار چھوٹے چھوٹے گھر بن گئے۔ ان لڑائی جھگڑوں کے درمیان ہی چوتھے بھائی کی شادی بھی کر دی گئی۔ اب جب سب کے حصے الگ الگ بن گئے تو مسرت کے بڑے بھائی نے کہا۔

''ماں کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مسرت شادی ہونے تک دوسرے بھائی کے ساتھ رہے گی۔ جبکہ سب سے چھوٹا بھائی تیسرے بھائی کے ساتھ رہے گا۔ چوتھے بھائی کا ذکر اس لئے نہ ہوا کہ وہ شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ سسرال چلا گیا تھا۔ اس کی بیوی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں ان لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے بیمار پڑ گئی تھی۔ اس لئے بیٹے کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی مگر مسرت بہت انا پرست تھی۔ اس نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا۔

''ہمیں کسی کے ساتھ الگ رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تینوں ایک ساتھ رہیں گے۔''

چھوٹے بھائی نے بھی اس کا ساتھ دیا تو ماں مان گئی۔ یوں وہ دونوں بہن بھائی ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ گندم، چاول، سبزیاں گھر کی تھیں۔ کیش کی صورت میں تھوڑی بہت مدد شادی شدہ بہنیں کر دیتی تھیں۔ چھوٹا بھائی ابھی پڑھ رہا تھا۔

وقت یوں ہی گزرنے لگا۔ مسرت اکتیس برس کی ہو چکی تھی لیکن ابھی تک شادی نہ ہو سکی تھی۔ بہنیں اس کے لئے رشتہ تلاش کر رہی تھیں مگر کوئی اچھا رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ ماں تو اپنی بیماری، دوسرے مسرت کی شادی نہ ہونے کی وجہ سے بھی پریشان رہتی تھی۔ رات دن رو رو کے اللہ سے دُعا مانگتی۔

آخر اللہ نے ان کی دُعائیں سن لیں۔ ایک ساتھ تین رشتے آئے۔ ایک پولیس میں سپاہی تھا، دوسرا اپنے ہی گاؤں کا اسکول ماسٹر تھا اور تیسرا بینک میں کلرک تھا۔ ابھی بہنیں رشتہ دیکھ ہی رہی تھیں کہ بات طے ہونے سے پہلے ہی ماں مرگئی۔

یہ خوشی ان کی قسمت میں نہ تھی۔ ان کی موت پر دُور نزدیک کے سبھی رشتہ دار آئے تھے۔ ان سب میں مسرت کا وہ اکلوتا ماموں بھی شامل تھا جو لاہور میں رہتا تھا اور ان لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر بہن کی موت پر تو بہرحال آنا ہی تھا۔

اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ماں کی میت کے قریب بیٹھی روتی، بلکتی مسرت پر ان کو بے حد ترس آیا۔ پھر ترس کھا کر انہوں نے سوئم کے بعد لاہور واپس جانے سے پہلے اپنی بیوی سے بات کر کے مسرت کا رشتہ بڑے بیٹے قیوم کے لئے مانگ لیا۔ گو کہ مسرت کی ماں کی موت سے چند دن پہلے بھی مسرت کے لئے تین اچھے رشتے آئے تھے مگر بات فائنل ہونے سے پہلے ہی ماں منوں مٹی کے نیچے جا سوئی۔ حالانکہ مسرت چھوٹی بیٹی ہونے کی وجہ سے ان کی بہت لاڈلی تھی۔ مگر افسوس، مسرت کی خوشیاں ان کے نصیب میں نہیں تھیں۔

اب ماموں نے اپنے بڑے بیٹے کے لئے رشتے کی بات کی تو پہلے

والے تینوں رشتوں کو بھول کر فوراً ہی ان کو سوچے بغیر ہاں کر دی۔ اس کی ایک وجہ تو وہ سگے ماموں تھے، اس لئے انکار کرنا مناسب نہ تھا۔ دوسرے وہ حیثیت میں بھی ان سے بڑھ کر تھے اور تیسرے رہتے بھی لاہور میں تھے اور یہ تینوں باتیں بہت اہم تھیں۔

یہ رشتہ فائنل ہونے پر خاندان بھر میں تو کیا پورے محلے میں مسرت کی خوش بختی کے چرچے ہونے لگے۔ ساری فرینڈز مسرت کی خوش قسمتی پر رشک کر رہی تھیں۔ مسرت کو ماں کی موت کا بے حد دُکھ تھا لیکن لاہور شہر میں رشتہ ہونے پر بھی وہ بہت خوش تھی۔ بھائی بہن سب ہی خوش تھے اور بھابیاں اندر ہی اندر جل کر کوئلہ ہو رہی تھیں۔

پھر چہلم کے فوراً بعد اس کی شادی قیوم سے ہوگی۔ ماموں کے سامنے اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے بھائیوں نے بارات کا کھانا بھی ٹھیک ٹھاک دیا اور جہیز بھی۔ یوں مسرت بورے والا چھوڑ کر اپنے دُلہا کے ساتھ لاہور آ گئی۔

شادی کی رات پہلی مرتبہ مسرت نے اپنے دُلہا کو دیکھا اور حیران رہ گئی۔ اگرچہ وہ خوب لمبا تڑنگا اور گبرو جوان تھا مگر عمر بمشکل بائیس برس کے قریب تھی۔ مسرت کو پھر بھی وہ اچھا لگا۔ کیونکہ وہ اب اس کا شوہر بن چکا تھا۔ جبکہ مسرت اس وقت اکتیس برس کی تھی۔

شادی کا پہلا مہینہ تو جیسے پَر لگا کر اُڑ گیا۔ مسرت کو اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آتا تھا۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دُنیا چھوڑ کر جنت میں آ گئی ہو۔ شوہر چھوٹا ہونے کے باوجود اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ساس، نند بھی

اس کو بہت پیار کرتی تھیں اور اس کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔

صبح ہوتی تو دونوں میاں بیوی کو ان کے کمرے کے اندر ہی ناشتہ بھجوا دیا جاتا۔ ناشتہ بہت شاندار اور بے حد مزے کا ہوتا۔ کبھی حلوہ پوری، کبھی نان چنے، کبھی بونگ نان اور کبھی تلے ہوئے انڈے پراٹھے۔ اس طرح کا ناشتہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔

ناشتے کے بعد قیوم کام پر چلا جاتا اور مسرت اپنے کمرے کی صفائی کر کے باہر اپنی ساس اور نندوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتی جو ناشتے اور گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی ہوتیں۔ مسرت کرسی پر بیٹھی ان کو سبزی وغیرہ بناتے دیکھتی رہتی۔

گاؤں میں دوپہر کے کھانے کا تصور ہی نہیں تھا۔ تازہ سالن صرف رات کو ہی پکتا تھا۔ صبح ماں کنالی بھر آٹا گوندھتی اور تندور پر روٹیاں لگاتی۔ بڑی بہن تازہ مکھن کا کٹورہ لے کر پاس بیٹھ جاتی۔ ماں گرم گرم روٹیاں تندور سے نکال کر رکھتی جاتی اور بہن ایک ایک روٹی پر مکھن لگا کر ان کو اُوپر تلے رکھتی جاتی۔ کبھی اچار کے ساتھ اور کبھی رات کے بچے کھچے سالن کے ساتھ یا پھر مکھن مزید روٹی پر رکھ کر لسّی کے ساتھ ناشتہ کر لیا جاتا۔

یہ تھا گاؤں کے اکثر عام گھروں کا ناشتہ۔

یہاں تو مسرت نے کتنے ہی قسم کے ناشتے کھائے تھے۔ دوپہر میں روز تازہ کھانا پکتا۔ گوشت روزانہ ہر سبزی میں لازمی شامل ہوتا۔ رات کو بھی تازہ کھانا بنتا تھا۔ جو ہمیشہ دال چاول ہی ہوتے تھے اور دال بھی زیادہ تر چنے کی۔

مسرت رات کا کھانا گھر پر کم ہی کھاتی تھی۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ روزانہ کہیں نہ کہیں شادی کی دعوت ہوتی تھی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اللہ نے اپنی خاص رحمت کی، مسرت اُمید سے ہوگئی۔ یہ خوشی ان میاں بیوی کے علاوہ گھر والوں کے لئے بھی بہت اہم اور بڑی تھی۔ سبھی لوگ بے حد خوش تھے۔ مسرت کو کبھی کبھی یوں لگتا جیسے یہ کوئی خوب صورت خواب ہے۔

ٹھیک تین ماہ بعد یہ خواب ٹوٹ گیا، بکھر گیا۔

کیا ہوا......؟ کیسے ہوا......؟

مسرت کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ تو اب بھی ویسی ہی تھی مگر باقی سب لوگ ایک دم ہی بدل گئے تھے۔ شوہر بے حد غصے والا بن گیا تھا اور ساس، نندوں نے بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔

گو کہ وہ ماں بننے والی تھی، اس کے باوجود اس کو گھر کے کام کاج پر لگا دیا گیا۔ سارا دن ساس اور نندوں کی روک ٹوک اپنی جگہ، اگر کبھی اس کے منہ سے کچھ نکل جائے تو گھر آتے ہی ماں بہنیں مل کر اس کے شوہر کے کانوں میں نہ جانے کیسی پھونک مارتیں کہ وہ بغیر کچھ پوچھے بے رحمی سے اس کو مارنے لگتا، گلیاں دیتا۔

یہ اور بات ہے کہ رات ہونے کے وقت جب کمرے میں آتا تو خود ہی معافی مانگ کر صلح بھی کر لیتا اور مسرت بھی سب کچھ بھول جاتی۔ وہ اس کو چاہتا بھی بے حد تھا۔

شادی کا ایک سال مکمل ہونے سے پہلے ہی اللہ نے مسرت کو ایک

خوب صورت اور صحت مند بیٹے کی ماں بنا دیا۔ سارا خاندان بے حد خوش تھا۔ قیوم اس کا بے حد خیال رکھ رہا تھا۔ سوا مہینہ اسی طرح گزرا کہ مسرت کو پتہ بھی نہ چلا۔

چھلہ نہا کر وہ اپنے بڑے بھائی اور بھابی کے ساتھ گاؤں چلی آئی جو رسم کے مطابق اس کو لینے آئے ہوئے تھے۔

اس کو گاؤں آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ قیوم اسے لینے آگیا اور وہ بھی ہنستی مسکراتی چلی آئی۔

چند روز ہی سکون سے بیتے اور پھر وہی لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ اس کا بیٹا بابر تین ماہ کا تھا۔ جب مسرت کی بڑی بہن ملنے آئی۔ تب اس نے بہن سے کہا کہ وہ اس کی ساس سے بات کرے۔ گھر کے کام کاج میں لگی رہتی ہے اور بچہ روتا رہتا ہے۔ اگر کچھ کہہ دوں تو قیوم کے کان بھر کر مار لگواتی ہیں مجھے۔ ان س بولو یا تو گھر کے کام خود کریں یا پھر بچہ تو دادی گود میں لے کر بیٹھ ہی سکتی ہیں۔ وہ جھولے میں پڑا روتا رہتا ہے۔ کام کرتے کرتے بھاگ کر اس کو بھی ایک آدھ جھولا دے آتی ہوں۔ دودھ کے لئے روتا رہتا ہے اور میں کام میں لگی رہتی ہوں۔

مسرت کے کہنے پر اس کی بہن نے مسرت کی ساس یعنی اپنی مامی سے کہہ دیا۔

"سارا دن مسرت کام کرتی رہتی ہے اور بچہ روتا رہتا ہے۔ آپ گھر کے کام بے شک نہ کریں مگر بچے کو تو گود میں لے کر بیٹھ سکتی ہیں۔"
اس کی بات سن کر مسرت کی ساس نے کہا۔

"اگر بچہ مجھے ہی سنبھالنا ہے تو کام بھی پھر ہم خود ہی کر لیں گے۔ تمہیں زیادہ ہمدردی ہے تو بہن کو ساتھ لے جاؤ......!"

اور پھر اس کا تین ماہ کا بیٹا چھین کر اس کی بڑی بہن کے ساتھ گھر سے نکال دیا۔ قیوم اس وقت گھر پر نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو اسے کون سا مسرت کا ساتھ دینا تھا......؟ وہ تو ماں بہنوں کی باتیں سن کر بغیر کچھ بھی پوچھے اس کو مارنا شروع کر دیتا تھا۔

بہن نے اس کو چند روز اپنے گھر میں رکھا پھر بڑے بھائی کے گھر جا کر چھوڑ آئی۔ ایک دو ماہ تو یوں ہی بیت گئے۔ وہ ہر روز انتظار کرتی رہتی کہ دودھ پیتا بچہ چھوڑ کر آئی تھی۔ اس کا نہیں تو بچے کا خیال کر کے ہی کوئی اس کو لینے آئے گا۔ دودھ بہہ بہہ کر خود ہی خشک ہو گیا مگر اس کے سسرال سے جب کوئی بھی اس کو لینے نہ آیا تو بڑا بھائی خود ہی اس کو اس کے سسرال چھوڑنے چلا آیا۔ وہ بھی بھابیوں کی طنزیہ باتوں سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ اس لئے اپنی ساری انا بھول کر بغیر انکار کئے بچے کا خیال کر کے چلی آئی۔

قیوم اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اس کی واپسی پر نہ تو کسی نے اعتراض کیا اور نہ ہی خوشی کا اظہار۔ وہ سب کو سلام کرنے کے بعد اپنے بچے کی جانب بڑھی جو جھولے میں لیا آرام سے اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ صحت اس کی پہلے سے بھی زیادہ اچھی ہو چکی تھی۔ مسرت نے بے تابی سے جھک کر اس کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا تو وہ اونچی آواز میں رونے لگا کہ اس کا لمس بچے کے لئے اب نامانوس ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی ساس نے کہا۔

"یہ اب تمہارا نہیں، میرا بیٹا ہے اور میرا ہی رہے گا۔"

بچے کو مسرت سے لے کر اپنے گلے لگا لیا۔ جواباً پھر سے جھگڑا نہ ہو جائے، یہی سوچ کر وہ چپ رہی۔ دل میں سوچا رات شوہر سے بات کرے گی۔ رات پہلے تو اس نے شوہر سے اس کے نہ آنے پر شکوہ کیا۔

"وہ بس کیا بتاؤں......؟ کام کا زور زیادہ تھا۔"

اس نے یہ کہہ کر گویا بات ختم کر دی تو مسرت نے اپنے بیٹے کے بارے میں بات کی۔ مسرت کی بات سن کر قیوم نے کہا۔

"اگر امی نے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے تو ٹھیک ہے، اللہ تمہیں اور بیٹا دے دے گا۔"

اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی کہ وہ کہیں پھر خفا ہو کر اس کو گھر سے نہ نکال دے۔

پھر سے وہی زندگی تھی مگر نئے انداز میں سارے گھر کا کام پھر اس کے سپرد کر دیا گیا۔ سوائے کھانے کے۔ کھانا اس کی ساس خود بناتی تھی اور سبز مصالحہ سب نندیں مل کر بنا لیتی تھیں۔ ہاں اب کہ وہ مسرت کے بیٹے کی دیکھ بھال بھی خوب اچھی طرح کر رہی تھیں۔

قیوم نے کہا تھا۔

"اللہ تمہیں اور بیٹا دے دے گا۔"

اور اللہ نے شاید اسی وقت ہی اس کی دُعا نہ صرف سن لی تھی بلکہ قبول بھی کر لی تھی۔ وہ پھر اُمید سے تھی مگر قسمت میں آرام نہیں تھا۔

دوسری اولاد بھی اللہ نے اس کو بیٹے کی صورت میں ہی دی تھی اور بیٹا پا کر مسرت کا بڑے بیٹے کے لئے تڑپتا ہوا دل بہل گیا تھا۔ اب وہ ساس

نندوں کی تلخ باتیں سن کر جلتی کڑھتی نہیں تھی۔ وہ اپنا سارا دھیان ہر وقت اپنے بیٹے کی جانب رکھتی۔ تاہم اس کے باوجود جب قیوم ماں، بہنوں کے کہنے میں آ کر اس کو مارتا تو مسرت کو بے حد دُکھ ہوتا۔

دوسرے بیٹے کی پیدائش کے چند ماہ بعد پھر کسی بات پر جھگڑا ہوا اور اس کو پھر گھر سے نکال دیا گیا مگر اس بار یہ مہربانی ضرور ہوئی کہ دوسرے بیٹے کو اس کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔

وہ بیٹا لے کر ایک بار پھر بڑے بھائی کے گھر آ گئی۔ اب کی بار وہ چھوٹے بھائی ایوب کے ساتھ آئی تھی کیونکہ اس کی موجودگی میں ساس کی کسی بات کا جواب دینے پر بات بڑھی تھی۔ ماموں بھی اس وقت گھر پر موجود تھے۔ انہوں نے ایوب سے صاف صاف کہہ دیا کہ جاتے ہوئے اپنی بہن کو بھی ساتھ لیتے جانا۔ ماموں کے سامنے انکار کی جرأت کس کو تھی......؟ یوں وہ گاؤں چلی آئی۔

تاہم گاؤں آ کر مسرت نے گھر میں کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ پھر جھگڑا کر آئی ہے۔ کہا تو صرف اتنا کہ وہ بھائی بھابیوں سے ملنے آئی ہے۔ چھوٹے بھائی ایوب کو بھی راستے میں سمجھا دیا تھا کہ اصل بات کسی کو نہیں بتانا۔ پھر اللہ نے بھی اس کی عزت رکھ لی۔

اس کو گاؤں میں آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اس کی ساس کا اکلوتا بھائی مر گیا اور یوں مسرت کو واپس بلا لیا گیا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ بہو کو گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ مسرت بھی دل ہی دل میں اپنے ربّ کا شکر ادا کرتے ہوئے بھائیوں کے ساتھ چلی آئی۔

زندگی میں ابھی بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی جیسے پہلے تھی۔ ہاں مسرت نے خود کو اس زندگی کا عادی بنانا شروع کر دیا تھا۔

پھر اللہ کے فضل سے وہ تیسرے بیٹے کی ماں بھی بن گئی اور تیسرے کی پیدائش پر بھی چند ماہ بعد پھر کسی بات پر لمبا جھگڑا ہو گیا۔ اتفاق سے پھر مسرت کی بڑی بہن آئی ہوئی تھی۔ مسرت کی ساس نے کہا۔

"جاتے ہوئے اپنی اس زبان دراز بہن کو بھی لیتی جانا اور پھر کبھی یہاں مت بھیجنا......!"

مگر مسرت نے ہمت کر کے بہن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

اب وہ سمجھ چکی تھی۔ یہ تو ساری زندگی کا رونا ہے۔ پھر خواہ مخواہ بھائی بہنوں کو پریشان اور خود کو رُسوا کرنے کا فائدہ......؟

یوں بہن اس کی حالت پر کڑھتی ہوئی چلی گئی۔

شوہر ایک تو مسرت سے دس برس چھوٹا تھا، دوسرے وہ ماں بہنوں کی بات سنتے ہی بغیر اس کو کچھ پوچھے مارنے لگتا۔ وہ جب سے بیاہ کر اس کے گھر آئی تھی، تب سے شادی کے لئے اس کی نندوں کے رشتے دیکھے جا رہے تھے لیکن ابھی تک بات بنی نہیں تھی۔ شاید اپنا رشتہ طے نہ ہونے پر ہی نندیں تپی تپی پھرتی تھیں۔

چار نندیں تھیں مسرت کی، صرف ایک قیوم سے بڑی تھی۔ بس وہی شادی شدہ تھی۔ باقی تینوں نندیں جوان تھیں لیکن ابھی تک والدین کے گھر حسرت کی تصویر بن کر بیٹھی تھیں۔ اب جب مسرت کی بہن روتی ہوئی چلی گئی تو مسرت نے اپنے اندر ہمت پیدا کر کے اپنی ساس اور نندوں سے خود ہی

نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی ساس نندوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے لگی کہ بغیر جواب دیئے بھی جب مار کھانی ہے تو کیوں نہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر کھائی جائے۔ ساس کو تو وہ ذرا کم کم جواب دیتی لیکن جب کوئی نند بات کرتی تو فوراً مسرت تنک کر کہتی۔

"مجھے معلوم ہے تم سب کیوں تپی پھرتی ہو......؟ اور کیوں مجھ سے لڑائی جھگڑا کرتی ہو......؟ اس لئے ناں کہ میری شادی ہو چکی ہے اور تم ابھی تک والدین کے سینے کا بوجھ بن کر بیٹھی ہو......؟ چلو تمہاری اب تک بات طے نہ ہو سکی تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم گھر سے بھاگ کر خود کسی کے ساتھ چلی جاؤ۔ شادی نہیں تو نہ سہی، نکل تو سکتی ہو۔"

ساس اور نندیں اس بات پر بھڑک اُٹھتیں اور پھر قیوم کے آنے پر نہ صرف بات بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی بلکہ ساتھ یہ بھی کہا جاتا۔

"پوچھو اس سے، اس نے یہ سب کہنے کی جرأت کیسے کی......؟"

شوہر کے پوچھنے پر مسرت ہر بات سے مکر جاتی۔ ایسی بدمزاج نندوں کو وہ ایسے ہی تپانا چاہتی تھی۔

وقت یوں ہی گزرتا رہا اور مسرت چوتھے بیٹے کی ماں بن گئی۔ چوتھا بیٹا بڑی قسمت والا تھا۔ وہ ابھی مسرت کے پیٹ میں تھا کہ دو پھوپھیوں کے رشتے طے ہو گئے اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ پیدائش کے بعد مسرت کی دو نندوں کی ایک ساتھ ایک ہی گھر میں شادی ہو گئی۔

مسرت نے ان دونوں کے جانے کے بعد سکھ کی سانس لی۔ اب گھر میں ایک نند اور دو دیور ہی رہ گئے تھے۔ دیور نہ مسرت کو اچھا کہتے تھے، نہ

برا۔ وقت یوں ہی گزرتا گیا۔

آخری نند بھی بیاہی گئی۔ آخر میں دونوں دیوروں کی شادی ہوئی اور ان کی شادی ہوتے ہی مسرت کو الگ کر کے گھر کا پچھلا حصہ دے دیا گیا۔

اب مسرت کی اپنی زندگی تھی۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ مسرت کو ساس سے الگ ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ خدا نے اس کو پانچویں اولاد کی صورت میں بیٹی سے نوازا۔

قیوم بیٹی پا کر بیٹے سے بھی زیادہ خوش تھے اور بھائی بھی منی سی بہن پا کر بے حد خوش تھے۔ دوسری طرف نئی دُلہنوں نے چند ماہ تو مسرت کے بیٹے کو جیسے تیسے برداشت کیا پھر اعتراضات شروع ہوگئے کہ جب اس کی اپنی ماں زندہ ہے تو یہ اس کے پاس جائے۔ ہمارے یہاں کیوں پڑا ہے......؟

ساس نے پہلے کی طرح زبان چلانی چاہی تو بیٹوں نے بھی بیویوں کا ساتھ دیا۔ بات زیادہ بڑھی تو قیوم خود ہی جا کر اپنے بیٹے کو لے آیا اور بات ختم ہوگئی۔

مسرت کی ساس اس دن پہلی بار اس کے سامنے جی بھر کر روئی تھیں۔ اب اس کو مسرت کی قدر محسوس ہوئی۔ انہوں نے مسرت سے معافی مانگی۔ مسرت نے بھی ان کو معاف کر دیا اور پہلے کی طرح ان کی عزت کرنے لگی۔

نندیں بھی اب اس کے ساتھ پیار و محبت کرنے لگی تھیں۔ مسرت بھی پچھلی سب باتیں بھول گئی۔ سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک چند ماہ بیمار رہ کر مسرت کی ساس مرگئی۔

ماں کی موت کے چند ہفتوں بعد ہی قیوم اپنے گھر اور بیوی بچوں کو بھول کر اپنے سے چھوٹی عمر کی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا۔

مسرت کو شادی کے بعد پہلی بار جب ساس نندوں کی جانب سے سکون ملا تو قیوم نے اس کے اس سکون کو غارت کر کے رکھ دیا۔ وہ کئی کئی دن گھر نہیں آتا تھا اور نہ ہی یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ کہاں ہے......؟

گھر آنے پر جب مسرت پوچھتی تو وہ بجائے جواب دینے کے اس کو مارنے لگا۔ اگر بیٹے مداخلت کرتے تو اسی وقت پھر گھر سے چلا جاتا۔ مسرت دن رات اس کوشش میں تھی کہ پتا چلے کون ہے وہ لڑکی جس کے ساتھ آج کل قیوم رہ رہا تھا......؟

آخر ایک دن پتہ چل ہی گیا کہ وہ لڑکی ضرور ہے مگر ہے چار بچوں کی ماں بھی ہے، اور یہ کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے چکی ہے اور اب قیوم سے شادی کرنے والی ہے۔ یہ سنتے ہی کہ وہ جلد قیوم سے شادی کرنے والی ہے، وہ خود اس لڑکی کے گھر کی تلاش میں نکل پڑی۔ بڑے بیٹے کو پتا چلا تو اس نے ڈانٹ کر کہا۔

”خبردار جو ابو کی تلاش میں آپ پھر گھر سے نکلیں......؟ میں ہوں ناں......! کما کر لانے کے لئے......!“

مسرت نے بیٹے کو کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے دل کو قرار کہاں تھا......؟ وہ بیٹے سے چھپ کر مسلسل اس لڑکی کے گھر کی تلاش میں رہی اور آخرکار لڑکی کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ پھر اپنی بڑی نند کو ساتھ لے کر وہ اس کے گھر گئی اور جاتے ہی چلا چلا کر کہنے لگی۔

''میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی......!''

''میں کیوں پیچھا چھوڑ دوں......؟ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ہم شادی کرنے والے ہیں۔ تم بوڑھی عورت ہو، تم کیوں نہیں ہم دونوں کا پیچھا چھوڑ دیتی......؟''

اس لڑکی نے بھی مسرت سے زیادہ چلا کر کہا تو مسرت کی نند کو غصہ آ گیا اور اس نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو ذلیل......! بے غیرت لڑکی......! وہ تم سے کبھی شادی نہیں کر سکے گا۔''

لڑکی نے مسرت کی نند کی بات سن کر کہا۔

''باجی......! آپ تو مجھے گالی نہ دیں۔ آپ کے لئے جیسی وہ بھابی ویسی میں......!''

''ارے......! وہ ہماری بھابی ہے، ہم اس کو اپنے ہاتھوں سے بیاہ کر لائے تھے اور تو اس کی برابری کر رہی ہے......؟''

مسرت کی نند نے پھر غصے سے کہا۔

''وہ بھابی ہے تو میں بھی آپ کی بھابی بننے والی ہوں۔''

لڑکی کا یہ کہنا تھا کہ مسرت اس پر جھپٹ پڑی اور بالوں سے پکڑ کر اس کی خوب پٹائی کی۔ اتنی طاقت نہ جانے اس وقت اس کے اندر کہاں سے آ گئی تھی......؟ اور پھر شادی نہ کرنے کی دھمکی دے کر وہ اپنے گھر چلی آئی۔

رات میں جب نند اپنے گھر جا چکی تھی تب قیوم گھر آیا اور آتے ہی

مسرت کو پکڑ کر مارنے لگا۔ خوب جی بھر کر مارنے کے بعد بولا۔

''پھر کبھی اس کی طرف گئی تو جان سے مار دوں گا تجھے......! بوڑھی......! مائی......! اپنی شکل دیکھ ذرا......! تو جانتی ہے محبت کیا ہوتی ہے......؟ یہ تو مجھے اب پتا چلا ہے......!''

اتنا کہہ کر وہ تو چلا گیا اور مسرت گم سم بیٹھی یہ سوچتی رہی کہ یہ پانچ بچے محبت کے بغیر ہی پیدا ہو گئے......؟ وہ دوبارہ ریحانہ کے گھر نہ جا سکی۔ بس وہ اپنے گھر بیٹھی اپنے شوہر کے بارے میں سوچتی رہتی۔

قیوم ریحانہ سے شادی نہ کر سکا کیونکہ ریحانہ کو قیوم سے زیادہ امیر بندہ مل گیا تھا۔ ایسی عورتوں کو صرف پیسوں سے محبت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ قیوم کی بہنوں سے خائف بھی تھی۔ اپنے شوہر کے گھر واپسی پر مسرت کا دل تو کیا روح بھی جھوم اُٹھی تھی۔ اس نے شوہر کو کچھ بھی جتائے بغیر اس کی ساری مار، ساری باتیں بھول کر پھر سے قبول کر لیا۔

ایک بار پھر وہ مکمل طور پر خوش تھی مگر خوشی کا یہ عرصہ بہت مختصر تھا۔ حالات سے جنگ، مسلسل جنگ کر کر کے، اس کا وجود نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ اس کی ساس کو دمہ کی شکایت تھی۔ وہ اکثر اپنا جھوٹا مسرت کو دے دیا کرتی تھی اور مسرت انکار نہ کرتی تھی۔ اب ڈاکٹر نے اُسے بتایا تھا کہ اس کو بھی دمہ کی شکایت ہو چکی ہے۔ دمہ کی شکایت کے ساتھ وہ شوگر کی مریض بھی بن چکی تھی۔ ڈاکٹر نے مسرت کے شوہر سے کہا تھا۔

''آپ ان کو پریشان نہ ہونے دیں۔ دوائیں باقاعدگی سے لینے کے ساتھ ساتھ صبح کی واک بلاناغہ شروع کرا دیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر کی ہدایت پر مسرت نے روزانہ قریبی پارک میں جانا شروع کر دیا تھا۔ اس واک کا اس کی صحت اور طبیعت پر خاصا خوش گوار اثر پڑا تھا۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا کہ رات بڑے بیٹے کو قیوم ڈانٹ رہا تھا کہ وہ چند روز سے گھر لیٹ کیوں آ رہا ہے......؟ تب نہ جانے کیسے مسرت کے منہ سے نکل گیا۔

”وہ تو جوان لڑکا ہے، باہر دوستوں میں بیٹھا ہوگا۔ تم خود پانچ بچوں کے باپ ہو کر گھر کا راستہ ہی بھول گئے تھے۔“

اس کی بات سنتے ہی قیوم بگڑ گیا اور اس نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

”دوبارہ یہ بات کبھی نہ کہنا ورنہ ایک بار پھر راستہ بھول جاؤں گا تمہارے گھر کا۔ مرد کو راستہ بھولتے دیر نہیں لگتی......!“

پھر وہ کتنی دیر تک بولتا رہا۔ مسرت تو مارے خوف کے خاموش رہی۔

رات دو بجے منڈی جاتے ہوئے وہ ہر روز مسرت کا کندھا آہستگی سے دبا کر کہا کرتا تھا۔

”دروازہ بند کر لو میں جا رہا ہوں۔“

آج رات اس نے مسرت کا کندھا دبا کر اس کو دروازہ بند کرنے کا نہیں کہا تھا۔ یعنی وہ پھر سے خفا ہو گیا تھا۔ مسرت کی آنکھ حسب معمول خود ہی کھل گئی تھی۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ بند کیا، پھر وضو کر کے تہجد کی نماز پڑھنے لگی۔

نماز پڑھ کر وہ تب تک وہیں جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہی جب

تک فجر کی اذان نہیں ہو گئی۔ فجر کی نماز پڑھ کر وہ جائے نماز تہہ کر کے اُٹھی۔ سب سے پہلے پانی میں رکھا ہوا سالن والا برتن نکال کر سالن گرم کیا کہ کہیں خراب نہ ہو جائے۔ فریج ابھی تک مسرت کے گھر کا مقدر نہ بنا تھا۔ پہلے قیوم جو کماتا تھا، اپنی ماں کو دے دیتا تھا۔ پھر لڑکی کے چکر میں پڑ کر ساری کمائی ضائع کر دی۔ اب اس نے مسرت کے کہنے پر وعدہ کیا تھا کہ اگلی گرمیوں میں فریج لازمی لا دے گا۔

سالن گرم کرنے کے بعد اس نے آٹا گوندھا اور پھر خود واک کرنے گھر سے نکل آئی۔ بچے ابھی سو رہے تھے۔ آنے کو تو وہ پارک میں آ گئی تھی مگر دل بے چین تھا۔ وہ سوچوں میں گم ٹہلتی رہی اور سوچتی رہی۔

اس کی لائف کے خوش گوار لمحے یا دن کون سے تھے......؟ تب اس نے محسوس کیا کہ بچپن کے بعد وہی دن خوش گوار تھے۔ جب باپ زندہ تھا یا پھر شادی کے پہلے تین ماہ۔ اس کے بعد جو بے سکونی شروع ہوئی تو وہ ابھی تک مکمل طور پر ختم نہ ہو سکی۔

وہ سوچوں میں گم ٹہلتی رہی اور ٹائم گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اور جب احساس ہوا تو وہ جلدی سے گھر کی طرف چل دی۔ وہ جیسے ہی چبوترے کے قریب پہنچی تو دیکھا مولوی کی بیوی چبوترے سے نیچے اُتر کر روش کے قریب کھڑی تھی۔ مسرت اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے اسے اسی مخصوص نرم لہجے میں پکارا۔

”اے بہن......! بات سنو......! یٰسین شریف پڑھنی ہے، ایک عورت کم ہے، آؤ......! آپ پڑھ دو......!“

اللہ کا کلام پاک پڑھنے سے کون انکار کرسکتا ہے......؟ مسرت بھی منہ سے کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چبوترے پر چلی آئی۔ یٰسین شریف بہتر بار پڑھی گئی۔ پھر نیاز سامنے رکھ کر دُعا ہوئی اور دُعا ختم ہوتے ہی مولوی کی بیوی نے گلاب جامنوں والا ڈبہ بند کر کے ایک طرف رکھا اور خود ایک ایک یٰسین شریف چوم کر کپڑے کے غلاف میں رکھنے لگی جو کہ وہ اپنے گھر سے لے کر آتی تھی۔ مسرت کچھ دیر اس کو دیکھتی رہی پھر دیر ہونے کا خیال کر کے بولی۔

"آپا......! پہلے مجھے تبرک دے دو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

مگر اس عورت نے جیسے سنا ہی نہیں۔ مسرت نے محسوس کیا کہ یٰسین شریف چوم چوم کر غلاف میں رکھنے میں عقیدت کم اور اس بات کی کوشش زیادہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت لگے اور جتنی زیادہ عورتیں جا سکتی ہیں، وہ چلی جائیں۔

صبح کے وقت سبھی کو گھر جانے کی جلدی ہوتی ہے اور یہی ہوا۔ عورتیں ایک ایک کر کے جانے لگیں تو مسرت نے اس عورت کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آپا......! سب عورتیں جا رہی ہیں۔ پہلے نیاز تقسیم کر دیں۔ یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔"

مسرت کی بات سن کر عورت نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گھور کر مسرت کو دیکھا۔ پھر پھاڑ کھانے والے لہجے میں چیخ کر کہا۔

"دُعا ختم ہوتے ہی تم لالچی عورتوں کو کھانے کی پڑ جاتی ہے۔ دکھائی نہیں دیتا میں یٰسین شریف غلاف میں رکھ رہی ہوں......؟"

مسرت نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بغور اس عورت کو دیکھا۔ اس

کا وہ چہرہ جو بہت پرُنور لگا کرتا تھا، اس وقت دیکھنے والا تھا۔ عورت کی پیشانی اور بھنویں غصے میں آنکھوں پر جھک آئی تھیں جس کی وجہ سے آنکھیں برائے نام ہی نظر آ رہی تھیں جبکہ ناک اور اوپر کا ہونٹ اس نے اوپر کی جانب چڑھا لئے تھے جس کے باعث وہ اپنے سانولے رنگ کی وجہ سے اس وقت عورت کی بجائے چڑیل لگ رہی تھی۔ اس پر اس کی کرخت اور تلخ آواز ابھی تک مسرت کی سماعتوں میں تلخی پیدا کر رہی تھی مسرت نے حیرت سے سوچا۔

کیا یہ وہی عورت ہے جو روزانہ کئی بار پارک میں آنے والی عورتوں اور لڑکیوں سے یہ بات کہتی ہے......؟

"پیاری بہنو...... ! جب بات کرو، محبت سے، نرمی سے اور دھیمی آواز سے۔ یاد رکھو، سب سے بری آواز گدھے کی ہے۔"

مسرت نے بے یقینی سے ایک بار پھر اس کو دیکھا۔ وہ ابھی تک شکل بگاڑے یٰسین شریف چوم چوم کر غلاف میں رکھ رہی تھی۔ اب مسرت اس کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ وہ یقیناً یہی چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ عورتیں چلی جائیں اور وہ ساری نیاز گھر لے جائے۔ مسرت چپکے سے چبوترے سے اُتری تو سامنے پارک والی دوست کھڑی تھی۔ مسرت کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

"میں نے کہا تھا، بہت لالچی عورت ہے۔ یہاں روز یہی ہوتا ہے۔"

مسرت جواباً کچھ بھی کہے بغیر گھر کی طرف چل دی۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔ قیوم بھی گھر آ کر ناشتہ کرتا تھا۔ وہ رات سے ہی خفا تھا۔ اب ناشتے میں دیر ہونے پر نہ جانے کیا قیامت ڈھائے گا......؟

ابھی وہ راستے میں ہی تھی کہ سامنے سے قیوم آتا دکھائی دیا۔ مسرت

اس کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

''اللہ خیر کرے......! یہ میرے پیچھے کیوں آیا ہے......؟''

تاہم جب قیوم اس کے قریب آیا تو یہ گھبراہٹ سکون میں بدل گئی۔

قیوم نے اس کے قریب آتے ہی بے قراری سے پوچھا۔

''دیر کیوں کر دی......؟ میں تو پریشان ہو کر تمہارے پیچھے چلا آیا کہ کہیں تمہاری طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟''

قیوم نے بے حد محبت اور نرمی سے پوچھا اور مسرت سکون کی گہری سانس لیتے ہوئے بتانے لگی کہ دیر کیوں ہوئی......؟ ساری بات سن کر قیوم نے کہا۔

''اللہ کا کلام پاک پڑھنا ثواب کا کام ہے۔ نیاز ضروری نہیں......! باقی ناشتے کی تم فکر نہ کرو۔ میں حلوہ پوری لے آیا ہوں۔''

پھر لہجے میں مزید محبت بھر کر بولا۔

''مسرت......! رات میں نے جو کچھ کہا اس کے لئے مجھے معاف کر دو......! میری بکواس کرنے کی پرانی عادت ہے۔ آخر جاتے جاتے ہی جائے گی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا تمہارے سکون کا خیال رکھوں اور تمہیں پریشان نہ ہونے دوں اور میں نے رات بھر تمہیں پریشان رکھا۔ لیکن اب وعدہ ہے پھر کبھی ایسا نہیں ہوگا۔''

مسرت کا ہاتھ تھام کر گھر کی طرف چل دیا۔ مسرت نے سوچا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔

''ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا۔''

''شاید اس لئے اکثر انسانوں کی ساری زندگی مشقت میں گزر جاتی ہے اور اس ڈھیروں مشقت کے بعد بھی اگر راحت اور سکون مل جائے تو بہت بڑی بات ہے۔''

یہی سوچتے ہوئے وہ قیوم کے ساتھ گھر پہنچ گئی۔ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اب یہ راحت اس کا بھی مقدر بنے گی، ہمیشہ کے لئے......!



غموں کے صحرا میں دردِ زندگی

کہتے ہیں امیر لوگ اس وقت بھی خدا کو یاد کرنا گوارہ نہیں کرتے جب خدا انہیں ڈھیروں خوشیوں سے نوازتا ہے۔ اور تو اور اگر خدا کے نام پر کبھی کچھ دیتے بھی ہیں تو محض اخبار میں تصویر بنانے کے لئے یا پھر شہرت حاصل کرنے کے لئے۔ ورنہ امیر وہ تو ہمیشہ خدا کے دُور ہی رہتا ہے۔

اس کے برعکس یہ غریب لوگ جنہیں خدا کی نعمت دیکھنے کو نہیں ملتی، جو امیر لوگ دیکھتے ہیں، اور ان کے نصیب میں تو وہ بڑی بڑی خوشیاں بھی نہیں ہوتیں جو چوبیس گھنٹے امیروں کے گھر ڈیرہ جمائے رکھتی ہیں۔ لیکن جب کبھی خدا غریب کو چھوٹی سی خوشی سے بھی نوازتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرتے نہیں تھکتا۔

شاید اسی لئے خدا نے دُنیا میں امیر کم اور غریب زیادہ پیدا کئے۔ تا کہ کچھ لوگ تو اسے سچے دل سے یاد کرنے والے ہوں گے اور ایسی ہی ایک چھوٹی سی خوشی اللہ تعالیٰ نے یوسف میاں کے گھر کو بخشی تھی اور وہ لوگ سوچ ہے تھے خدا کا شکر ادا کریں تو کیسے......؟

چشمہ کو ابھی تک اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی باجی اتنے بڑے گھر کی بہو بن رہی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ چونکہ آج کے اس دور میں اچھے رشتوں کی تلاش بھی ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ خاص کر غریب لوگوں کے لئے۔ خدا خدا کر کے چشمہ نے سارا کام ختم کیا اور جب اپنے کمرے میں جانے لگی تو ماں کے کمرے سے آئی ہوئی باتوں کی آواز سن کر وہیں رُک گئی۔

''آؤ چشمہ بیٹی......!''

اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر یوسف میاں نے پیار سے پکارا اور پھر اس کے تھکے تھکے چہرے کو دیکھ کر بولے۔

''آج تو ہماری بیٹی کام کرتے کرتے تھک گئی۔''

''نہیں ابو جی......! خوشی کے مارے مجھے تھکن کا احساس ہی نہیں ہوا۔''

''اور کیا......؟''

چشمہ کی امی بولیں۔

''اتنی مشکل سے تو اچھا رشتہ ملا ہے پھر تھکن کیسی......؟ یہ تو خوشی کا اور شکر کا مقام ہے۔''

''ہاں بھئی......! یہ سب تو اللہ کا کرم ہے۔''

یوسف میاں نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''اس کے گھر میں دیر ہے، اندھیر نہیں انسان کو کبھی بھی خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بے شک اس نظریں سب پر ہوتی ہیں۔''

"شاید اس لئے مایوسی کو گناہ کہا گیا ہے۔"

جمیلہ بیگم نے کہا تو چشمہ نے تائید میں سر ہلا دیا۔

چشمہ بے انتہاء خوش تھی اور خوش کیوں نہ ہوتی......؟ بہت تلاش وجستجو کے بعد نجمہ کی منگنی اچھی جگہ ہو پائی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پہلے اچھے رشتے نہیں آتے تھے۔ بہت اچھے اچھے رشتے آئے تھے۔ مگر ساتھ میں فرج، کلر ٹی وی، اے سی اور واشنگ مشین کی فرمائش اور چشمہ کے گھر والوں کی حیثیت اتنی نہ تھی کہ وہ سب فرمائش پوری کرتے۔

یوسف میاں ایک مل میں ملازم تھے۔ دو ہی بیٹیاں، نجمہ بڑی اور چشمہ چھوٹی اور آخری اولاد ایک بیٹا تھا، شاہد۔

نجمہ نے صرف میٹرک کیا تھا جبکہ چشمہ انٹر میں اور شاہد میٹرک میں۔

اچھی خاصی گزر بسر ہو رہی تھی۔ مگر اب نجمہ کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ رشتوں کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر لوگ لڑکی کے ساتھ جہیز مانگتے تھے جو چشمہ کے والدین کے پاس نہیں تھا۔

چشمہ حیرت سے سوچتی۔

"کیا واقعی ایسا زمانہ آگیا ہے کہ لوگ منہ پھاڑ کر سب کچھ مانگنے لگے ہیں......؟"

"نہیں......!"

وہ اپنے دل میں سوچتی۔

"یہ سب چکر تو رشتہ کروانے والی چلاتی ہیں۔ بھلا لوگ انسانیت کے رشتے سے اتنا تو نہیں گر سکتے......؟"

یہ اس کی اپنی معصوم سوچ تھی۔ شاید وہ لوگوں کو ابھی اتنا گرا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اور یہ شاید اس کی دُعا کا ہی اثر تھا جو نجمہ کا رشتہ اچھے گھر میں ہو گیا تھا ورنہ خود نجمہ کا خیال تھا کہ جہیز کے بغیر کوئی اچھا رشتہ نہ مل سکے گا۔ آج کل تو جن کے لڑکے کلرک ہیں، ان کا دماغ بھی آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ مگر چشمہ اس بات پر یقین نہ کرتی تھی اور آج حقیقت اس کے سامنے تھی۔

"دیکھئے باجی......! آج بھی دُنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو بغیر کسی لالچ کے شادی کرتے ہیں۔"

چشمہ نے کہا تو نجمہ سر ہلا کر مسکرا دی۔

نجمہ کی منگنی ہو جانے سے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ یوسف میاں مل میں اوور ٹائم کرنے لگے تھے۔ تاکہ اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دے سکیں۔ منگنی ہوتے ہی ان لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ ہر ہفتہ ان کے گھر کوئی نہ کوئی آجاتا تھا۔

نجمہ کی دو نندیں تھیں اور ایک دیور جو اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن جانے والا تھا اور اسی بہانے وہ ہر ہفتہ چلا آتا۔ کہتا یہی تھا کہ میں تو شادی میں شرکت بھی نہ کر سکوں گا۔ اس لئے آپ سے ملنے چلا آتا ہوں۔

یہ تو وہ نجمہ سے کہتا مگر بات تو کچھ اور ہی تھی۔ جلد ہی نجمہ بھی اس کی آمد و رفت کا مطلب سمجھ گئی کہ وہ چشمہ کی وجہ سے آتا ہے۔ اگرچہ چشمہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر طاہر بہانے بہانے سے اسے بلاتا رہتا۔ کبھی کہتا آؤ چشمہ......! کیرم کھیلیں۔ کبھی لڈو۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی چشمہ مسکراتے ہوئے آتی اور دانت پیش کر

بیٹھ جاتی۔ مگر آج تو ویسے اس کا موڈ آف تھا۔ کیونکہ کالج سے وہ ہاکی کا میچ ہار کر آ رہی تھی۔ اس لئے طاہر سے بات کرنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ طاہر نے اسے متوجہ کرنا چاہا۔

''چشمہ......!''

اس نے سرگوشی میں پکارا۔

چشمہ نے ہربڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ طاہر نے اسے متوجہ کرنا چاہا۔

''چشمہ......!''

اس نے سرگوشی میں پکارا۔

چشمہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ طاہر اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ چشمہ کے آنکھیں کھولتے ہی شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ذرا یہ تو بتانا کون سا چشمہ ہے......؟''

اس نے چشمہ کی جانب اُنگلی کرتے ہوئے پوچھا۔

''آنکھوں کی ٹھنڈک پہنچانے والا یا......''

چشمہ نے گھور کر اسے دیکھا تو بات اُدھوری رہ گئی۔

''اسی طرح قہر آلود نظروں سے نہ گھورو......!''

طاہر ہنستے ہوئے بولا۔

''اچھا چلو، یہ بتاؤ......! میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے......؟''

چشمہ جل کر رہ گئی۔

''برائے مہربانی آپ اپنے ہونے والی بھابی سے باتیں کیا

کیجئے......!''

''میں آج کل سنجیدگی سے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والا ہوں۔ کیونکہ جب سے تمہیں دیکھا ہے......''

بات اُدھوری چھوڑ کر وہ چپ ہو گیا۔ کیونکہ نجمہ کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ نجمہ کھانا لے کر آ گئی۔

''بھابی......! پلیز......! ایک گلاس پانی......''

نجمہ کو کھانا رکھتے ہی بولا تو نجمہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ گویا اس کا مقصد سمجھ رہی ہو۔ جاتے جاتے بولی۔

''تم نہ بھی کہتے تو پانی تو مجھے لانا ہی تھا......؟''

چشمہ بغور باجی کو دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں جل کر کباب ہو رہی تھی۔

نجمہ کے جاتے ہی طاہر سنجیدگی سے بولا۔

''سنو چشمہ......! یہ حقیقت ہے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔''

''یو شٹ اَپ......!''

چشمہ پہلی بار غصے سے بولی۔

''میں کسی فلم کی ہیروئن نہیں، ایک شریف گھرانے کی بیٹی ہوں۔ جہاں ایسی باتیں سوچنا بھی گناہ ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے وہ فوراً کمرے سے باہر چلی گئی۔

کچھ دن بعد ہی طاہر اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلا گیا۔ جانے سے قبل وہ پھر چشمہ سے ملنے آیا اور کہا۔

"چشمہ......! اگرچہ میں باہر جا رہا ہوں۔ مگر تمہاری یاد سے ایک لمحہ بھی غافل نہ رہ سکوں گا اور مجھے یقین ہے میرے وطن واپس آنے پر تم مجھے ریسیو کرنے ضرور آؤ گی......!"

اور پھر وہ چشمہ کا جواب سنے بغیر ہی چلا گیا۔ چشمہ کتنی ہی دیر تک اس کی دیوانگی پر ہنستی رہی تھی اور پھر کچھ دن بعد اس واقعہ کو بالکل بھول گئی۔ طاہر کے جانے کے کچھ ماہ بعد ان لوگوں نے اچانک شادی کی تاریخ مانگ لی۔

چشمہ کے امتحان میں دو ماہ باقی تھے۔ چشمہ کے ابو نے کہا بھی کہ

"چشمہ کے امتحان ختم ہو جائیں، پھر شادی کی تاریخ رکھیں گے۔"

لیکن وہ لوگ نہ مانے اور شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ چشمہ پڑھائی بھی کرتی رہی اور کام بھی۔ آج کل ان کے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ مگر اچانک ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی۔

شادی سے ایک ہفتہ قبل نجمہ کی ساس اور سسر ان کے گھر آئے۔ ہمیشہ کی طرح ان کی خاطر تواضع کی گئی اور کھانے پینے کے بعد وہ لوگ اصل مقصد کی طرف آئے۔ نجمہ کی ساس بولی۔

"ہاں تو بہن......! کیا کیا دے رہے ہیں آپ لوگ جہیز میں......؟"

"ہماری حیثیت ہی کیا ہے......؟ پھر بھی جو ہم سے ہو سکا ہے ہم نے کر دیا ہے۔"

جمیلہ بیگم نے نہایت عاجزی سے کہا۔

"پھر بھی، بتانے میں کیا حرج ہے......؟"

نجمہ کی ساس نے پوچھا تو جمیلہ نے مختصراً ان کو سب کچھ بتا دیا۔ جہیز کی تفصیل سنتے ہی ساس صاحبہ اصلی روپ میں آگئیں۔

"ارے بی بی......! یہ جہیز ہے کیا......؟ کم از کم ہماری حیثیت کا تو خیال کیا ہوتا......؟ ارے......! اتنا سامان تو لوگ منگنی پر دے دیتے ہیں......؟"

"پر بہن......! آپ لوگوں کو ہماری حیثیت سے اچھی طرح واقفیت تھی۔ اگر آپ لوگوں کو یہ سب لینا تھا تو کوئی اپنے جیسا ڈھونڈ لیا ہوتا......؟ ہم تو یہی کچھ دے سکتے ہیں۔"

جمیلہ بیگم نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ لوگ سمجھنے والے کہاں تھے......؟

"اب بھی کیا بگڑا ہے......؟ ہم تو اب بھی اپنے جیسا ڈھونڈ لیں گے۔ بس آپ لوگوں کا خیال آتا ہے۔ خیر......! میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کروں گی۔ اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ مقررہ دن آپ کے گھر بارات آئے تو کان کھول کر سن لیں......!

فرج، کلر ٹی وی اور واشنگ مشین تو آج کل ایرے غیرے دیتے ہیں۔ باقی رہی گاڑی، اے سی اور وی سی آر......؟ تو وہ آپ کی حیثیت دیکھ کر میں نہیں مانتی۔ البتہ گاڑی کی جگہ موٹر سائیکل ضرور دیں......! اگرچہ یہ چیزیں جہیز میں شامل نہیں کریں گے تو اپنی بیٹی کو لے کر بیٹھے رہئے گا۔"

ساس صاحبہ اپنا لمبا چوڑا لیکچر دے کر خاموش ہوگئیں اور جمیلہ بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

’’یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بہن......؟‘‘

جمیلہ نے سسکی بھری۔

’’کچھ تو خدا کا خوف کریں......! ہم لوگ غریب ہیں، یہ سب کہاں سے لائیں گے......؟‘‘

جمیلہ بیگم بہت کچھ کہتی رہی۔ مگر یوسف میاں خاموش بیٹھے رہے۔ شاہد، نجمہ اور چشمہ بھی ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ جمیلہ بیگم کے سمجھانے پر نجمہ کی ساس نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا اور خشک لہجے میں بولیں۔

’’یہ کام تمہارے سوچنے کا ہے، ہمارے سوچنے کا نہیں......؟ اگر ہاں کرتی ہو تو بارات آجائے گی ورنہ......‘‘

انہوں نے دانستہ بات اُدھوری چھوڑ دی۔

’’بھائی صاحب......! آپ ہی کچھ کیجئے ناں......؟‘‘

جمیلہ بیگم نے نجمہ کے سسر سے کہا تو وہ دھیمے لہجے میں مگر سختی سے بولے۔

’’ہم کیا کر سکتے ہیں......؟ یہ عورت کی ترقی کا دور ہے۔ عورت اگر اپنی انہیں بیہودہ حماقتوں کو عقلِ مندی سمجھتی ہے تو مرد بے چارہ کیا کر سکتا ہے......؟ حالانکہ ہمیشہ عورت ہی عورت کے راستے کی دیوار بنی ہے اور الزام مرد پر آیا ہے۔‘‘

انہوں نے اپنی بات ختم کی تو یوسف میاں خاموش نہ رہ سکے۔

’’سنئے بھائی صاحب......! یہ کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں......! ہماری عزت کا سوال ہے۔ آپ لوگ عین وقت پر تو ہمیں بے عزت مت

کریں......!‘‘

مگر وہ لوگ ضرورت سے زیادہ ذلیل نکلے۔ بس ایک ہی رٹ لگا دی۔

’’اگر یہ سب منظور ہے تو ٹھیک ہے......! ورنہ رشتہ ٹوٹا ہی سمجھیے......!‘‘

نجمہ کی ساس اور سسر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاہد اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گیا کہ وہ بہن کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اگر وہ پڑھنے کی بجائے بچپن ہی سے کسی کام پر پڑ گیا ہوتا تو آج ان لوگوں کے مطالبے پورے کر سکتا تھا۔

نجمہ کی ساس سسر کمرے سے باہر نکل گئے۔ مگر شاہد نے کسی فلمی ہیرو کی طرح اُٹھ کر ان کا راستہ نہیں روکا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ لوگ دو دن کی مہلت دے کر کمرے سے نکل گئے۔

شاہد نے ماں باپ کے چہرے پر ایک دُکھتی نظر ڈالی اور دوسری نجمہ کے چہرے پر جس کا رنگ سرسوں کے پھول کی مانند ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ اس کا سب کچھ چھین کر لے گئے ہوں۔ سہانے سپنے، خوب صورت زندگی کا خواب، اب برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

وہ اُٹھا اور صحن میں جا کر نجمہ کے ساس سسر کے قدموں میں گر گیا۔

’’خدا کے لئے آنٹی......! ایسا ظلم مت کیجئے......!‘‘

وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح بلکنے لگا۔

’’آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ ہمیں اس طرح ذلیل مت کیجئے......!‘‘

"سنولڑکے......!"

نجمہ کی ساس نخوت سے بولی۔

"اگر تم لوگ بارات چاہتے ہو تو ہمیں پرسوں بتا دینا......!"

"مگر آنٹی......! ہم یہ سب کہاں سے کریں گے......؟"

"مجھے اس سے کیا مطلب......؟ جہاں سے مرضی کرو......!"

چشمہ جو سب کچھ بڑے ضبط سے برداشت کر رہی تھی، چیخ کر آگے بڑھی۔

"اُٹھو شاہد......! پیر انسانوں کے پکڑے جاتے ہیں۔ جانوروں کے نہیں......! ایسے لوگوں سے تو رشتہ داری جوڑنا بھی بے عزتی ہے، جو انسانیت سے اتنا گر چکے ہوں......؟"

نجمہ کی ساس نے گھور کر چشمہ کو دیکھا اور دندناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

چشمہ شاہد کو لے کر اندر آئی اور ماں باپ سے مخاطب ہوئی۔

"امی......! ابو......! آپ کیوں پریشان ہیں......؟ باجی کے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ دُنیا میں اگر ان جیسے ذلیل لوگ ہو سکتے ہیں تو اچھے لوگ بھی ضرور ہوں گے......!"

"تم کچھ نہیں جانتی چشمہ......!"

جمیلہ نے نجمہ کی طرف دیکھا مگر نجمہ کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے اُٹھ گئی اور چشمہ اس کے اس طرح اُٹھ جانے پر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

دو دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ ان دو دنوں میں نجمہ نے کھانا کھانا تو دُور کی بات، پانی کو بھی چھو کر نہ دیکھا۔ گھر میں انسانوں کے ہوتے ہوئے

بھی قبرستان سی خاموشی اور گہرا سکوت چھایا رہتا۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد یوسف نے گھر بیچنے کا فیصلہ کیا۔ چشمہ نے سنا تو احتجاج کیا۔

"امی جان......! جہاں ایک بار سب کچھ ختم ہو جائے، وہاں دوبارہ عزت نہیں ہوتی۔ جن لوگوں نے باجی کی عزت نہیں کی، وہ سامان کی کیا کریں گے......؟ اور پھر ایسے لوگوں کے مطالبات مان کر ان کی حوصلہ افزائی کرنا، بری بات ہے۔ اس لئے تو یہ برائی آج تک ختم نہیں ہو سکی۔"

چشمہ نے ماں باپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر نجمہ جب سب کچھ دیکھ کر بھی چپ رہی تو چشمہ بھی خاموش ہوگئی۔ جلد بازی میں مکان کی قیمت کم لگی۔ مگر پھر بھی نجمہ کا جہیز پورا ہوگیا اور یوسف میاں نے مالک مکان سے کہا۔

"بیٹی کی شادی تک انہیں وہیں رہنے دیں۔"

نجمہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ یوں نجمہ تو رُخصت ہوگئی مگر گھر میں کچھ نہ بچا۔ بلکہ گھر بھی نہ رہا۔ چشمہ کا مارے غصے کو برا حال تھا۔

وہ سوچ رہی تھی۔

"اگر نجمہ باجی خود شادی سے انکار کر دیتی تو یوں ماں باپ کو گھر سے بے گھر نہ ہونا پڑتا......؟"

دوسرے دن ولیمہ تھا۔ مگر غصے کی وجہ سے چشمہ نہ گئی۔ ولیمہ والے دن وہ لوگ شام کو آئے اور رات کو ہی واپس چلے گئے اور یوں دوسرے دن ان لوگوں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔

اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑتے ہوئے شاہد اور چشمہ ہی نہیں، خود

جمیلہ بیگم اور یوسف میاں بھی رو دیئے۔ گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے چشمہ نے اپنے دل میں یہ عہد کیا۔

"چاہے اسے کچھ بھی کرنا پڑے، اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے، وہ یہ گھر دوبارہ حاصل کرلے گی۔"

وہ لوگ کرائے کے گھر میں آ گئے تھے۔ چشمہ کے انٹر کے امتحان شروع ہوئے مگر ذہنی پریشانی کی وجہ سے وہ امتحان میں نہ بیٹھی اور ان سب باتوں کا قصور وار وہ نجمہ کو سمجھتی تھی جو کرائے کے مکان میں ایک بار بھی ان سے ملنے نہ آئی تھی۔ ماں دو تین بار سارے لینے بھی گئی مگر مایوس ہی لوٹ آئیں۔

شادی کو تین مہینے ہو چکے تھے۔ جب جمیلہ بیگم کی طبیعت اچانک خراب ہوئی۔ انہوں نے شاہد سے کہا وہ جا کر بہن کو لے آئے۔ زندگی کا کیا بھروسہ......؟ ماں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے شاہد نجمہ کو لینے چلا گیا۔

جب وہ نجمہ کے گھر پہنچا تو وہاں پہلے سے ہی ایک ہنگامہ برپا تھا۔ نجمہ کی ساس اور شوہر اس سے جھگڑ رہے تھے۔ نجمہ نہ صرف رو رہی تھی بلکہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"تم لوگوں کو اگر معلوم تھا کہ تمہارے نیک صاحبزادے پہلے سے شادی شدہ ہیں تو اسے دوبارہ بیاہنے ہمارے گھر کیوں آئے......؟ میرے باپ نے اپنا گھر اور سکون بیچ کر مجھے یہ زندگی دی۔ لیکن مجھے یہاں ایک پل بھی سکون کا نصیب نہیں ہوا۔ اگر تم شادی شدہ تھے تو انکار کر دیتے۔ یوں مجھے بھی دُکھی نہ ہونا پڑتا۔ اور نہ میرے ماں باپ بے گھر ہوتے......؟"

"تو اب بھی کیا بگڑا ہے......؟"

نجمہ کی ساس چیخی۔ اسی اثناء میں شاہد آ گیا اور نجمہ کا شوہر بولا۔

"بہتر ہوگا تم اپنے بھائی کے ساتھ چلی جاؤ......! میں تمہیں بعد میں طلاق بھجوا دوں گا۔"

شاہد نے یہ سب سنا تو چکرا کر رہ گیا۔

"باجی......! کیا بات ہوئی ہے......؟"

نجمہ نے اسے مختصر طور پر حالات سے آگاہ کیا اور پھر روتے ہوئے بولی۔

"میرے پیارے بھائی......! میری جان......! تم واپس چلے جاؤ......! اپنے لئے جہنم کا انتخاب میں نے خود کیا تھا۔ اپنے کئے کی سزا مجھے تو ملنی ہے۔ مگر میں لوگوں کو بھی زندگی اجیرن بنا دوں گی۔ ان لوگوں کو ایسا سبق سکھا دوں گی کہ آئندہ کوئی کسی کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ نہ کر سکے گا۔ جاؤ......! میرے بھائی......! میری طرف سے میری دُکھی ماں باپ کو اور لاڈلی بہن کو آخری سلام کہنا......!"

شاہد کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ واپس مڑا تو نجمہ کی ساس بولی۔

"سن اے لڑکے......! اپنی بہن کو بھی ساتھ لے جاؤ......!"

"نہیں نہیں......! میں نہیں جاؤں گی۔"

نجمہ حلق کے بل چیخی تو نجمہ کے شوہر نے اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ نجمہ روتے ہوئے چیخنے لگی۔

"شاہد......! میرے بھائی......! تجھے میری جان کی قسم......! تم چلے جاؤ......! میں ان لوگوں کو سبق ضرور سکھاؤں گی۔"

شاہد بڑی مشکل سے اپنے بے جان جسم کو گھسیٹتا ہوا باہر تک لایا۔ مگر اب اپنے بس میں نہ تھا۔ سڑک کے درمیان چلتے ہوئے وہ صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔

"ماں باپ نے اپنا گھر اُجاڑ کر بیٹی کا گھر بسایا۔ مگر وہ پھر بھی نہ بس سکا۔ انہوں نے نجمہ کی خوشیوں کے لئے کتنے یقین کے ساتھ یہ جوا کھیلا۔ مگر افسوس سب کچھ داؤ پر لگا کر ہار گئے۔"

انہی خیالوں میں گم وہ اپنے آس پاس اُبھرنے والی وہ چیخیں بھی نہ سن سکا جو اسے وین کے سامنے آتا دیکھ کر اُبھری تھیں۔

اور پھر پلک جھپکتے ہی وہ سب کچھ ہوگیا جس کا جمیلہ بیگم نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وین والا شاہد کو کچل کر فرار ہوگیا اور شاہد نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔

یوں وہ بہن کے گھر کا آنکھوں دیکھا حال ماں کو نہ بتا سکا۔ چشمہ کے گھر والوں پر جیسے قیامت ٹوٹ گئی۔ وہ لوگ تو گھر کا چراغ بجھتے ہی جیتے جی مر گئے۔

نجمہ کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو اسے جیسے سکتہ ہوگیا اور جب ہوش آیا تو اپنے کمرے میں بند ہو کر مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لی اور کسی قسم کی مدد ملنے سے قبل ہی بھائی کی طرح جل بسی۔

یہ دونوں صدمے چشمہ کی قوت برداشت سے باہر تھے، وہ جو اپنے

ہوش وحواس سے بے گانہ ہوئی تو بھائی کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی۔

جمیلہ بیگم کو اب صرف اور صرف چشمہ کی فکر تھی۔ تقدیر نے جو مذاق ان کے ساتھ کیا تھا، اس پر تو ان لوگوں نے صبر کر لیا تھا مگر اب تو چشمہ ہی ان کی زندگی کا آخری سرمایہ تھی اور یہ ماں باپ کی دُعاؤں کا اثر تھا جو چشمہ ایک بار پھر نارمل ہوگئی تھی۔

وہ جب گھر آئی تو ڈاکٹر نے جمیلہ بیگم سے کہا تھا اس کی ہر خواہش پوری کی جائے جو کرنا چاہے اسے کرنے دیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو وہ پھر پہلے والی حالت میں آ سکتی ہے۔

جمیلہ بیگم اور یوسف میاں اب بھلا اسے کیسے روک ٹوک کر سکتے تھے......؟ جبکہ اب آخری پونجی وہی تھی۔ وہی ان کی نگاہوں کا مرکز تھی۔



چشمہ بہت دیر سے رکشہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اچانک ایک کار اس کے قریب رُکی، چشمہ نے لاپرواہی سے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سیاہ لباس میں ملبوس کھڑکی سے سر باہر لٹکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اگر آپ کو لفٹ کی ضرورت ہو تو......"

اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

چشمہ نے سرسری نظر سے اسے دیکھا اور ایک شانِ بے نیازی سے چہرے پر آئے ہوئے بال پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

"لگتے تو شریف خاندان کے ہو......!"

"جی ہاں......! اس لئے آپ کو تنہا دیکھ کر گاڑی روک لی۔ کیونکہ میں تو شریف خاندان کا ہوں۔ مگر یہ دُنیا شریف خاندان کی نہیں، اور رات گئے ایک تنہا لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں......؟ آپ اس سے واقف تو ہوں گی......؟"

اس نے چشمہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بات مکمل کی۔

"تھوڑی سی اگر آپ اور محنت کریں تو ایک اچھے مقرر بن سکتے ہیں۔ باقی رہی میری تنہائی کی بات تو مسٹر......! میں اس دُنیا سے اچھی طرح نپٹ سکتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھنا چاہا تو اجنبی باہر نکل کر راستہ روکتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ خطرات سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو آیئے......! میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

چشمہ نے صرف ایک سیکنڈ کے لئے سوچا پھر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر یوں بیٹھ گئی جیسے اجنبی اس کا ڈرائیور ہو۔

"شکریہ......!"

اجنبی نے اسے گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر کہا اور گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"نام بتانے میں کوئی حرج تو نہیں......؟"

اجنبی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے نام چھپانے یا بتانے میں کوئی حرج نہیں......؟ مجھے

چشمہ کہتے ہیں۔"

"چشمہ......!"

اجنبی نے زیرلب اس کا نام دہرایا۔ پھر شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"اچھا اب یہ بھی وضاحت کر دیجئے، آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا یا......"

اور چشمہ لرز کر رہ گئی۔ یک دم طاہر کا سراپا آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

"وہ بھی تو یہی کہتا تھا۔"

چشمہ سوچ میں ڈوب گئی۔

"آپ نے بتایا نہیں......؟"

اجنبی نے پھر پوچھا تو چشمہ چونک کر بولی۔

"آپ شاید میرے سگریٹ پینے پر حیران ہو رہے ہیں......؟"

اجنبی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ بلیک پتلون، وائٹ شرٹ اور شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ سگریٹ نوشی کرتے ہوئے وہ کوئی اچھی لڑکی نظر نہ آ رہی تھی۔ اس کا جائزہ لے کر وہ خشک لہجے میں بولا۔

"جو لڑکی آدھی رات کو اس لباس میں گھوم سکتی ہے، وہ سگریٹ نوشی تو کیا......؟ کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بولا۔

"ویسے اتنی رات گئے آپ یہاں کیا کر رہی تھیں......؟"

"لفٹ لینے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ذاتیات پر سوال کئے جائیں۔ آپ نے تو اپنا نام بھی نہیں بتایا۔"

"مجھے عروج کہتے ہیں......!"

اجنبی نے کہا۔

"آپ بھی عروج کہہ کر پکار سکتی ہیں۔"

اس کے بعد دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ چشمہ راستہ بتاتی گئی اور عروج خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

گھر سے تھوڑی دُور چشمہ نے گاڑی رُکوائی اور اتراتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کسی کے بارے میں اس وقت تک کوئی رائے مت قائم کرو، جب تک اسے اچھی طرح سمجھ نہ لو، جان نہ لو۔"

پھر "تھینک یو مسٹر عروج......!" کہتی ہوئی وہ گلی میں گم ہوگئی اور عروج حیران سا اس کے فقرے پر غور کرتا رہ گیا۔

چشمہ جب گھر آئی تو ماں باپ سو چکے تھے۔ لیکن یہ چشمہ کی بھول تھی۔ جمیلہ بیگم ابھی تک جاگ رہی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ آج ہمیشہ کی طرح انہوں نے چشمہ سے کھانے کا نہ پوچھا تھا۔ چشمہ نے بھی ماں باپ کو سوتے دیکھا تو اطمینان سے اپنے کمرے میں آگئی۔

"رات تم کس وقت آئی تھی......؟"

جمیلہ بیگم نے لسّی کے گلاس کو اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"رات مجھے کچھ دیر ہوگئی تھی ماں......! پر آپ میری فکر نہ کریں۔"

چشمہ نے اطمینان سے جواب دیا تو جمیلہ بیگم برداشت نہ کر سکی۔

"چشمہ......! رات میں خود تیری تلاش میں گئی تھی۔ بیٹی......! تم نہیں جانتی زمانہ کتنا خراب ہے......؟ بھلا پارک میں کوئی رات اتنی دیر تک بھی گھومتا ہے......؟ اور اگر تم پارک میں ہی جاتی ہو تو رات مجھے ملی کیوں نہیں......؟ خدا کے لئے چشمہ......! ہماری مجبوریوں کا ناجائز فائدہ مت اُٹھاؤ......!"

وہ رو دینے کو تھی۔

"امی جان......!"

چشمہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چشمہ ہوں، امی جان......! چشمہ، شاہد یا نجمہ باجی نہیں ہوں۔ دُنیا بہت بری ہے ماں......! لیکن میں اس سے بھی زیادہ بری ہوں۔ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے والے شخص کو میں جہنم رسید کر دوں گی۔ آپ میری فکر نہ کریں۔"

وہ غصے سے تن تناتی ہوئی باہر نکل گئی اور جمیلہ بیگم دل ہی دل میں کچھ سوچنے لگی۔ ماں کی سرزنش کا چشمہ پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔

دراصل شروع شروع میں اس نے کچھ خوف محسوس کیا تھا۔ مگر پھر روز آنے جانے سے اور خاص کر جمی سے دوستی ہو جانے کی وجہ سے اس کا خوف کم ہوگیا تھا اور وہ باقاعدگی سے کلب جانے لگی تھی۔

آج جمی کی برتھ ڈے پارٹی کا انتظام کلب کے خوب صورت لان میں کیا گیا تھا۔ دس بجے تک وہ اس ہنگامہ میں رہی پھر اچانک کچھ سوچ کر بولی۔

”جمی......! آج تم چھ بجے سے یہاں موجود ہو۔ جبکہ آج تمہاری برتھ ڈے ہے۔ گھر میں تمہارے منتظر ہوں گے۔ جاؤ اب گھر چلے جاؤ......!“

”نہیں چشمہ......! میں گھر نہیں جاؤں گا۔“

جمی نے اُداس ہو کر کہا۔

”تم کچھ نہیں جانتی چشمہ......! کبھی بھی تو نہیں......!“

”کیوں جمی......؟ تمہیں اپنے ماں باپ، بہن بھائی اور گھر کا کچھ خیال نہیں......؟“

”اس دُنیا میں گھر بڑی مشکل سے بنتے ہیں چشمہ......! اور اگر گھر بن جائیں تو لوگ اسے سلامت نہیں رہنے دیتے۔ کبھی میرا بھی ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ لیکن بہت چھوٹا، اتنا چھوٹا کہ میری ماں کو بالکل پسند نہ تھا۔ میری ماں بہت خوب صورت تھی لیکن میرا باپ ایک تو عام سی شکل وصورت کا تھا، دوسرا غریب۔ اس لئے میری ماں کو ناپسند تھا اور بالآخر اس نے میرے باپ سے طلاق لے کر ایک امیر آدمی سے شادی کر لی۔

ایک بات تو بتاؤ چشمہ......! کیا خوب صورت عورتیں صرف محلوں میں اچھی لگتی ہیں......؟ حالانکہ کنول تو ہمیشہ کیچڑ میں ہی کھلتا ہے......؟ اس کے باوجود لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ میرا باپ میری ماں کو بہت چاہتا تھا۔ اس لئے ماں کی خوشی کی خاطر اسے طلاق دے دی۔ لیکن مجھے کسی طرح بھی خود سے جدا کرنے کو تیار نہ ہوا۔ لیکن میری ماں نے مقدمہ کیا اور دولت کے بل بوتے پر جیت گئی۔ میرا باپ میری جدائی کو برداشت نہ کر سکا اور اللہ کو پیارا ہوگیا۔ میں اگرچہ اس وقت سات آٹھ برس کا تھا لیکن مجھے ہر بات اچھی

طرح یاد ہے۔

میں اپنے نئے باپ کے گھر آ گیا۔ لیکن نہیں، وہ گھر نہیں، صرف اور صرف ایک بہت بڑا بنگلہ تھا۔ اب تقدیر کا ستم دیکھو، میرے نئے باپ کو خدا نے اولاد سے محروم رکھا اور یوں وہ مجھے بے انتہا چاہنے لگا۔ لیکن مجھے تو کسی سے کوئی پیار نہیں......!

چشمہ......! میں اسے کیسے باپ سمجھ لوں جس نے مجھ سے میرا باپ چھینا......؟ میرا گھر چھینا......؟ اگرچہ مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں، ہر سال مجھے نئے ماڈل کی گاڑی ملتی ہے، میں جتنی رقم چاہوں لے لیتا ہوں۔ اس کے پیسے کو بے دریغ خرچ کر رہا ہوں مگر اس کے باوجود سکون نہیں......!“

”تم ٹھیک کہتے ہو جمی......! آج کی دُنیا میں انسان کی نہیں، دولت کی قدر کی جاتی ہے۔“

پھر چشمہ نے اپنے بارے میں بھی اسے سب کچھ بتا دیا۔ جمی نے دُکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔

”چلو چھوڑو ان باتوں کو......! چلو کچھ دیر اور بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

چشمہ بیٹھ گئی۔

عروج نے بل کی رقم میز پر رکھی اور ایک الوداعی نگاہ دوستوں پر ڈالی۔

”اچھا بھائی......! میں تو چلا۔ امی حضور کا حکم ہے، دس بجے گھر پہنچ جانا۔“

جواب سنے بغیر وہ گھوم کر صدر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ مگر اچانک اس کے قدم رُک گئے۔ اس نے حیرت سے چشمہ کو دیکھا۔ تیز روشنی میں اس کے چہرے کے خدوخال بہت نمایاں نظر آ رہے تھے۔

عروج کو اسے پہچاننے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگا۔ ہال کا یہ ایک مخصوص کونہ تھا جو بآسانی لوگوں کی نظروں میں نہیں آتا تھا۔ اس مخصوص حصے میں صرف جوئے کے شوقین کھلاڑی آتے تھے۔ عروج بے ساختہ اس کونے میں جہاں چشمہ بیٹھی ہوئی تھی، پہنچ گیا تھا۔

چشمہ نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا اور بولی۔

''شریف خاندان یہاں کیسے......؟''

اس کے لہجے میں طنز واضح تھی۔

''تمہیں اس سے کیا......؟''

عروج نے بغور اسے دیکھا۔ براؤن پینٹ شرٹ میں ملبوس سگریٹ پیتے ہوئے وہ خواہ مخواہ بال جھٹک رہی تھی۔

چشمہ نے جواب دینے کی بجائے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

''اچھا بھئی جمی......! میں چلتی ہوں۔ وقت بہت ہو گیا ہے۔''

پھر اس نے عروج کی طرف دیکھا اور صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ عروج اس کے سینڈل کی آواز دیر تک اپنے کانوں کے قریب محسوس کرتا رہا۔

دوسرے دن کلب پہنچ کر چشمہ نے اپنے مخصوص انداز میں آواز

لگائی۔

''گڈ ایوننگ ایوری باڈی......!''

اگلے ہی لمحے وہ چونک پڑی۔ عروج اس کی میز پر براجمان تھا۔ چشمہ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور بیٹھ گئی۔ وہ عروج سے لاتعلق مشروب پیتی رہی۔ چونکہ آج جمی نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ کھیلنے کی بجائے جلدی گھر واپس آ گئی۔

اگلے روز وہ عروج کی وجہ سے کلب نہیں گئی۔ نہ جانے کیوں وہ عروج کو دیکھ کر نروس ہو جاتی تھی......؟ حالانکہ اس نے اپنی زندگی ایک خاص اُصول کے تحت گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک ہفتہ بعد وہ کلب آئی تو عروج بادستور اس کی میز پر موجود تھا۔ اس کے اتنے دن نہ آنے کی وجہ سے عروج نے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ سن کر اسے دُکھ ہوا تھا۔

''تم پھر یہاں......؟''

چشمہ نے اسے دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

''مجھ سے آپ کو کوئی دُشمنی ہے جو آپ یوں بگڑ رہی ہیں......؟''

عروج نے مسکرا کر ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے افسوس ہوگا، اگر شریف خاندان بگڑ گیا......؟ باقی آپ کی مرضی......!''

چشمہ کرسی گھسیٹ کر بولی۔

''تو پھر لائیے دوستی کا ہاتھ......!''

عروج نے ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں......!''

چشمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''چشمہ......! اسے بھی اپنی ٹیم میں شامل کر لیتے ہیں۔ بہت اچھا ہے بے چارہ......!''

جمی نے کہا تو چشمہ ہنس کر بولی۔

''اچھا تو ہے مگر بے چارہ کدھر سے ہے......؟''

اس کی بات پر قہقہہ پڑا اور یوں عروج ان کے حلقے میں شامل ہو گیا اور وہ رات باتوں کی نظر ہو گئی۔

عروج نہ صرف روز کلب آنے لگا تھا بلکہ کھیلنے بھی لگا تھا۔ چشمہ نے شروع شروع میں ایک دو بار اس کو منع کیا کہ وہ کلب نہ آیا کرے، مگر جب عروج نے کہا۔

''تم کلب چھوڑ دو تو میں بھی چھوڑ دوں گا۔''

تو چشمہ اس سے لاپرواہ ہو گئی تھی۔ جبکہ عروج چاہتا تھا کہ وہ اپنی پہلی والی دُنیا میں لوٹ جائے مگر یہ ناممکن بات تھی۔

''کیا تم کلب چھوڑ سکتی ہو......؟''

ایک دن عروج نے پوچھا تھا۔

چشمہ نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا اور تلخی سے بولی۔

''کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو......؟ اگر یہ بات ہے تو چلتے پھرتے نظر آؤ......! یہاں تمہاری دال نہیں گلے گی۔''

''چشمہ......! میرے احساسات سمجھنے کی کوشش کرو......! مجھے غلط مت سمجھو......! میں تمہیں اس دُنیا سے نکال کر عزت کی زندگی دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں زندگی کی ہر آسائش دوں گا۔ چھوڑ دو یہ سب کچھ، کیا رکھا ہے ان باتوں میں......؟''

''نہیں عروج......! میں یہ زندگی نہیں چھوڑ سکتی۔ تم کس عزت کی بات کرتے ہو......؟ یہ لفظ بے معنی ہے اس کے مفہوم سے تو کوئی بھی آشنا نہیں۔ آئندہ میرے سامنے ایسی باتیں مت کرنا......!''

عروج کچھ کہنے کی بجائے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''جمی ابھی تک نہیں آیا۔ خدا خیر کرے......!''

چشمہ نے فکرمندی سے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آج میز پر وہ دونوں تنہا تھے۔ عروج نے نیم وا آنکھوں سے اس سے اس کی طرف دیکھا اور چشمہ کاندھے اُچکا کر آگے بڑھ گئی۔ عروج کو اس کا انکار سن کر خوشی ہوئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

''آؤ چشمہ......! تمہیں ڈراپ کر دوں......!''

عروج نے پیش کش کی جسے مسترد کرتے ہوئے چشمہ بغیر شکریہ ادا کیے اُتر گئی۔

روز و شب اسی طرح بیت رہے تھے۔ جمیلہ بیگم چشمہ کو ہلکے پھلکے انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتی۔ مگر کھل کر کبھی بات نہ کی تھی اور یوسف میاں کو تو کسی بات کا پتہ ہی نہیں تھا۔ یوں بھی وہ لوگ جلدی سو جانے کے عادی تھے اس لئے چشمہ کے آنے جانے کا پتہ کم ہی چلتا اور پھر جھارو کی راتیں تو

یوں بھی زیادہ تر کمروں میں ہی دبکے گزرتی ہیں۔

دو دن سے چشمہ کی طبیعت خراب تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کلب میں موجود تھی۔ کارڈ کھیلتے کھیلتے اچانک جمی بولا۔

''ہرن مینار چلتے ہیں......!''

''اس وقت......؟''

چشمہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت نہیں......! کل چلیں گے۔ ہمیں کلب سے باہر بھی گھومنا پھرنا چاہئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے جوا اور جوا ہی کھیلتے رہیں....؟ ویسے اس پروگرام کو میں آخری شکل دے چکا ہوں اور تمام اخراجات بھی میں خود ہی برداشت کروں گا۔''

جمی نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

''کچھ ترس کھاؤ اپنے اوپر......! اور اپنے گھر والوں کے اوپر......!''

چشمہ نے سمجھایا۔

''اگر یہ بات ہے تو تم کیوں نہیں خود پر ترس کھاتی......؟ اور اس ماں پر بھی جو پہلے ہی بہت صدمے جھیل چکی ہے......؟ چشمہ......! اگر تم یہ سب کچھ چھوڑ دو تو میں بھی تمہاری بات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''بات اگر میری ہوتی تو میں اتنے بڑے ظرف کی مالک ہوں۔ تم نہیں جانتے، بغیر قصور کہ تم دُنیا والے مجھے سنگ سار بھی کر دو تو خدا کی قسم......! میں ایسی ہوں کہ مرنے سے پہلے تم سب لوگوں کو معاف کر دوں گی۔ مگر بات میرے بھائی کی ہے جو اس خاندان کا آخری چراغ تھا جسے بجھنے

پر مجبور کر دیا گیا۔ بات میری بہن کی ہے جس نے اچھی زندگی کی خاطر شادی کی اور کیا قصور تھا ان کا......؟ جس کی انہیں اتنی بڑی سزا ملی......؟

نہیں جمی......! میں معاف نہیں کر سکتی۔ اگر میں ان لوگوں کو معاف کرتی ہوں تو مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ میرا کوئی بھائی نہیں جو ان سب باتوں کا انتقام لیتا۔ تم ہی بتاؤ......! کیا قصور تھا ہمارا جو ہمارا دن کا چین اور رات کا سکون چھین گیا......؟ اور ان سب باتوں کے انتقام کے لئے مجھے گھر کی چار دیواری سے باہر آنا پڑا......؟

میں ایک شریف زادی سے جوارن بن گئی۔ کیوں جمی......؟ صرف اس لئے کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے......؟ میں نے کچھ وعدے کچھ عہد اپنے ساتھ کئے تھے جن کو پورا کرنے کے لئے مجھے پیسوں کی ضرورت ہے اور یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ زندگی کی ہر خوشی ہارنے کے بعد میں جوّے کی بازی کبھی نہیں ہاری۔''

''یہی سلسلہ میرے ساتھ بھی ہے چشمہ......! اگر میرا باپ زندہ ہوتا تو میں یہ زندگی کبھی بھی نہ اپناتا۔ مگر اب میں اپنے باپ کا انتقام لے رہا ہوں۔ باقی اگر تم بھائی نہ ہونے کی وجہ سے ان راستوں پر آئی ہو تو میں بھی تمہارا بھائی ہوں۔ تم واپس گھر کی چار دیوار میں چلے جاؤ......! باقی سب میں دیکھ لوں گا۔''

''نہیں جمی......! تم بھی تو اپنے باپ کی آخری نشانی ہو......!''

''چھوڑو ان باتوں کو......! یہ بتاؤ......! صبح کس وقت جانا ہے......؟''

عروج نے موضوع بدلا۔

"صبح دس بجے چلیں گے۔ کیوں چشمہ......؟"

جمی نے پوچھا اور طبیعت خراب ہونے کے باوجود حامی بھر لی۔ شاید وہ اپنے آپ کو بھی اذیت دینا چاہتی تھی۔

دوسری صبح چشمہ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی۔ بخار کی وجہ سے اس کے زرد چہرے پر قدرتی سرخی پھیل گئی تھی۔ جمیلہ بیگم ایسی حالت میں اسے جانے کی اجازت نہ دے رہی تھی۔ مگر وہ ضد کر کے چلی آئی۔

تمام لوگ انتہائی خوشی سے ہنستے گاتے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ موسم خوب صورت تھا۔ سردیوں کی نرم دُھوپ خوب چمک رہی تھی۔

ہرن مینار جو کہ شہنشاہ جہانگیر کے پالتو ہرن کی یادگار ہے، کبھی یہ جہانگیر کی شکار گاہ تھی۔ لیکن آج لوگوں کے لئے تفریح کا مقام ہے اور دُور دُور سے لوگ پکنک منانے یہاں آتے ہیں اور خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہرن مینار لاہور سے شمال مغرب کی جانب پینتیس کلو میٹر پر تیزی سے پھیلتے ہوئے شہر شیخوپورہ میں واقع ہے۔

جب یہ لوگ لاہور سے چلتے تھے تو دُھوپ خوب چمک رہی تھی۔ لیکن راستے میں آہستہ آہستہ موسم بدلتا گیا اور جب یہ لوگ ہرن مینار پہنچے تو بادلوں کے گہرے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے لپک رہے تھے۔ ان لوگوں نے گاڑیاں تلاب سے کچھ فاصلے پر روکیں اور باتیں کرتے ہوئے بارہ دری میں چلے گئے۔

بارہ دری انتہائی خوب صورت، انتہائی دیدہ زیب اور مغل فن تعمیر کی

عمدہ مثال تھی۔ ان میں متعدد دروازے اور روشن دان تھے۔ جن سے تمام اطراف کا خوب صورت نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

چشمہ کچھ دیر ان لوگوں کے ساتھ رہی پھر جیسے ہی وہ لوگ مینار کے اندر گئے، چشمہ بارہ دری سے نکل کر تالاب کے قریب آگئی اور دُور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب کھیتوں کی جانب دیکھنے لگی۔ بادلوں کی وجہ سے رات کا سماں لگ رہا تھا اور چشمہ کا دماغ بھی چکرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہاں آکر غلطی کی۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا......؟

وہ خاموشی سے جمی کی کار میں لیٹ گئی۔ تا کہ جب وہ لوگ آئیں تو اسے ڈھونڈنا نہ پڑے۔

وہ لوگ جب مینار کا نظارہ کر کے نیچے آئے تو چشمہ غائب تھی۔ اس پر غضب یہ کہ بارش شروع ہو چکی تھی۔ افراتفری کے عالم میں سب لوگ اسے ڈھونڈنے لگے۔

اچانک عروج کی نظر گاڑی میں سوئی ہوئی چشمہ پر پڑی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا تو چشمہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بے سود پڑی تھی۔ عروج نے جھک کر چھوا تو بخار بہت تیز تھا۔ پھر جمی چیختا رہ گیا اور عروج یہ کہتا ہوا گاڑی لے اُڑا کہ وہ چشمہ کو اس کے گھر پہنچا دے گا۔

مگر یہ اور بات تھی کہ چشمہ کے گھر جانے کی بجائے اسے اپنے بنگلہ پر لے آیا تھا۔ گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے چشمہ کو بادقت تمام اپنے کمرے میں پہنچایا۔ پھر اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر آیا پھر چشمہ کا چیک اَپ کیا۔ ایک انجکشن دیا اور عروج کو ضروری ہدایات دے کر چلا گیا۔

رات دو بجے کے قریب چشمہ کو کچھ آیا مگر جلد ہی پھر غنودگی چھا گئی۔

عروج نے اطمینان کی سانس لی۔ دوسری بار اسے دن کے ایک بجے ہوش آیا تو عروج اس وقت لنچ کے لئے ڈرائنگ روم تھا۔ چشمہ حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی مگر ابھی دو قدم ہی چلی تھی کہ چکرا کر گر پڑی۔

لنچ کے بعد عروج کمرے میں آیا اور اسے قالین پر گری دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاہم یہ دیکھ کر وہ خوش ہوگیا کہ بخار بالکل معمولی رہ گیا تھا پھر کچھ دیر اس کے پاس رہا کہ شاید ہوش آجائے پھر باہر لان میں آگیا۔

کچھ دیر بیٹھا وہ اخبار پڑھتا رہا پھر اپنے کمرے کی طرف آیا تو راہ داری میں ماں سے سامنا ہوگیا۔

”کیا بات ہے بیٹا......؟ بڑی جلدی میں ہو......؟“

ماں نے محبت سے پوچھا۔

”امی جان...... وہ چشمہ......‘

بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔

”کون سا چشمہ......؟“

ماں نے پوچھا تو عروج کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔

”جی......؟ امی......! کچھ نہیں......!“

عروج نے کہا تو ماں آگے بڑھ گئی۔

جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو شام کا ملگجی اندھیرا پھیل رہا تھا۔ روج چشمہ کو دیکھنے لگا۔ اگر بخار ہوگیا تھا، مگر چہرے پر سرخی ابھی باقی تھی۔

یوں ہی کچھ دیر عروج اسے دیکھتا رہا اور پھر بے ساختہ اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اسی وقت چشمہ نے آنکھیں کھول دیں۔

”چشمہ......!“

عروج نرم لہجے میں بولی۔

”اُمید ہے تم مجھے معاف کر دو گی......! اور اگر نہ بھی معاف کرو تو کوئی بات نہیں......! کیونکہ تم میری ہو، کوئی غیر نہیں۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ پلیز چشمہ......! میرے پیار کو یوں نفرت سے مت دیکھو......!“

چشمہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم اُٹھ بیٹھی۔ اب اس کے حواس کام کرنے لگے تھے اور وہ عروج کی باتوں کا مطلب سمجھنے لگی تھی۔

”تمہیں مجھ سے محبت ہے......؟“

چشمہ نے پوچھا۔

”ہاں......! میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تب سے ہی تم مجھے اچھی لگی ہو......!“

”خوب......!“

چشمہ طنزیہ ہنسی ہنس دی۔

”تمہیں مجھ سے محبت نہیں، عروج......! محبت کہہ کر لفظ ”محبت“ کی توہین مت کرو......! محبت تو روح کے لئے ہوتی ہے۔ مگر تم مرد تو اس قابل ہی نہیں کہ تم سے محبت کی جائے۔ تم آج کے ان لاکھوں نوجوانوں جیسے ،، محبت کو ایک کھیل کے سوا کچھ نہیں سمجھتے......!“

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں چشمہ......! تم لیٹ جاؤ......!"

عروج نے اسے مشورہ دیا۔

"نہیں عروج......! میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رُک سکتی۔"

چشمہ نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

"چشمہ......! میں تمہیں اپنا سمجھتا تھا اور سوچا تھا تم بھی مجھے اپنا سمجھ کر معاف کر دو گی......! لیکن اگر تم نے اس خلوص سے میرے بارے میں غلط اندازہ لگا ہی لیا ہے تو میں اپنی اس حرکت پر تم سے شرمندہ ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہیں اس وقت کہیں جانے نہیں دوں گا۔ کیونکہ تمہاری طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ صبح میں خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"تم مجھے نہیں روک سکتے عروج......! میں پہلے کلب جاؤں گی اور پھر اپنے گھر......!"

عروج نے اسے سمجھانا چاہا مگر جب وہ نہ مانی تو اسے لے کر کلب آ گیا۔ کلب میں سب ساتھی موجود تھے۔ جمی نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے......؟"

"میں ٹھیک ہوں......! تم یہ بتاؤ......! جو کام تمہارے سپرد کیا تھا، وہ ہوا کہ نہیں......؟"

"پرسوں تک ہو جائے گا۔"

جمی نے کہا تو چشمہ واپسی کے لئے مڑتے ہوئے بولی۔

"او کے......! پھر میں چلتی ہوں۔ کل ملاقات ہو گی۔"

پھر وہ عروج کے ساتھ باہر آ گئی۔ گھر پہنچی تو باپ سو رہا تھا اور ماں جائے نماز بچھائے بیٹھی تھی۔ چشمہ نے سوچا۔

اگر وہ یہاں رُکی تو ماں سوال و جواب کرے گی۔ اس لئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جمیلہ بیگم جب اس کے کمرے میں آئی تو وہ سو چکی تھی۔ انہوں نے بھی جگانا مناسب نہ سمجھا اور باہر آ گئی۔

جب صبح اُٹھی تو اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ جب وہ باہر آئی تو باپ کام جا چکا تھا اور ماں اس کے لئے ناشتہ بنا رہی تھی۔ چشمہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی، پھر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

جمیلہ بیگم جو کہ ناراض ہونے کا پروگرام بنا رہی تھی، سب بھول بھال گئی اور مامتا بھرے لہجے میں بولی۔

"چشمہ......! میری بچی......! مجھ سے اتنی دُور مت جایا کرو......!"

"امی جان......! اب میں آپ سے کبھی دُور نہیں جاؤں گی۔"

"میں نے یہ سوچ کر تمہیں اتنی ڈھیل دی تھی کہ تمہارا دل بہلتا رہے گا۔ اگر تم گھر میں رہی تو تمہیں بہن بھائی کی یاد ستائے گی۔ میں نے شاہد اور نجمہ کو تو کھو دیا ہے مگر تمہیں نہیں کھونا چاہتی۔ کیونکہ اب تم ہی تو ہماری زندگی کا واحد سہارا ہو۔ اس لئے میں نے کوئی پابندی تم پر عائد نہ کی۔ یہاں تک کہ جب بھی تمہارا باپ پوچھتا، تمہارے بارے میں، تو میں یہی کہتی، تم سو گئی ہو۔

تم نے رات کہاں گزاری ہے......؟ تم اتنا گر جاؤ گی......؟ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے تم پر اعتماد تھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا چشمہ......؟ اپنے مجبور ماں باپ کی مجبوریوں کا سوچا ہوتا کہ تم کس خاندان سے تعلق رکھتی

ہو......؟ بتاؤ......! مجھے بتاؤ چشمہ......! کیا میں نے تمہاری تربیت ایسی کی تھی کہ تم اپنی ہی ہستی کو تباہ کر لو......؟ جواب دو چشمہ......!''

جمیلہ بیگم اسے جھنجوڑتے ہوئے رونے لگی۔

''بس کریں امی جان......! خدا کے لئے بس کریں......! اتنا گندا الزام مجھ پر لگا کر اپنی ہی توہین مت کریں۔ آپ نے یہ سب کیسے کہہ دیا امی......؟ ماں باپ اگر اولاد کو جنم دیتے ہیں تو اس پر اعتماد کرنا بھی سیکھیں......!''

''تو پھر کہاں تھی تم......؟''

جواب میں چشمہ نے پوری روداد سنا ڈالی۔

''بیٹی......! غریب آدمی کے پاس اس کی عزت ہی سرمایہ ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ رہے تو وہ محتاجوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔''

''کس عزت یا شرافت کے بات کرتی ہیں امی......؟ یہ آپ کی بھول ہے کہ غریبوں کے پاس عزت یا شرافت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ عزت بھی امیروں کی ہوتی ہے اور شرافت بھی، وہ دولت کے بل پر خریدتے ہیں۔ کب تک آپ جھوٹی شرافت اور عزت کی آڑ لے کر بھوکے پیاسے اندھیروں میں گم رہیں گے......؟ ساری زندگی ہمیں ذلت کے سوا ملا ہی کیا ہے......؟ ہماری شرافت دیکھتے ہوئے کسی امیر نے ہماری عزت کی ہے......؟

نہیں امی......! غریب ساری زندگی اس غلط فہمی میں گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھا رہتا ہے۔ پھر قبر کی تاریکیوں میں سو جاتا ہے۔ صرف یہ سوچتا ہے کہ اگر اس کی بیٹی نے گھر سے باہر قدم نکالا تو وہ لوگ کیا کہیں

گے......؟ لیکن مجھے اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں......؟ جب خدا نے لوگوں کو زبان دی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ کہیں گے ضرور......!''

''چشمہ......! میری بچی......! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم ابھی ناسمجھ ہو......!''

''میں ناسمجھ نہیں ہوں امی......! بھائی اور بہن کی ایک ہی چوٹ نے مجھے بہت سمجھدار بنا دیا ہے۔ مجھے اپنے بھائی اور بہن کا انتقام لینا ہے۔ تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی کو دھوکہ نہ دے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں پرسکون ہوگئی ہوں......؟ آپ کیا جانیں، میں کیسے جی رہی ہوں......؟ مجھے تو اسی دن مر جانا چاہئے تھا، جب اکیلی رہ گئی تھی۔ لیکن جب خدا نے مجھے زندگی دی ہے تو کیوں نہ میں ان لوگوں کے لئے عبرت کا سامان پیدا کروں......؟ جو شادی بیاہ کو جوا سمجھ کر کھیلتے ہیں۔''

''نہیں میری جان......! میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

جمیلہ بیگم نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''میں تو تمہارا گھر آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہارے لئے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے، انکار مت کرنا......!''

''نہیں امی جان......! جو شخص ایک بار جوا ہار جائے اسے دوبارہ جوا کھیلنا نہیں چاہئے۔ ورنہ کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور آپ کو یاد ہے آپ پہلا جوا ہار چکی ہیں......؟''

چشمہ کے لہجے میں بیتے دنوں کا کرب تھا۔

''نہیں میری بچی......! زندگی جوا نہیں......! خدا کی دی ہوئی ایک

بہت بڑی نعمت ہے اور اسے زندوں کی طرح گزارنا چاہیئے۔''

چشمہ خاموش ہی رہی۔ وہ بحث و تکرار کر کے ماں کا دل دُکھانا نہیں چاہتی تھی۔

شام کو حسب عادت وہ کلب آئی تو عروج پہلے ہی اس کی میز پر براجمان تھا۔ چشمہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر دوسری میز سنبھال لی۔ تمام ساتھی اس کی میز پر آگئے۔ مگر عروج وہیں بیٹھا رہا۔

چشمہ دس بجے تک کلب میں رہی اور پھر اُٹھ گئی۔ عروج بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھا تھا اور لفٹ کی پیش کش کی تھی۔ چشمہ جواب دینے کی بجائے باہر آئی اپنے لئے ایک رکشہ رُکوایا، تبھی عروج اس کا راستہ روکتے ہوئے بولا۔

''تم کیا چاہتی ہو......؟ کچھ بتاؤ تو سہی......!''

''میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو......!''

''یہ نہیں ہوسکتا۔''

''پھر کیا ہوسکتا ہے......؟''

چشمہ نے جل کر پوچھا۔

''شادی......!''

عروج مسکرایا۔

''اس سے کم نہیں......!''

''ہوں......!''

چشمہ نے طنز بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''عروج......! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا، مرد شادی کے بغیر نہیں

رہ سکتا۔ تم بھی شادی کرنا چاہتے ہو اور محبت کا ڈرامہ بھی کرتے ہو۔ کیا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو......؟''

''تم واقعی پاگل ہو......!''

عروج ہنس دیا۔

''شادی کے بغیر انسان بھلا قریب آتا ہے، اور پھر شادی کے بعد محبت کم نہیں ہوتی۔''

''مجھے اپنی رُسوائیوں کا خوف ہے۔ تم جانتے ہو میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی، مگر اس وقت کیا میں شریف لگ رہی ہوں......؟ جانتے ہو میرے محلے کے شریف لوگ مجھے دُور سے ہی دیکھ کر تھوتھو کرتے ہیں۔ حالانکہ شرافت ان کے پاس بھی نہیں۔ لیکن خوش فہمی ضرور ہے، مجھے اگر بدنامیوں کا ڈر ہوتا تو کلب کبھی نہ آتی۔ بائی بائی۔''

چشمہ ہاتھ ہلاتے ہوئے رکشہ میں بیٹھ گئی۔

چشمہ اگرچہ پہلے کی طرح کلب آرہی تھی، لیکن عروج سے اس کی بات چیت بند تھی۔ حالانکہ عروج بلاناغہ کلب آتا تھا۔ مگر چشمہ کو مخاطب کرنے کی اس نے بھی کوشش نہیں کی تھی۔ اپنی میز پر بیٹھا چائے یا کافی پیتا رہتا یا پھر اپنی سوچوں مین ڈوبا رہتا۔

چشمہ کو کبھی تو اس کے اس فلمی پوز پر ہنسی آتی اور کبھی تڑپ سی جاتی۔ اس کا دل چاہتا وہ کہے چلو عروج......! جہاں تم کہتے ہو......! مگر اس سے زیادہ وہ کبھی نہ سوچ پاتی۔

سنیچر کو کلب میں ایک خاص ایٹم تھا۔ چشمہ کو آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔

مگر کلب میں داخل ہوتے ہی وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔ جس کی خاطر اس نے گھر بار چھوڑا تھا۔ عزت اور شرافت اُتار پھینکی تھی۔

وہ سامنے کی میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ چشمہ ہال کے اس مخصوص حصے کی جانب جانے کی بجائے اس کے سامنے والی میز پر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف عروج تھا جو آج کل چشمہ کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔

مگر اس وقت اچانک اس کی نظر چشمہ پر پڑی، وہ اپنے سامنے والی میز پر یوں دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی دُشمن کو دیکھتا ہے عروج پہلے تو اسے عام انداز میں دیکھتا رہا پھر اسے غصہ آنے لگا۔ اسی اثناء میں ایک شخص کی نگاہ چشمہ پر پڑی اور وہ بڑی تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

”چشمہ......! تم......؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم مجھے مل گئی ہو۔ بخدا میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا......؟“

”اچھا......!“

چشمہ مسکرائی۔

”چشمہ......! تم نہیں جانتی، میں کوشش کے باوجود تمہیں نہیں بھول سکا۔“

طاہر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”خوب......!“

چشمہ نے تلخی سے کہا۔

”تمہیں نہیں معلوم، تمہاری ماں اور بھائی نے ہمارے ساتھ کیا ظلم کیے ہیں......؟“

”مجھے سب معلوم ہو چکا ہے اور میں بہت شرمندہ ہوں لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں، بھیا اپنے کیئے کی سزا پا چکے ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”لیکن وہ تو جیل میں تھے......؟“

چشمہ نے حیرت سے کہا۔

”جیل میں کیا موت نہیں آتی......؟“

طاہر اُداسی سے بولا۔

”بھیا محنت اور مشقت کے عادی نہ تھے جو ان سے لی جاتی تھی۔ انہوں نے جیل میں ہی خودکشی کر لی۔“

طاہر کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ جیسے اپنے جذبات پر قابو پا رہا ہو پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”چشمہ......! تم ان سب باتوں کو بھول جاؤ......! میں تمہیں اپنے دل کی ملکہ بنا کر رکھوں گا۔ تم ان کے کیئے کی سزا مجھے مت دینا......!“

چشمہ کچھ کہنے کی بجائے مسکرا دی۔

”مجھے معاف کر دو چشمہ......! قصور میرا ہے جس نے پلٹ کر تمہاری خبر نہ لی۔“

طاہر نے ندامت سے کہا اور پھر طاہر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اسے گھر ڈراپ کر کے چلا گیا۔

پھر تو چشمہ روز اسے کلب میں ملنے لگی۔ اپنے پرانے ساتھیوں کو اس نے نظرانداز کر دیا تھا۔ کوئی کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ جمی نے طاہر کے بارے میں

اس سے بہت پوچھا۔ لیکن چشمہ اسے بھی نہ بتا سکی۔ وہ جانتی تھی اگر اس نے جمی کو سب کچھ بتا دیا تو وہ اس کی راستے کی دیوار بن جائے گا۔ کیونکہ جب سے اس نے چشمہ کی داستان سنی تھی، وہ اسے سگے بھائیوں سے بڑھ کر چاہنے لگا تھا۔

چشمہ کو طاہر سے ملتے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا اب وہ مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے طاہر سے کہنے لگی۔

”آخر ہم کب تک ایسے ملتے رہیں گے......؟ تم نے کچھ سوچا ہے......؟“

”تو کیا میں تمہارے گھر آؤں......؟“

طاہر خوشی سے چلایا۔

”نہیں بھئی......! تم کیوں ہمارے گھر آنے لگے......؟ یہ کام تو بڑوں کے ہیں۔ تم اپنی امی کو بھیجنا۔“

”ہاں......! یہ بات ٹھیک ہے میں تو خود بھی یہی چاہتا تھا مگر پھر تمہارا...... خیر چھوڑو......! میں پچھلی تمام باتوں کی تلافی کر دوں گا۔“

”مگر ایک بات طاہر......!“

چشمہ افسردگی سے بولی۔

”ہمارے گھر میں اب اور کوئی چیز نہیں، یہاں تک کہ شاید چائے تک بھی نہ پوچھ سکیں۔“

”کوئی بات نہیں......!“

طاہر نے کہا۔ وہ تو اسی میں خوش تھا کہ چشمہ شادی کے لئے رضامند

ہو گئی تھی۔

”چشمہ......! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ صرف تمہاری ضرورت ہے۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اُٹھ گئے اور عروج اپنی میز پر بیٹھا دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے دن طاہر کی والدہ ان کے ہاں آئی تو چشمہ نے حقارت سے ان کو دیکھا۔

”کہئے......! کیسے آنا ہوا......؟“

جمیلہ بیگم نے خشک لہجے میں پوچھا اور جب طاہر کی ماں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو جمیلہ بیگم بھڑک اُٹھیں۔

”تمہیں یہاں آنے کی اور یہ باتیں کرنے کی جرأت کیسے ہوئی......؟ تمہارے پہلے دیئے ہوئے زخم تو ابھی بھرے نہیں اور تم ایک نیا گھاؤ لگانے چلی آئی ہو......؟ تمہارے حق میں واپس جانا بہتر ہوگا۔ جاؤ......! واپس چلی جاؤ......!“

طاہر کی ماں کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر ضبط کرنا پڑ رہا ہے۔

”تم کچھ بھی کہو بہن......! میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک تم ہاں نہیں کرو گی۔“

آخر چشمہ کے کہنے پر جمیلہ بیگم نے یہ رشتہ منظور کر لیا مگر دل ڈر رہا تھا جیسے وہ چشمہ کے ارادے کچھ کچھ سمجھ گئی ہوں۔ انہوں نے یوسف میاں کو

بھی اس رشتہ کے لئے راضی کرلیا۔

اسی شام طاہر نے ایک پرُتکلف دعوت دی اور کلب میں اپنی منگنی کا اعلان کیا عروج کے سوا اس نے اپنے تمام دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود عروج کلب میں موجود تھا اور اس ہنگامے کو دیکھ رہا تھا، مگر نہ جانے کیوں چشمہ کوشش کے باوجود آج اسے نہ دیکھ سکی......؟ اور پھر گھبرا کر باہر لان میں چلی آئی۔

”اتنا لمبا چوڑا ڈرامہ کھیلنے کی کیا ضرورت تھی......؟“

عروج جو اس کے پیچھے باہر آیا تھا، زہر خند سے بولا۔

”یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ تم شادی نہیں کرنا چاہتی......؟ تمہیں مردوں سے نفرت ہے، سیدھی طرح کہہ دیا ہوتا۔ اگر شادی ہی کرنا تھی تو مجھ میں کیا کمی تھی......؟

تم نے مجھے گھر کے پرُسکون ماحول سے نکال کر کلب کے ہنگاموں میں پہنچ دیا۔ میں سب کچھ اس لئے برداشت کرتا رہا کہ چند دنوں کی بات ہے، پھر میں تمہیں بھی اپنے گھر کے پرُسکون ماحول میں لے جاؤں گا۔ مگر تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ میں جو ماں باپ کا حکم کا پابند تھا، وقت پر گھر جاتا تھا، ہر چیز سے بے نیاز ہوگیا، صرف تمہارے لئے۔“

”مگر میں نے اپنے بہن بھائی کی موت کا سہارا لے کر خواہ مخواہ عظیم بننے کی کوشش کی، مجھے آدھی رات کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر میری ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے......؟ تم شاید اس کا اندازہ نہ کرسکو۔“

”عظیم بننے کی کوشش میں تم دوسروں کے ساتھ کیا کیا زیادتی کر

گئی......؟ تم کبھی نہ سمجھ سکو گی۔ خیر......! تمہیں یہ منگنی مبارک ہو۔ خدا کرے تم خوش رہو......!

مگر چشمہ......! طاہر ایک سیدھا سادا انسان ہے۔ اس کے ساتھ کوئی چالاکی نہ کرنا ورنہ وہ ختم ہو جائے گا۔ یہ میں تھا جو اب تک جی رہا ہوں۔ اچھا، خدا حافظ......!“

لمبا چوڑا لیکچر دے کے عروج رُخصت ہوگیا۔

چشمہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، گم سم کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر چلی آئی، کبھی نہ کلب جانے کے لئے۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب وہ چشمہ یوسف سے چشمہ طاہر بن کر سسرال چلی آئی۔ طاہر کی ماں نے کوئی ایک رسم بھی پوری نہ کی کیونکہ وہ طاہر کی شادی کسی بڑے گھر میں کرنا چاہتی تھی۔ مگر طاہر نے دھمکی دی تھی۔ اگر اس کی شادی چشمہ سے نہ ہوئی تو وہ خودکشی کرے گا۔ اسی لئے وہ مان گئی۔ ورنہ دل سے اس نے چشمہ کو بہو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بلکہ اب کی بار تو ان لوگوں نے جہیز تو کیا، چائے تک نہ پوچھی تھی۔ اس پر چشمہ نے اس کی تذلیل کی تھی کہ اب کی بار اگر یہ سوچ کر آئی ہو کہ ٹی وی فریج ملے گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ یہاں سے تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہ ملے گی۔

چشمہ کی بات سن کر اس کا دل چاہا تھا۔ منہ نوچ لے مگر ضبط کرتے ہوئے سوچا، جس طرح نجمہ کو خودکشی پر مجبور کیا تھا اسی طرح چشمہ کو بھی مجبور کر دے گی اور پھر طاہر بھی کچھ نہ کر سکے گا۔ کیونکہ شادی کا بھوت سر سے اُتر چکا ہوگا۔ یہ پلاننگ تھی چشمہ کی ساس کی۔

چشمہ گیارہ بجے تک طاہر کی رشتہ دار لڑکیوں کے درمیان بیٹھی ان کی نوک جھونک سنتی رہی، کوئی کہتی ہمارا طاہر بھائی تو بہت سیدھا سادا ہے اور دُلہن تو چہرے سے ہی نٹ کھٹ لگ رہی ہے، اللہ بے چارے طاہر بھائی پر رحم کرے۔ ان کی باتیں سن کر چشمہ دل ہی دل میں قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اس کہانی کا انجام کمپلیٹ ہو جائے گا۔

ساڑھے گیارہ بجے لڑکیاں اسے حجلہ عروسی میں چھوڑ کر باہر چلی گئیں اور چشمہ نے ایک طویل سانس لے کر گھونگھٹ اُلٹ دیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

موتیے، گلاب اور گوٹے کی سنہری لڑیاں مسہری کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ کمرے کی ایک ایک چیز سے نور ٹپک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر ایک چیز پر طاہر نے خصوصی توجہ دی ہو۔

چشمہ سب کچھ دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ طاہر پر اسے ترس آ رہا تھا۔ مگر نفرت کی آگ بھی آج اور بھڑک رہی تھی۔ جس طرح ان کے گھر کا آخری چراغ بجھا دیا گیا تھا، اسی طرح اس گھر کے آخری چراغ کو بجھانے کا وہ تہیہ کر چکی تھی۔

بالآخر اس نے کوئی فیصلہ کر لیا اور بھاری دوپٹہ اُتار کر مسہری کے ایک طرف رکھ دیا۔

''یا اللہ.....! مجھے کامیابی عطا کرنا اور ہمت بخشنا.....!''

اس نے دُعا کی تب ہی طاہر کمرے میں آ گیا۔

چشمہ کو دوپٹے سے بے نیاز دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت بھری

مگر پھر وہ مسکراتے ہوئے چشمہ کے قریب چلا آیا۔ چشمہ نے بالکل اسی انداز سے اسے دیکھا جس انداز سے کبھی دیکھا کرتی تھی۔

''چشمہ تم نے میرے آنے سے قبل ہی خود کو گھونگھٹ سے بے نیاز کر دیا۔ اس نے سنہری واچ چشمہ کو پہنانی چاہی مگر چشمہ اس کا ہاتھ جھٹک کر مسہری سے نیچے اُتر گئی۔

''چشمہ.....! یہ کیا.....؟''

طاہر نے آگے بڑھ کر کہا۔

''میرے قریب مت آؤ طاہر.....! ڈرامہ ختم ہو چکا ہے۔''

چشمہ نے بے دردی سے کہا۔

''کیا مطلب ہے.....؟ تمہاری ان باتوں کو میں سمجھا نہیں.....!''

طاہر نے معصومیت سے کہا۔

''سنو طاہر.....!''

چشمہ غور سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہاری ماں اور بھائی نے میری باجی کے ساتھ کیا کیا تھا.....؟ میں اسے بھولی نہیں تھی۔ اپنے بھائی اور بہن کی موت کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ میں بھی تم لوگوں سے انتقام لوں گی اور اس انتقام کے لئے میں نے تمہاری واپسی کا انتظار کیا۔

ذرا سوچو طاہر.....! ہر شریف گھرانے کی وہ لڑکی جو کبھی گھر کی دہلیز سے باہر نہ جھانکا تھا، جب ایک دم شرافت چھوڑ کر کلب میں چلی آئی تو اس کے ماں باپ کے دل پر کیا کیا نہ گزرتی ہوگی.....؟ میری ماں نے جوان بیٹے

اور جوان بیٹی کی موت کا صدمہ سہا۔ پھر میری بربادی کا انتظار شروع ہو گیا۔ مجھے تمہارا انتظار تھا کہ اچانک میری زندگی میں عروج چلا آیا۔ وہ جتنی شدت سے مجھ سے محبت کرتا ہے، شاید تم بھی نہ کر سکو......!"

"مگر چشمہ......!"

طاہر آگے بڑھا۔

"مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں طاہر......! کیونکہ میں تم سب لوگوں سے شدید نفرت کرتی ہوں۔"

"مگر چشمہ......! میرا قصور......؟ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ امی بھیا کے جرم کی سزا مجھے کیوں دینا چاہتی ہو......؟"

"قصور تمہارا نہیں تو پھر کس کا تھا طاہر......؟

باجی کا......؟

جس نے رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے زبان بند کر لی......؟ اور ہم تمہارے مطالبے ماننے پر مجبور ہو گئے......؟

یا پھر شاہد کا......؟

جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے جہیز نہ بنا سکا......؟ یا امی کا جس نے بیٹے کی بجائے پہلے بیٹیوں کو جنم دیا......؟

یا پھر میرے ابو کا......؟

جس نے اچھے رشتے کی خاطر مکان بیچ دیا......؟ کہ اس کی بیٹی اچھے گھر جائے گی اور سکھی رہے گی

یا پھر تمہارے بھائی کا......؟

جس نے شادی شدہ ہوتے ہوئے دوسری شادی......"

"تم میری بات بھی تو سننے کی کوشش کرو چشمہ......! اپنی ہی کیوں کہہ رہی ہو......؟"

"نہیں طاہر......! پہلے یہ بتاؤ......! قصور کس کا تھا......؟ تمہارا یا تمہاری ماں کا......؟ شاید تمہاری ماں کا جس نے لمبا چوڑا جہیز مانگا لیکن اصل جڑ تو جہیز ہے ناں......! برسوں پہلے جس نے اس رسم کو شروع کیا تھا، قصور اس کا تھا۔"

"پھر تم مجھے سزا کیوں دینا چاہتی ہو......؟"

طاہر کے چہرے پر اطمینان تھا۔

"تمہیں سزا اس لئے دینا چاہتی ہوں کہ تم اس ماں کے بیٹے ہو، جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا اور میں چاہتی ہوں آئندہ کوئی ماں اپنے بیٹے کی قیمت وصول نہ کر سکے۔ آئندہ کوئی جوا نہ کھیل سکے۔"

"تم کیا چاہتی ہو کھل کر کہو......!"

"کیا تم اب بھی نہیں سمجھے......؟"

چشمہ مسکراتی ہوئی بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

اور طاہر جیسے کچھ کچھ سمجھ گیا اور جب سمجھ گیا تو اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں واپس آیا اور چشمہ کے قریب ہی مسہری پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"تم مجھے آزمانا چاہتی ہو......؟ آزما کر دیکھ لو......! میں بھائی جیسا نہیں ہوں۔ میں آخری سانس تک تمہیں چاہوں گا۔ تم ایک بار میری بن کر تو

دیکھو......!"

"نہیں طاہر......! مجھے تو صرف تم لوگوں سے انتقام لینا تھا۔ ورنہ جو لوگ میری بہن بھائی کے قاتل ہوں، میں ان سے خوشیاں مانگ سکتی تھی۔ نہیں طاہر......!"

یہ صرف انتقام تھا۔ مگر طاہر کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔

"آج ہماری سہاگ رات ہے اور بڑی عجیب سی......"

طاہر اس کے خوب صورت چہرے پر ایک نظر ڈال کر عجیب سے لہجے میں بولا۔

"سنو چشمہ......! امی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی نہ کروں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ تم یہ سب کچھ انتقام لینے کے لئے کر رہی ہو۔ لیکن میں نے کہا، نہیں امی......! ایسا ہرگز نہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور محبت کرنے والے خطائیں معاف کر دیا کرتے ہیں۔ جبکہ خطا بھی کسی دوسرے کی ہو۔ کیونکہ تم نے اپنے چہرے پر معصومیت کا خول چڑھا رکھا تھا۔ لیکن بہرحال تم کسی طرح کا انتقام لینا چاہتی ہو۔ تاکہ تمہارے مطالبے پر کچھ غور کیا جا سکے۔ بولو......! کیا چاہتی ہو......؟"

"تمہاری موت چاہتی ہوں طاہر......!"

چشمہ خوف ناک لہجے میں بولی۔

"تاکہ جس طرح میری ماں بیٹے، بیٹی کے غم میں دن رات تڑپتی رہی ہے، تمہاری ماں بھی اسی تڑپ کا اندازہ کر سکے۔ اسے بھی احساس ہو کہ سکون کیسے چھینے جاتے ہیں......؟"

چشمہ چپ ہوگئی۔

"کتنی عجیب بات ہے چشمہ......! کیا کبھی کسی دلہن نے سہاگ رات میں اپنے سہاگ سے یہ کہا ہوگا کہ میری مانگ سے افشاں نوچ ڈالو......؟ کبھی کسی نے پیدا ہوتے ہی مرنے کی دعا کی ہے......؟ تمہیں احساس ہے تم کیا کہہ رہی ہو......؟

خیر......! بات اگر میرے مرنے کی ہے تو میں اکیلا جان نہیں دوں گا۔ تمہیں بھی میرے ساتھ مرنا ہوگا۔ بولو......! تیار ہو......؟"

اس نے چشمہ کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"میں زندہ رہ کر کیا کروں گی......؟ میری زندگی بے سکون ہے۔ آج تک اگر زندہ رہی تو صرف انتقام لینے کے لئے اور جب انتقام پورا ہو رہا ہے تو میرا زندہ رہنا بے معنی ہے۔ اچھا ہے مر کر میں بھی پرسکون ہو جاؤں......! اب جینے میں رکھا ہی کیا ہے......؟"

"سوچ لو چشمہ......! ڈیئر......! میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"اس میں سوچنے کی کوئی بات نہیں......! میں تو آغاز سے ہی انجام کے بارے میں جانتی تھی۔ سب کچھ سوچنے کے بعد ہی میں ان راستوں پر آئی تھی۔ اب گھبرانے یا سوچنے کے لئے وقت نہیں......!"

اگر تم یہی چاہتی ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

طاہر ریوالور لے کر اس کے قریب ہوگیا۔

"بولو چشمہ......! تم مرنے کے لئے تیار ہو......؟"

طاہر نے آخری بار مدہم لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......! تیار ہوں چونکہ میں وہ وعدہ کر رہی ہوں جو میں نے اپنے بھائی اور بہن کی لاشوں پر کیا تھا اور جب ہمارا انجام دوسروں کے لئے عبرت ناک ہوگا تو آئندہ کوئی شخص ظلم کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ مگر ایک وعدہ کرو......! مجھے مارنے کے بعد خود کو بھی موت کے حوالے کرنا تاکہ میری روح بے چین نہ رہے......؟"

طاہر نے تڑپ کر اس کو دیکھا۔ اندر ایک ہل چل سی مچی وہ خود بھی مر رہی تھی اور اس کو بھی مرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

یہ کتنا بڑا ظلم تھا کہ جرم دوسروں نے کئے تھے اور سزا ان دونوں کو مل رہی تھی۔ جہیز کی ایک بری رسم نے دو گھروں کو تباہ کر دیا تھا۔

"چشمہ......!"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ تمہارے بعد میں زندہ رہ کر کیا کروں گا......؟ تم میری چاہتوں کا اندازہ نہ کر سکی ورنہ......"

"اب ایسی باتیں کرنے کا فائدہ......؟ جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب...... اب دیر مت کرو......!"

کہتے ہوئے چشمہ نے آنکھیں بند کر لیں اور طاہر اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بے ساختہ جھک کر ہونٹ اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔ بے شک وہ اس کی دُلہن تھی اور وہ بغیر منہ دکھائی دیئے کیسے رُخصت ہو جاتا......؟

چشمہ نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہ کی تھی۔ تب ہی فائر ہوا، چشمہ بوکھلا گئی۔ کیونکہ گولی تو اسے کہیں بھی نہ لگی تھی۔ چشمہ نے گھبرا کر آنکھیں

کھولیں تو تڑپتا ہوا طاہر اس کے قریب ہی گر گیا۔

چشمہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ طاہر واقعی اپنی جان پر کھیل جائے گا۔ حیرت کی تصویر بنی وہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ پھر جلدی سے ریوالور اُٹھایا۔ مگر وہ خالی تھا۔ پہلی بار وہ طاہر کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بولی۔

"یہ تم نے کیا کیا طاہر......؟"

وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"چشمہ......! تم یہی چاہتی تھی ناں...... کہ میری ماں تڑپتی رہے......؟ اور چشمہ......! بے ضمیر تو تم بھی نہیں ہوگی۔ میں چاہتا ہوں تمہیں بھی تھوڑی سی سزا ملے، کسی کا معصوم دل توڑنے کی۔ تم بھی اسی طرح تڑپو جس طرح میں تڑپا...... اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک تو پیار کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے، اور دوسرا اس کی تپش بھی محسوس نہ کر سکے۔

نہیں چشمہ......! تم سب کچھ محسوس کرو گی کیونکہ اب تم میری بیوی ہو۔ آہ......!"

طاہر اس طرح تڑپا جیسے پوری جان نکل گئی ہو۔ چشمہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ مسہری پر رکھا ہوا دوپٹہ اُٹھا کر وہ باہر کو بھاگی۔ فائر کی آواز سب مہمانوں نے سن لی تھی۔ وہ سب اوپر کو آرہے تھے۔ سب سے آگے طاہر کی ماں تھی۔ چشمہ کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

"یہ فائر کی آواز کیسی......؟"

"مجھے نہیں معلوم......!"

کہتے ہوئے چشمہ نیچے آئی اور بھاگتی ہوئی گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔

اسے آس پاس ایک عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا۔ اس شور سے بچنے کے لئے وہ بدحواس ہو کر سڑک کے درمیان بھاگ رہی تھی کہ اچانک سامنے سے آتی ہوئی گاڑی سے ٹکرا کر گر پڑی۔

عروج جلدی سے بریک لگا کر باہر آیا اور سڑک پر گری چشمہ کو دیکھ کر جلدی سے جھک کر اسے اُٹھاتے ہوئے بولا۔

''تمہاری تو شادی تھی چشمہ......! تم یہاں کیسے......؟''

عروج جو کہ سیدھا کلب سے آ رہا تھا، چشمہ کے خیالوں میں ڈوبا ہوا، اب اسے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور چشمہ کہہ رہی تھی۔

''عروج......! تمہیں میری شادی کا بہت دُکھ تھا۔ دیکھو......! آج میں اعتراف کرتی ہوں، میں تم سے محبت کرتی تھی، میری پہلی اور آخری محبت تم ہی ہو......!''

عروج نے بے ساختہ اسے بانہوں میں لے لیا اور چشمہ کہتی رہی۔

''مگر عروج میرے انتقام کے لئے شادی بہت ضروری تھی اور پھر میں ان لوگوں کو کیسے معاف کر دیتی جنہوں نے ہمارے گھر کو برباد کر دیا۔ میں نے ان لوگوں سے انتقام لے لیا ہے۔

مگر دیکھو......! طاہر جاتے ہوئے مجھ سے کیسا انتقام لے گیا......؟ وہ خود مر گیا اور مجھے زندہ چھوڑ گیا، تڑپنے کے لئے۔

اب دیکھو، میرے چاروں طرف بے چین روحیں چیخ رہی ہیں۔ مجھے ڈرا رہی ہیں۔ عروج......! مجھے ان سے چھپا لو......! مجھے کہیں لے چلو عروج......!''

وہ سسکتی ہوئی اس کے گلے لگ گئی۔

''چشمہ......! میری جان......! میں تمہیں ان سب سے دُور......''

عروج کی بات اُدھوری رہ گئی۔ سامنے سے آتا ہوا بے قابو ٹرک ان دونوں کو کچلتا ہوا گزر گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ ملک عدم رُخصت ہو گئے اور چیختی ہوئی بے چین روحیں بھی واپس لوٹ گئیں۔

معاشرے کی ایک رسم نے کتنے لوگوں کی جان لی تھی......؟

کتنے گھر برباد کئے تھے......؟

اور نہ جانے کتنے گھروں کو اور برباد کرے گی......؟

کاش کہ لوگ ابتداء سے پہلے انجام کو جان لیں۔



آزارِ محبت

لباس تبدیل کر کے وہ تھکے تھکے قدموں سے بیڈ روم میں آئی اور طویل سانس لیتی ہوئی بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے سر جھٹک کر سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ابھی کچھ گھنٹے قبل ہی تو وہ خوشی خوشی تیار ہو کر ٹی وی سٹیشن گئی تھی۔

مدتوں سے ٹی وی پر آنے کی خواہش آج پوری ہوئی تھی۔ جب وہ ایک پروگرام میں مہمان بن کر گئی۔ مگر اب وہ دُکھ سے سوچ رہی تھی۔

کاش وہ اس پروگرام میں نہ گئی ہوتی اور نہ ماضی کی وہ دُکھ بھری کہانی یاد آتی۔

''اُف......! یہ لڑکیاں بھی کتنی بے وقوف اور احمق ہوتی ہیں۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بڑبڑائی۔

کبھی کبھی وہ ایسی حماقتیں کر جاتی ہیں کہ جب ان کی یاد آئے تو تکلیف سی محسوس ہو۔

''کاش میں نے بھی یہ حماقت نہ کی ہوتی۔''



ان دنوں گویا کرکٹ کا آغاز پھیلا ہوا تھا۔ ہر گھر، ہر گلی میں ہر جگہ اور ہر وقت صرف اور صرف کرکٹ ہی کی باتیں بلکہ کرکٹ کم اور کھلاڑیوں کی باتیں زیادہ ہوتیں اور وہ لڑکیاں جنہوں نے کبھی فلم کی شکل بھی نہ دیکھی تھی، وہ بھی ان باتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ خاص کر سکول اور کالج کی لڑکیاں کہ جو گروپ تھے، ان میں سے کوئی کسی کھلاڑی کو پسند کرتی اور کوئی کسی کو ادھر تفریح کا وقفہ ہوتا۔ اور ادھر لڑکیاں نمک مرچ لگا کر باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔ کوئی کہتی۔

''ارے......! میں میچ دیکھنے گئی تو فلاں پلیئر سے آٹو گراف لئے۔''

شبانہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی اور جب باتیں کرتے کرتے ان میں سے کوئی اسے مخاطب کر بیٹھتی۔

''ارے شبانہ......! تو بھی تو بتا......! تو کسے پسند کرتی ہے......؟''

تو وہ کچھ کہنے کی بجائے مسکرا دیتی اور اس پر وہ ہنس کر پوچھتیں۔

''کیوں شبانہ......! کیا تمہارے سینے میں دل نہیں......؟''

''میں نے یہ کب کہا......؟''

شبانہ ہنس کر کہتی۔

''مگر زمین اور آسمان میں جو فرق ہے، وہ تو ایک اندھا بھی محسوس کر سکتا ہے۔ میں تو پھر آنکھوں والی ہوں۔''

مگر سہیلیاں بھی ہار ماننے والی کہاں تھیں......؟ فوراً کہتیں۔

''ارے چھوڑو......! پسند کرنے میں جاتا ہی کیا ہے......؟ اور یوں بھی کہتے ہیں، تاج محل ضرور بناؤ۔ کیونکہ کبھی کبھی سچ مچ تاج محل بن جاتا ہے۔''

مینا اسے سمجھانے کے لئے فلاسفی بن جاتی تو عالیہ نے کہنا شروع کر دیا۔

''ارے......! تم تو مصنفہ ہو......! تم سے کوئی بھی شادی کرنا پسند کرے گا۔''

''ہونہہ......!''

وہ تلخی سے ہنس دیتی۔

''میں وہ مصنفہ ہوں جس کے دو سال میں صرف دو افسانے ہی آئے ہیں۔''

''یار......! تو تو پاگل ہے......!''

ناز اس کے اس طرح بات کرنے پر دکھی ہو جاتی۔

''دیکھنا آج نہیں تو کل تو بھی اپنے دور کی عصمت چغتائی بن جائے گی۔''

اور شبانہ اتنی بڑی مصنفہ کا نام سن کر ہنس دیتی۔

مگر کہتے ہیں نا کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ دستوں کی محبت رنگ لائی اور شبانہ محسوس کر رہی تھی۔ شاید وہ بھی کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ کتنی عجیب بات تھی۔ اپنی حیثیت جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک غریب گھر

کی لڑکی ہے، وہ اس کو چاہنے لگی تھی۔ شاید یہ عمر کا اثر تھا۔ اس کی پسند ٹیم کا ایک خاص آل راؤنڈر جاوید خرم تھا لیکن اپنی اس حماقت کے بارے میں اس نے ابھی کسی دوست کو کچھ نہ بتایا تھا۔

خلافِ معمول ریس ٹائم پر آج بڑی گھمبیر خاموشی تھی۔ البتہ مونا کبھی کبھی کہتی۔

''ہائے......! میں تو بے موت مر گئی۔''

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''بات کیا ہے......؟''

شبانہ نے سب کو افسردہ دیکھ کر پوچھا۔

''اچھا ہوا جو تم نے کسی کو پسند نہیں کیا۔''

مینا نے بجائے جواب دینے کے اسے سمجھایا۔

''مگر ہوا کیا......؟''

شبانہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''مونا جس کھلاڑی کو پسند کرتی تھی، وہ شادی شدہ نکلا۔''

''تو اس میں رونے کی کیا بات ہے......؟''

شبانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ذرا یہ بھی تو سوچو......! اگر سب شادی شدہ نکلے تو......؟''

مینا نے ہاتھ ملتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

''تو کیا ہوگا......؟''

''کبھی کبھی جو تاج محل بنتے ہیں، وہ بھی نہیں بن پائیں گے۔''

شبانہ نے ہنس کر کہا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔

"اگر جاوید خرم بھی شادی شدہ نکلا تو میرا کیا ہوگا......؟ ہائے خرم......! میں تو شاید مر جاؤں گی......؟"

"تم کیا سوچ رہی ہو......؟"

مینا نے پوچھا تو وہ چونک پڑی۔

"کچھ نہیں مینا......! اب کیا ہو سکتا ہے......؟"

"ہاں......! اب کیا ہو سکتا ہے......؟"

مینا نے بھی دُکھ سے کہا اور شبانہ نے دل میں سوچا۔

"خرم......! میں اس بات کا پتہ چلانے کی ضرور کوشش کروں گی کہ تم نے شادی تو نہیں کی......؟"

پھر ایک دن بھی ضائع کئے بغیر اس نے اپنے پورے مہینے کی جیب خرچ کا خون کرتے ہوئے کرکٹ کا مشہور پرچہ لیا۔ ان دنوں صرف اسی پرچے کی شہرت تھی۔

اگلے روز اس نے مدیر کے نام ایک خط لکھا اور خط پڑھ کر خود بھی ہنس دی۔ اس نے لکھا تھا۔

"خرم جاوید کے کتنے بچے ہیں......؟"

اپنے اس خط کا ذکر اس نے کسی دوست سے بھی نہ کیا۔ ٹھیک دو ہفتے بعد جواب آیا۔ پرچے کے مدیر نے لکھا تھا۔

"بی بی......! ان کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی تو پھر بچے کیسے......؟"

یہ پڑھ کر وہ بہت خوشی ہوئی اور پھر خرم جاوید کے ایڈریس کو حاصل

کرنے کے لئے خط لکھا اور جلد ہی اس کا بھی جواب آ گیا۔ ایڈریس ملتے ہی اس نے خرم کو خط لکھا۔

"ڈیئر خرم......!

آداب......!

تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ بس اتنا جان لو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم سوچو گے میں کتنی بے باک ہوں......؟ تو ڈیئر......! ضروری نہیں کہ مرد ہی محبت میں پہل کریں......؟ لڑکی بھی کر سکتی ہے۔ اپنے بارے میں تمہیں کیا لکھوں......؟ سوائے دو باتوں کے۔

میں ایک مصنفہ ہوں اور ایک غریب گھر کی لڑکی بھی، اس کے باوجود تم سے محبت کرتی ہوں۔ خط کا جواب جلدی دینا۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔

فقط تمہاری

شبانہ عظیم......!"

خط پوسٹ کر دیا مگر طویل انتظار کے باوجود جواب نہ آیا تو یہ سوچ کر کہ شاید خط اس کو نہ ملا ہو، وہ تقریباً دوسرے تیسرے روز اسے خط لکھنے لگی۔ مگر جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔ سہیلیاں بھی اس کی پریشانی کی وجہ دریافت کرنے لگیں۔ مگر وہ کسی کو کیا بتاتی......؟

بس ایک اُمید تھی شاید کبھی جواب آ جائے......!

وقت گزرتے کب دیر لگتی ہے......؟ دو سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔

وہ خط اب بھی اسے لکھتی تھی مگر کبھی کبھی۔ اس کا خیال تھا تنگ آ کر آخر ایک نہ ایک دن تو وہ بھی جواب دے گا۔ اس کا جواب تو کیا آتا......؟ شبانہ کے ایف اے کرتے ہی ماں باپ نے اسے مزید انتظار کی مہلت دیئے بغیر اس کی شادی کر دی۔

وہ انکار بھی نہ کر سکی۔ کرتی بھی تو کس اُمید پر......؟ اور کیا کہتی......؟ یوں ہی چپ چاپ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر وہ اپنے گھر کی ہوگئی۔

اس کا شوہر حامد علی ایک اچھا انسان تھا۔ مگر خرم کی یاد نہ جا سکی۔ تاہم جب وہ ماں بنی تو خود ہی سب کچھ بھلا دیا۔ اب یاد کرنے میں رکھا ہی کیا تھا......؟

شادی کے بعد اس نے لکھنا چھوڑ دیا مگر حامد کے اصرار پر پھر لکھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان دس سالوں میں اتنی مقبول ہوگئی کہ ہر پرچے میں اس کا کوئی نہ کوئی افسانہ یا ناول کی قسط ہوتی۔ پرچوں کے مدیر خود خط لکھ لکھ کر اس کی نگارشات طلب کرتے اور ایسے میں وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی۔

اس کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ ایک بچہ تھا، شوہر تھا اور وہ تھی اور ان کی پُرسکون گھریلو زندگی۔ اب بھی جب کبھی میچ ہوتا تو وہ اُداس ہو جاتی۔ حامد ٹی وی دیکھتے دیکھتے آواز دیتے۔

”ارے بھئی......! دیکھو کتنا خوب صورت میچ جا رہا ہے......!“

مگر وہ کہتی۔

”حامد......! مجھے کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں......! مجھے کچھ سمجھ نہیں

آتی۔ خواہ مخواہ یہ لوگ پانچ پانچ دن خود بھی لگے رہتے ہیں اور دوسروں کا ٹائم بھی ضائع کرتے ہیں۔“

حالانکہ شادی سے پہلے جب میچ ہوتے تھے تو وہ ٹی وی کے سامنے سے اُٹھنے کا نام بھی نہ لیتی تھی۔ مگر اب وہ بالکل میچ نہ دیکھتی تھی۔

ان دنوں اس کا ایک ناول بہت مقبول ہوا تھا اور اسی سلسلے میں اس کو ٹی وی کے ایک پروگرام میں انوائٹ کیا گیا تھا۔ یہ ایک سٹیج شو تھا جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو بلایا جاتا تھا۔

مقررہ دن وہ تیار ہو کر ٹی وی سٹیشن آئی۔ میزبان نے اس کا خوب صورت الفاظ میں تعارف کروایا اور پھر اس کی تخلیقات کے بارے میں سوال کرنے لگی۔ شبانہ جواب دیتی رہی کہ کیسے شروع کے دنوں میں کچھ پرچے والوں نے اسے مایوس کیا لیکن اب وہ بھی لائن میں لگے رہتے ہیں۔ پھر میزبان نے سوالات کا سلسلہ بند کیا اور اُٹھتے ہوئے بولی۔

”خواتین وحضرات......! اب ہم اپنے آج کے پروگرام کے آخری مہمان کو دعوت دیتے ہیں اور ہمارے یہ مہمان کرکٹ کے مشہور کھلاڑی...... جی ہاں......! تشریف لاتے ہیں خرم جاوید......!“

شبانہ کے گلے میں جیسے پھانس سی چبھ گئی۔ کسی زمانے میں خرم کو قریب سے دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ مگر اس وقت اس کے تو خیال میں بھی نہ تھا کہ یوں خرم جاوید سے ملاقات ہو جائے گی۔ شبانہ نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر سامنے دیکھا۔

خرم ایک شانِ بے نیازی سے آ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ

چکا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی خوب صورت تھا، جتنا کہ دس سال پہلے......! شبانہ کے دیکھنے پر اس نے مسکرا کر شبانہ کو دیکھا اور پھر میزان کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔

اور شبانہ سوچنے لگی۔

''یہ وہ انسان ہے جس نے محض غریب ہونے کی وجہ سے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ اگر میں بھی کسی رئیس خاندان کی بیٹی ہوتی تو شاید یہ مجھے ٹھکرانے کی غلطی کبھی نہ کرتا......؟ مگر افسوس......!''

اچانک وہ چونک پڑی۔

میزبان نے سوال کیا تھا۔

''خرم صاحب......! آپ کے پرستاروں کی تعداد ہزاروں ہے، بلکہ لاکھوں......! ان میں سے اکثر پرستار آپ کو خطوط لکھتے ہوں گے۔ کیا آپ ان میں سے کسی کو جواب دیتے ہیں......؟''

''کسی کو کیوں......؟''

خرم مسکرا کر بولا۔

''میں تو اپنے ہر پرستار کے خط کا جواب دینا فرض سمجھتا ہوں اور تقریباً ہر خط کا جواب دیتا ہوں۔''

''ہونہہ......!''

شبانہ اپنی نفرت نہ چھپا سکی، بولی۔

''بھلا آپ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے......؟ جب آپ جواب نہیں دیتے تو صاف کہہ دیجئے کہ نہیں دیتے......!''

''جی......!''

خرم نے پہلی بار اس کو غور سے دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

''آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے آپ نے خود خط لکھا ہو اور میں نے جواب نہ دیا ہو......؟''

ہال میں لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔ شبانہ نے غصے سے اسے دیکھا اور خشک لہجے میں بولی۔

''معاف کیجئے گا......! میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ میں فضول مشاغل کے طور پر کسی کو خط لکھ سکوں......؟ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔''

''ارے ارے......!''

میزبان نے مسکرا کر شبانہ کو دیکھا اور پھر خرم سے مخاطب ہوئی۔

''خرم صاحب......! یہ ہمارے ملک کی ممتاز اور مشہور رائٹر شبانہ عظیم ہیں......!''

''جی......!''

خرم نے اس کو دیکھا پھر یوں سر ہلایا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی ہو مگر اتنا وقت نہ ملا۔ میزبان سوالات کا سلسلہ شروع کر چکی تھی اور وہ جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم وہ کبھی کبھار شبانہ کی طرف نظر دیکھ لیتا۔

پروگرام ختم ہوا تو سب سے پہلے شبانہ باہر آئی وہ جلد از جلد خرم جاوید سے دُور ہونا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس نے خرم جاوید کی نظروں کو اپنے تعاقب میں محسوس کر لیا تھا۔ ابھی وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی، جب خرم جاوید کو اس نے تیزی سے اپنے قریب آتے دیکھا۔

"یا اللہ......! میری مدد کرنا......!"

شبانہ گھبرا کر جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی مگر اتنے میں خرم جاوید قریب چلا آیا۔

"سنئے......!"

اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا آپ وہی شبانہ عظیم ہیں جو دو سال تک مسلسل مجھے خط لکھتیں رہیں......؟"

"تو گویا میرا ہر خط اس ظالم انسان کو ملتا رہا مگر شہرت کے آسمان پر کھڑے ہو کر اس نے زمین کو دیکھنا گوارہ نہ کیا......؟"

شبانہ نے دل میں سوچا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔"

خرم غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"اب جواب دینے سے کیا حاصل......؟"

شبانہ نے کہا اور پھر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

"سنو شبانہ......! میں......"

خرم کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر شبانہ زن سے گاڑی بڑھا لے گئی۔

وہ بڑی مشکل سے اس کو بھول پائی تھی مگر وہ بھولا کب تھا......؟ مگر آج اچانک اُسے سامنے دیکھ وہ پھر اُداس ہوگئی تھی اور اس کو شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ محض غریب ہونے کی وجہ سے ٹھکرائی گئی تھی گو کہ آج اس کے پاس کچھ موجود تھا۔ گھر تھا، گاڑی تھی، عزت تھی، شہرت تھی مگر

یہ پہلی محبت بھی کتنی ظالم چیز ہوتی ہے۔ کبھی نہ کبھی اچانک دل کی چبھن بن جاتی ہے۔



اور آج وہ بھی اس گزرے وقت کے ایک ایک لمحے کو یاد کر رہی تھی۔

جب خط لکھ کر وہ سوچا کرتی تھی کہ جب خرم جواب دے گا تو میں اس وقت خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں اور اگر وہ مجھ سے ملنے کا کہے گا تو میں اس کو ملنے جا سکوں گی اور وہ وقت کتنا حسین ہوگا جب میں اس کو قریب سے دیکھوں گی۔

مگر کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ خواب جو اس نے دیکھا، خواب ہی رہا۔ دو سال کی کوشش کے باوجود اس کو تعبیر نہ ملی تھی اور اب وہ ایک ذمہ دار عورت کی حیثیت سے اپنی کہانیوں اور افسانوں میں لڑکیوں کو خواب نہ دیکھنے کی تلقین کرتی۔

وہ خواب جو کبھی پورے نہیں ہوتے مگر پوری زندگی کو روگ بنا دیتے ہیں، خواب جو ایک سراب کی مانند ہوتے ہیں۔ اس سراب کا اس نے بھی پیچھا کیا تھا اور آج اس کو وہ خواب یاد آ رہا تھا۔ وہ گم سم سی اس بھولے بسرے خواب کے بارے میں سوچ رہی تھی اور شاید سوچتی رہتی کہ اس کا بیٹا ٹیپو آوازیں دیتا ہوا اندر آ گیا۔

"مما......! مما......!"

"کیا بات ہے......؟"

اس نے ماں کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا اور شبانہ

سب کچھ بھول کر پیار کرنے لگی۔ مگر ذہن کو جو جھٹکا آج لگا تھا، اس کا طبیعت پر کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا ہی تھا۔

''اچھا مما......!''

ٹیپو اس سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔ ہم اپنے دوست کے گھر جا رہے ہیں۔ شام کو آجائیں گے۔

''اچھا بیٹے......!''

شبانہ نے مسکراتے ہوئے اسے رُخصت کیا۔ مسلسل سوچنے سے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ شاہد کا کھانا تیار کرنے کی بجائے وہیں لیٹ گئی اور پھر اس کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب شام ہوگئی......؟

حامد گھر آیا اور اس کو یوں لیٹے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ لائٹ آن کرتے ہوئے اس نے غور سے شبانہ کو دیکھا اور پھر قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے جان......! کچھ پریشان سی لگ رہی ہو۔''

پھر چونک کر بولا۔

''ارے، ہاں......! آج تو تمہارا ٹی وی پروگرام تھا......؟ کیا بنا اس کا......؟''

''بنتا کیا تھا......؟ بس ہوگیا......!''

شبانہ اُٹھ بیٹھی۔

''پھر کیا بات ہے......؟''

''کچھ نہیں حامد......! سر میں معمولی درد ہے۔ آپ تو یوں ہی پریشان ہوجاتے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے......! تم لیٹ جاؤ......! میں ٹیبلٹ لے کر آتا ہوں۔

وہ دوسرے کمرے میں گیا اور اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ شبانہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف خرم جاوید تھا۔

''آپ نے فون کرنے کی زحمت کیوں کی......؟''

شبانہ نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''شبانہ......! مین تمہاری ناراضگی کو سمجھتا ہوں۔ تمہارے انتظار کو بھی۔ لیکن اپنی صفائی پیش کرنا تو میرا حق ہے......!''

''کیسی صفائی......؟''

شبانہ نے اُلجھ کر پوچھا۔

''جو وقت گزر گیا، سو گزر گیا......! اب مجھے کسی صفائی، کسی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں مسٹر خرم جاوید......!''

''نہیں شبانہ......! تمہیں سننا ہوگا۔ میں بے قصور ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے تمہارے تمام خطوط ملے مگر ڈیئر......! یہ بھی تو سوچو......! ہمیں تو ہزاروں لڑکیاں خط لکھتی ہیں۔ اگر ہم ہر لڑکی کے خط کا یقین کر لیں تو کیا ہوتا......؟ اس کے باوجود تمہارے مسلسل خط آنے کی وجہ سے میں نے تمہاری تحریر کو، تمہارے نام کو ہر پرچے میں تلاش کیا مگر کسی پرچے میں بھی تمہارا نام نہ ملا تو مین نے سوچا، ہوسکتا ہے یہ لڑکی مذاق کے موڈ میں ہو۔

اب تم ہی بتاؤ......! اس میں میرا کیا قصور ہے......؟''

''ہاں خرم صاحب......! اس میں آپ کا قصور ہے۔ مگر اس وقت میں اتنی مقبول نہیں تھی، جتنی مقبول ہستی کی آپ کو تلاش تھی۔ آپ لوگوں کے لئے تو

بڑے بڑے گھروں میں شادی کے چانس ہوتے ہیں۔ پھر میں آپ کی یادداشت میں کس طرح رہتی......؟"

مجھے افسوس ہے شبانہ......! اگر تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں شادی کر چکا ہوتا۔"

"مکالمے بازی ختم کیجئے خرم صاحب......! میں آپ کے جھوٹ کا یقین نہیں کرتی۔ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی......؟ مجھے اس کی وجہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں......!"

"شبانہ......! میں جانتا ہوں تم نے ایک طویل مدت، اذیت ناک انتظار کی نظر کی ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اپنی زندگی کے قیمتی سال آپ کے لئے ضائع کئے ہیں......؟ میں نے ایک معمولی خواب دیکھا تھا اور بہت جلد اس کو بھول گئی تھی۔"

پلیز شبانہ......! تم بھول گئیں تھیں مگر میں......"

"خاموش رہئے خرم صاحب......! آپ کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی میں آپ کو بتا دوں کہ میں نا صرف شادی شدہ ہوں، بلکہ ایک بچے کی ماں بھی ہوں۔"

"کیا......؟"

خرم نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ حقیقت ہے......!"

شبانہ پرسکون لہجے میں بولی۔

"میں نے دس سال قبل ہی شادی کر لی تھی۔ بہتر ہوگا آپ آئندہ فون کرنے کی زحمت نہ کریں۔"

شبانہ نے فون بند کر دیا اور آنکھیں بھر آئیں۔ اتنے میں حامد آگیا اور شبانہ آنسو پونچھ کر سوچنے لگی۔

"اتنے اچھے شوہر کی موجودگی میں یہ آنسو نہ صرف بری بات ہے بلکہ گناہ بھی۔"

اس نے پریشان حامد کو دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"حامد......! آپ تو میری ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ یقین کریں......! جب آپ آئے تھے تو درد جاتا رہا۔"

"واقعی......!"

حامد نے حیران ہو کر اس کو دیکھا تو وہ زور سے ہنس دی اور حامد بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے مسکرا دیئے اور شبانہ نے سوچا۔

وہ بھول کر بھی نہ سوچے گی کہ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔



ضمیر

میٹرک کا آخری پرچہ دے کر روشی ایگزام ہال سے باہر آئی تو شاہین مسکراتی ہوئی بولی۔

''کیوں بھئی.....؟ کیسا رہا پرچہ.....؟''

''کیسے کا کیا مطلب.....؟ تم لوگ دیکھ لینا، میں اوّل پوزیشن حاصل کروں گی۔''

روشی نے گردن اکڑا کر کہا۔

''نہیں بھئی.....! جھوٹ مت بولو.....!''

شاہین دُور جاتی ہوئی عائشہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اوّل پوزیشن تو ہمیشہ کی طرح عائشہ حاصل کرے گی۔''

''اونہہ.....! عائشہ.....؟ تم سب دیکھنا، اوّل پوزیشن صرف اور صرف میں حاصل کروں گی۔''

روشی نے تکبرانہ لہجے میں کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کہنے کو تو روشی

نے کہہ دیا تھا کیونکہ سہیلیاں اب اسے عائشہ کا نام لے کر چڑانے لگی تھیں۔ تاہم وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اوّل پوزیشن حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔

وہ ایک امیر گھرانے کی نک چڑھی لڑکی تھی۔ جبکہ عائشہ غریب گھر سے تعلق رکھتی تھی۔ اوّل پوزیشن حاصل کر رہی تھی۔ سب ٹیچرز اسے بے حد چاہتی تھیں۔ کیونکہ روشی کے والدین اسکول کو ہمیشہ مالی امداد دیتے آئے تھے۔ اس لئے وہ روشی کو بھی نظرانداز نہیں کرتی تھیں۔

رزلٹ آؤٹ ہونے سے قبل ہی روشی کو معلوم ہو گیا تھا وہ صوبے میں تو کیا، اپنے اسکول میں بھی کوئی پوزیشن حاصل نہ کر سکی تھی۔

''ڈیڈی.....! اخبار میں صرف اور صرف میری تصویر آنی چاہئے اور کسی کی نہیں۔''

وہ پورے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔

''روشی.....! یہ ناممکن سی بات ہے۔ ویسے بھی بیٹی.....! کسی سے حسد نہیں کرتے۔ عائشہ نے محنت کی ہے، اسے اس کا صلہ ملنا چاہئے.....!''

روشی کے ڈیڈی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مگر میری جو ہنسی اُڑے گی دوستوں میں، اس کا آپ کو کوئی خیال نہیں.....؟ پلیز.....! بھائی جان.....! آپ ہی کچھ کیجئے نا.....! ہمارے لئے۔'' وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

''بھئی.....! میں کیا کر سکتا ہوں.....؟''

ندیم اُکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"رزلٹ آؤٹ ہونے سے پہلے تمہارے رزلٹ کا معلوم تو کر لیا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا میرے بس میں نہیں......!"

باپ کے سمجھانے بجھانے پر اسے اپنی یہ بچگانہ ضد چھوڑ دینا پڑی تھی۔

اتفاق سے جس کالج میں روشی نے داخلہ لیا تھا۔ اسی کالج میں عائشہ نے بھی داخلہ لے لیا۔ بہرحال کالج میں سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ اوّل پوزیشن عائشہ نے ہی حاصل کی تھی۔ روشی بجائے شرمندہ ہونے کے اور بھی اکڑ کر چلتی اور عائشہ کی اِنسلٹ کا کوئی بھی موقع ہاتھ نہ جانے دیتی۔

کالج کی تعلیم مکمل کر کے وہ دونوں یونیورسٹی چلی آئیں۔ عائشہ کے ایڈمیشن کا سارا کام' عائشہ کے بھائی ایاز نے خود مکمل کیا تھا۔ کیونکہ عائشہ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ صحت یاب ہو کر جب عائشہ یونیورسٹی آئی تو روشی یہاں بھی اپنی دولت کا جادو جگا چکی تھی۔

عائشہ ہمیشہ کی طرح خاموشی سے اس کی بدتمیزیوں کو نظر انداز کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آج گھر ہی چلی جائے تو اچھا ہے۔ دفعتہً اس نے اپنے قریب مدہم سی آواز سنی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں......؟"

عائشہ نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک خوبرو، اسمارٹ سا نوجوان ہاتھ میں فائل لئے کھڑا تھا۔ عائشہ اُٹھتی ہوئی بولی۔

"بیٹھئے......! میں تو جا رہی ہوں۔"

"معاف کیجئے......! میں تو آپ سے کچھ باتیں کرنے آیا تھا اور آپ

جا رہی ہیں......؟"

وہ بے تکلفی سے فائل میز پر رکھتے ہوئے کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"مجھ سے اور باتیں......؟"

عائشہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کیوں......؟ آپ سے باتیں کرنا منع ہے کیا......؟"

وہ مسکرایا تو عائشہ بھی مسکرا دی۔

"پہلی بات یہ ہے کہ مجھے مبارک کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ وہی عائشہ ہیں جس نے میٹرک میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی......؟"

"جی......! مگر آپ کو کیسے یاد ہے ابھی تک......؟"

عائشہ نے حیرت سے دیکھا۔

"خوش قسمتی سے میں نے بھی اسی سال میٹرک میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ آپ نے میری تصویر تو دیکھی ہوگی......؟"

"ہو سکتا ہے......؟"

عائشہ اُٹھتی ہوئی بولی۔

"گویا میں یہ سمجھوں، آج سے آپ کی اور میری دوستی پکی......؟"

"سوچوں گی......!"

عائشہ نے کہا اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

روشی قدم قدم پر عائشہ سے خار کھاتی چلی آ رہی تھی۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ عائشہ کی دوستی یونیورسٹی کے سب سے امیر اور خوب صورت لڑکے سے ہو گئی ہے تو روشی اس سے اور زیادہ خار کھانے لگی تھی۔ تاہم وہ جانتی تھی

اب اس طرح بات نہ بنے گی۔

یوں اس نے عائشہ سے دوستی کرنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ مبارک خود اس کی پسند بھی تھا اور مبارک تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ وہ عائشہ سے دوستی کر لے۔ ایک دن جب عائشہ لائبریری میں بیٹھی مطالعے میں مصروف تھی، روشی اس کی میز پر چلی آئی۔

''مس عائشہ......! کیا کر رہی ہیں آپ......؟''

روشی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کتاب ہاتھ میں پکڑ کر انسان کیا کرتا ہے......؟''

عائشہ نے اُلٹا سوال کیا۔ تاہم وہ حیران ضرور تھی کہ آج روشی کو اس کا خیال کیسے آ گیا......؟

''عائشہ......! میرا دل آپ سے دوستی کرنے کو چاہتا ہے۔ کیا آپ میری دوست بننا پسند کریں گی......؟''

روشی کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ عائشہ نے ایک بار حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میری آپ سے دُشمنی کب تھی......؟''

عائشہ نے سادہ لہجے میں کہا۔

''تو گویا میں یہ سمجھوں، آج سے ہماری دوستی پکی......؟''

روشی نے ہاتھ بڑھایا تو کچھ سوچتے ہوئے عائشہ نے روشی کا ہاتھ تھام لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یونیورسٹی میں ان کی دوستی کی دُھوم مچ گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی اور بھی پختہ ہوگئی۔

مگر عائشہ اس بات سے بے خبر تھی کہ روشی دوستی کی آڑ میں کچھ اور چاہتی ہے۔

''مس عائشہ......! میں آپ کو پوری یونیورسٹی میں تلاش کرتا پھر رہا تھا اور آپ یہاں چھپی بیٹھی ہیں......؟''

مبارک اسے لائبریری میں بیٹھے دیکھ کر بولا۔

''خیریت تو ہے......؟ آپ مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے......؟''

عائشہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''خیریت......؟ ارے بابا......! خیریت اب کہاں......؟ یہ آپ کی دوست روشی تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ جہاں تنہا دیکھتی ہے، منہ اُٹھائے چلی آتی ہے، خواہ مخواہ بور کرنے......!''

عائشہ مسکرائی تو مبارک جھلا کر بولا۔

ویسے آپ کی اور ان کی اتنی گہری دوستی کیسے ہوگئی......؟''

''بس......! ہوگئی۔''

عائشہ نے لاپرواہی سے کہا۔

''مگر آپ اپنی پریشانی کی آڑ میں کیا کہنا چاہتے ہیں......؟''

عائشہ جو بہت دنوں سے یہ محسوس کر رہی تھی کہ مبارک کچھ کہنا چاہتا ہے، خود ہی پوچھنے لگی۔

''عائشہ......! کوشش کے باوجود میں تم سے کچھ نہیں کہہ سکا۔ تم خود ہی سمجھ جاؤ نا......!'

''ارے واہ......! میں کیا سمجھ جاؤں......؟''

عائشہ اسے تنگ کرنے کے لئے بولی۔

''اگر تم اپنی اس بات پر قائم رہو تو میں تمہیں ابھی عملی طور پر سمجھا سکتا ہوں......!''

مبارک شرارت سے مسکرایا۔

''سمجھاؤ......! پھر دیر کس بات کی ہے......؟''

عائشہ نے ہنس کر کہا۔

''واقعی......؟''

مبارک نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

''بس بس......! سمجھ گئی۔''

عائشہ بھی مسکرا دی۔

''شکریہ......! اگر میری بات تمہارے دل میں اُتر گئی۔''

مبارک جھک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ تب ہی روشی لائبریری میں داخل ہوئی اور دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا کر رہے ہو تم دونوں یہاں......؟''

''آپ کو کیا نظر آ رہا ہے......؟''

مبارک نے شوخی سے کہا اور لائبریری سے نکل گیا۔

''کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں......؟''

مبارک کے جاتے ہی روشی نے عائشہ سے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں......!''

عائشہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُٹھ گئی۔

ایک دن وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی کہ مبارک بھی وہیں آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی......؟''

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے سرگوشی کی۔

''عاشی......!''

''کیا ہے......؟ بھئی......! دیکھ نہیں رہے، میں نوٹس بنا رہی ہوں......!''

''ارے......! چھوڑو ان کو، میری بات سنو......! میں نے مما سے تمہارے بارے میں بات کی تھی، وہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔ آج تم میرے ساتھ گھر چلو گی......؟''

''مگر میں ان سے ابھی کیسے مل سکتی ہو......؟ وہ کیا سوچیں گی میرے بارے میں......؟''

''بھئی......! ممی اکیلی ہیں اور کوئی نہیں ہے ہمارے گھر میں۔''

''اچھا ٹھیک ہے......! چلوں گی۔''

عائشہ نے حامی بھر لی۔ روشی کچھ فاصلے پر بیٹھی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جیسے ہی مبارک اُٹھ کر گیا، وہ عائشہ کے قریب آئی۔

''عائشہ......! پلیز......! آج تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گی......؟''

''مگر کیوں......؟''

عائشہ نے اُلجھ کر پوچھا۔

''تم میری دوست ہو......! کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں......؟''

روشی پیار سے اٹھلا کر بولی۔

''مگر میں آج نہیں جا سکتی۔ آج مجھے بہت ضروری کام ہے......!''

''ضروری کام......؟''

روشی اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی طنزیہ ہنسی ہنسی۔

''ٹھیک ہے......! میں آج تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں گی......!''

''عجیب مصیبت ہے......!''

عائشہ نے دل میں سوچا اور آخر جب چھٹی ہوئی تو مجبوراً اسے روشی کو اپنے ساتھ گھر لے جانا پڑا اور مبارک کے ساتھ جانے کا یہ حسین موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور روشی کا مقصد بھی یہی تھا۔

عائشہ کے گھر پہنچ کر روشی ایک دم چونکتے ہوئے بولی۔

''ارے......! مجھے یاد آیا، آج تو مجھے مما کے ساتھ ان کے بھائی کے گھر جانا تھا۔ اچھا......! میں چلتی ہوں، خدا حافظ......!''

روشی مسکراتی ہوئی باہر سے ہی چلی گئی اور عائشہ مارے غصے کے بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی آئی۔

بار بار خود پر تاؤ آ رہا تھا۔

''خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئی۔ بدتمیز......!''

عائشہ اپنے کمرے میں آئی۔ ابھی کپڑے تبدیل کئے ہی تھے کہ چھوٹا

بھائی بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''باجی......! آپ سے ملنے کوئی آیا ہے اور باہر کھڑا ہے۔''

''مجھ سے ملنے کون آ سکتا ہے......؟ جاؤ......! جا کر کہہ دو امی گھر پر نہیں ہیں اور نہ ہی بھائی جان۔ اچھا ٹھہرو......! میں خود ہی جاتی ہوں۔''

دروازے کے باہر کھڑے مبارک کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

''آپ......؟''

''جی میں......!''

مبارک سر کو خم دے کر مسکرایا۔

''مگر تم یہاں کیسے آ گئے......؟''

عائشہ نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اندر آنے کا کہو تو کچھ عرض کروں......! یہاں کھڑے کھڑے تو میری ٹانگیں اکڑ گئی ہیں۔''

''بہتر ہوگا تم بات کر کے یہیں سے لوٹ جاؤ......!''

عائشہ کو ڈر تھا کہیں امی نہ آ جائیں۔ وہ تو اس وقت دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ امی گھر پر نہیں ہیں ورنہ وہ ان سے کیا کہتی کہ کون ہے یہ......؟ اور کیوں آیا ہے......؟

عائشہ کو سوچ میں دیکھ کر وہ خود ہی بے تکلفی سے گھر میں داخل ہو گیا۔

''تم کہو گی نہیں اور میں مزید کھڑا نہیں ہو سکتا۔''

''مبارک......! پلیز......!''

عائشہ منت سے بولی۔

"بھئی......! آخر وجہ کیا ہے......؟ ایک نہ ایک دن مجھے اس گھر میں بے تکلفی سے آنا جانا ہے۔ اتفاق سے اگر آج آ گیا ہوں تو تم یہ گھور گھور کر میرا خون کیوں خشک کر رہی ہو......؟"

عائشہ نے دروازے میں کھڑا ہونا مناسب نہ سمجھا اور دانت پیستی ہوئی اسے بیٹھک میں لے آئی۔

"اب کہو......! کیا بات ہے......؟ اور یہاں کیا لینے آئے ہو......؟"

"تم آخر اتنی چڑچڑی کیوں ہو رہی ہو......؟ ایک تو چوری، اوپر سے سینہ زوری......! آخر اتنی جلدی یونیورسٹی سے آنے کی ضرورت کیا تھی......؟ جبکہ میں نے کہا بھی تھا، آج مما کے پاس جانا ہے۔ مگر پھر بھی تم......"

مبارک نے گھور کر اسے دیکھا۔

"بس......! یہی سب پوچھنے کے لئے تم یہاں آئے ہو......؟ مجبوری تھی، اسی لئے مجھے آنا پڑا...... اور تم برداشت نہ کر سکے......؟ فوراً پیچھے چلے آئے......؟"

"برداشت کیسے کرتا......؟ جبکہ میں نے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ آج تمہیں لے کر آؤں گا۔"

"میں کل تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔ مگر اس وقت تم یہاں سے چلے جاؤ......!"

"کمال ہے......! ایسے ہی کیسے چلا جاؤں......؟ پہلی بار اپنی سسرال آیا ہوں، اچھی سی خاطر تواضع کرو......! یوں بھی امی جان سے ملے بغیر کیسے جا سکتا ہوں......؟"

مبارک نے کہا۔

"مبارک......! پلیز......!"

وہ روہانسی ہو کر چلائی۔

"اگر امی اور بھائی جان آ گئے تو میں ان کے سوالوں کے جواب نہ دے سکوں گی۔ تم فوراً چلے جاؤ......!"

عائشہ نے کہا۔

"اچھا بابا......! تم کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں......!"

مبارک مسکین سی صورت بنا کر باہر نکل گیا اور عائشہ اطمینان کی سانس لیتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

رات کا کھانا کھا وہ باورچی خانے سے باہر آ گئی تو ماں نے اسے پیار سے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے ذرا سختی سے پوچھا۔

"وہ کون لڑکا تھا جو آج تجھ سے ملنے گھر آیا تھا......؟"

"آپ سے کس نے کہا......؟"

عائشہ نے سنبھل کر کہا۔

"شہباز کہہ رہا تھا۔"

ماں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"امی......! وہ میری سہیلی کا بھائی تھا۔ میری سہیلی کی ایک کتاب تھی میرے پاس، وہ لینے آیا تھا۔"

"آج تو وہ آ گیا ہے، مگر آئندہ خیال رہے کہ کوئی گھر پر نہ آنے پائے۔"

ماں نے اسے سختی سے منع کیا اور عائشہ ''جی اچھا......!'' کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صبح یونیورسٹی پہنچی تو مبارک اس کا منتظر تھا۔

''کہئے......! میرے آنے کے بعد آپ کو کوئی ڈانٹ ڈپٹ پڑی......؟''

اس نے کمر پہ ہاتھ باندھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ عائشہ نے گھور کر اس کو دیکھا اور فائل گھاس پر پھینکتی ہوئی بولی۔

''آپ اپنی امی سے کہہ نہیں سکتے تھے کہ آج وہ لڑکی یونیورسٹی نہیں آئی......؟ آپ ہم لوگوں کے رسم و رواج کو نہیں سمجھتے۔ امی نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ تم میری دوست کے بھائی ہو۔ اب تم بتاؤ......! کہ تم نے اپنی سے کیا کہا تھا......؟''

''مجھے کیا کہنا تھا......؟ جھوٹ بولنے کی ان سے کبھی جرأت نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہا، ممی......! کسی مجبوری کی وجہ سے میں آج اسے نہیں لا سکا۔ پھر کسی دن موقع ملا تو لاؤں گا۔ مگر تمہیں کیا ضرورت تھی کہ روشی کو گھر لے گئیں......؟

لیجئے......! بلا آ گئی......!''

مبارک نے ہنستے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا۔ عائشہ نے پلٹ کر دیکھا تو روشی آ رہی تھی۔

''ارے عائشہ......! تم آج اتنی جلدی آ گئیں......؟''

روشی نے مبارک کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''کیا جلدی آنا بری بات ہے......؟ دراصل آج اتفاق سے بس ذرا جلدی مل گئی......!''

''سوری......! تمہارا تو بس کا بھی مسئلہ ہے نا......؟''

روشی نے منہ بنایا پھر کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

''خیر......! یہ بھی کل حل ہو جائے گا۔''

''انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر مبارک اپنی فائل لے کر اُٹھ گیا۔

اگلے روز صبح عائشہ کپڑے تبدیل کر کے ابھی ناشتہ کر رہی تھی کہ ایاز باورچی خانے میں آئے۔

''عاشی......! تمہاری دوست آئی ہے۔''

روشی کا نام سن کر عائشہ دل ہی دل میں جھنجلا گئی۔ مگر ہونٹوں پر جھوٹی مسکراہٹ سجائے وہ بھائی کے ساتھ بیٹھک میں آئی تو روشی اسے دیکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں چہکی۔

''کل تم نے کہا تھا ناں کہ تمہیں بس دیر سے ملتی ہے اور کبھی جلدی......؟ میں نے سوچا کہ تمہارا یہ مسئلہ حل کر دوں۔ ویسے بھی دوست تو ہی ہوتے ہیں جو مشکل میں کام آئیں......!''

ایاز نے تعریفی نظرون سے اس امیر زادی کو دیکھا جو اتنی امیر ہونے کے باوجود مغرور نہ تھی۔ مگر عائشہ اس کی یہ بات سن کر جلا گئی۔ کیونکہ وہ اس کا مقصد اچھی طرح سمجھتی تھی۔

''روشی......! مجھے تمہاری دوستی پر شک نہیں، مگر میرے لئے بس ہی اچھی ہے۔''

”دیکھئے......! میں اتنے پیار سے لینے آئی ہوں اور یہ انکار کر رہی ہے۔“

روشی ایاز سے مخاطب ہوئی۔

”عاشی......! تمہاری دوست اتنے اخلاق سے کہہ رہی ہے۔ تمہیں انکار نہیں کرنا چاہئے......! اگر ناشتہ کر چکی ہو تو چلی جاؤ......!“

ایاز نے تائیدی لہجے میں کہا۔ شاید وہ روشی سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا۔

”جی بہتر......!“

عائشہ نے نہایت ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا تو روشی بولی۔

”تم نے ان کا تعارف نہیں کرایا۔“

”سوری......! یہ میرے بھائی جان ایاز ہیں۔“

”اچھا اچھا......!“

روشی سر ہلاتی ہوئی عائشہ کے ساتھ باہر آ گئی۔

پھر تو روز ایسا ہونے لگا کہ یونیورسٹی میں عائشہ کو مبارک سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ روشی ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتی۔

”یہ تم نے کیا مصیبت پال لی ہے......؟“

مبارک عائشہ کو گھورتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں کینٹین میں بیٹھے تھے۔

عائشہ نے بے بی سے اسے دیکھا اور منہ بنائی ہوئی بولی۔

”میں کیا کروں......؟ خود ہی صبح صبح ہمارے گھر آ جاتی ہے۔ گھر کے ہر فرد سے اتنی محبت سے پیش آتی ہے کہ کیا بتاؤں......؟ مجھے تو خود برا لگتا

ہے۔ مگر کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوتے ہیں، جنہیں پورا کرنا پڑتا ہے۔“

عائشہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے......! تم اخلاقی تقاضے پورے کرتی رہو اور میں اپنے دل کا تقاضہ پورا کرتے ہوئے صبح خود گاڑی لے کر تمہارے گھر آ جایا کروں گا۔“

مبارک تلخی سے بولا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟“

عائشہ نے اُسے غصے سے دیکھا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک تم یونیورسٹی میں رہتی ہو مگر مجھ سے بات کرنے کا تمہیں موقع نہیں ملتا۔ اور اگر بھولے سے بات کرنے بیٹھو تو وہ محترمہ اپنی باتوں کی اتنی لمبی چوڑی فہرست لے کر بیٹھتی ہیں کہ جی چاہتا ہے اس کا گلا گھونٹ دوں یا پھر اپنا......!“

مبارک کی صورت دیکھ کر عائشہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”دیکھو عاشی......! اگر تم نے خود فوری طور پر کچھ نہ کیا تو میں خود را ڈھونڈ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے......! سوچوں گی۔“

عائشہ نے اطمینان سے کہا تو مبارک جھلا کر اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کینٹین کے دروازے پر روشی کی صورت نظر آئی۔

”وہ دیکھو......! چلی آ رہی ہیں محترمہ...... مجھے پہلے ہی معلوم ت اسے چین نہیں ملے گا۔“

اسی اثناء میں روشی قریب پہنچ گئی۔

''عائشہ......! تم نے پیریڈ مس کر دیا۔ آخر کیوں......؟''

''اٹینڈ تو آپ نے بھی نہیں کیا ہوگا......؟''

مبارک نے طنزیہ کہا۔

''جی......! بالکل درست فرمایا آپ نے......!''

روشی ڈھٹائی سے بولی۔

''میں پریشان تھی کہ عائشہ پتہ نہیں کہاں چلی گئی......؟ اب ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں آئی ہوں۔''

''دراصل میرے سر میں درد تھا۔ چائے پینے چلی آئی......!''

عائشہ نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

''اور آپ کے سر میں بھی درد ہوگا شاید......؟''

روشی نے مبارک سے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''درست سمجھا......!''

مبارک نے منہ بگاڑ کر کہا اور اُٹھ گیا۔

کوشش کے باوجود عائشہ روشی سے چھٹکارہ حاصل نہ کر سکی۔ روشی تو ان کے گھر والوں کے دل و دماغ پر بھی بری طرح چھا گئی تھی۔ اکثر چھٹی کے دن بھی وہ چلی آتی۔

عائشہ اب تک دانت پیسنے کے سوا کچھ نہ کر سکی تھی۔ رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہو چکا تھا اور مبارک اسے مسلسل باہر ملنے پر زور دے رہا تھا۔

صبح حسب معمول گاڑی کا ہارن سن کر عائشہ باہر آئی تو ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور کی بجائے ایک خوب صورت نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑی۔

''آؤ عاشی......!''

روشی اس کے لئے دروازہ کھولنے لگی۔ پھر تعارف کرواتی ہوئی بولی۔

''ندیم بھائی......! یہ میری پیاری پیاری سی دوست عائشہ......! اور یہ میرے بھائی ندیم......!''

''ہیلو......!''

ندیم پلٹ کر مسکرایا اور عائشہ بھی مسکرا دی۔

یونیورسٹی میں روشی نے اسے ایک پل کے لئے بھی تنہا نہ چھوڑا۔ مبادا وہ مبارک سے کوئی بات کر لے۔ چھٹی کے وقت پھر ندیم موجود تھا۔

''ارے بھئی......! تمہارے ڈرائیور کو کیا ہوا......؟ ابھی نہیں آیا......؟''

عائشہ بولی۔

''اس کے گاؤں میں کوئی بیمار ہے۔ چھٹی پر گیا ہے۔''

روشی نے کہا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

اتوار کو عید الفطر کی چھٹیوں کے سلسلے میں پہلی چھٹی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے واپسی پر جب روشی کے ساتھ گھر آ رہی تھی تو روشی نے ایک شاپنگ سینٹر کے آگے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔

''عاشی......! تم گاڑی میں بیٹھو......! میں تھوڑی دیر میں شاپنگ کر کے واپس آتی ہوں۔''

روشی یہ کہہ کر گاڑی سے اُتری اور ندیم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''آپ کدھر چلے......؟''

عائشہ مسکرا کر بولی۔

''اطمینان سے بیٹھیے......! آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

ندیم نے مدھم لہجے میں کہا۔

''ایسی کون سی باتیں ہیں جو روشی کی موجودگی میں نہیں ہو سکتیں......؟''

عائشہ نے دانت پیس کر کہا۔

''اگر روشی کی موجودگی میں ہو سکتیں تو میں یہ حرکت کیوں کرتا......؟''

ندیم نے آہستہ سے جواب دیا۔

''دیکھیے......! میں بدتمیزی پسند نہیں کرتی۔ آپ میری دوست کے بھائی ہیں۔ اس وجہ سے آپ کا لحاظ کر رہی ہوں...... ورنہ......''

''جی......! میں سمجھتا ہوں، مگر میں کوئی بدتمیزی نہیں کروں گا۔ صرف باتیں کروں گا۔''

ندیم کے ہونٹوں پر ابھی تک پرسکون مسکراہٹ تھی۔

''جی کہیے......!''

عائشہ نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ندیم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی ایک طرف روکتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کو کیسا لگتا ہوں......؟''

''جی......؟''

عائشہ نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی......!''

''کیا میں آپ کو بہت برا لگتا ہوں......؟''

ندیم نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی نہیں......!''

عائشہ کے لہجے میں بے زاری تھی۔

''تو کیا بہت اچھا لگتا ہوں......؟''

''مجھے معلوم نہیں......!''

عائشہ نے مختصراً کہا۔

''اوکے......! اس کا مطب ہے، بات بن سکتی ہے......؟''

ندیم نے ہنس کر کہا۔

''دیکھیے......! میں......''

عائشہ، مبارک کے بارے میں بتاتے بتاتے جھجک گئی۔

''آپ کچھ کہہ رہی تھیں......؟''

ندیم نے آئینے میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......!''

عائشہ نے آہستہ سے کہا اور ندیم نے گاڑی کا رُخ ان کے گھر کی سمت موڑ دیا۔

''آپ روشی کو ساتھ نہیں لیں گے......؟''

عائشہ نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ خود ہی گھر پہنچ جائے گی۔''

گاڑی روک کر ندیم نے خدا حافظ کہا اور گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

عید کے روز روشی نے ان سب کو اپنے گھر مدعو کیا اور پہلی بار دعوت کے سلسلے میں روشی کا بھائی ندیم بھی ان کے گھر کہنے آیا۔ عائشہ کی امی نے پہلے تو انکار کیا مگر روشی کے اصرار کو دیکھتے ہوئے حامی بھر لی۔

جانے سے قبل روشی نے اسے اپنی طرف سے سبز ستاروں بھری ساڑھی عید کے تحفے کے طور پر پیش کی۔ عائشہ پوچھنا چاہتی تھی، مگر گھر والوں کے سامنے نہ بول سکی۔

عید کے بعد یونیورسٹی میں عائشہ دھڑکتے دل کے ساتھ روشی کے ہمراہ داخل ہوگی تو مبارک لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ عائشہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر روشی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

''مس روشی اور عائشہ صاحبہ......! عید مبارک......!''

مبارک کی آواز سن کر ان کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ عائشہ نے خاص روایتی انداز میں پلٹ کر مبارک باد دی اور روشی نے تھینک یوں کہا۔

''کہیئے......! عید کیسی گزری......؟''

مبارک نے پوچھا تو اگرچہ عائشہ سے تھا، مگر مخاطب روشی سے تھا۔

''ایک دم فرسٹ کلاس......!''

روشی نے مسکرا کر کہا۔

''آپ کی عید کیسی گزری......؟''

''ہماری عید......؟ بس گزر ہی گئی، جیسی بھی گزری......؟''

مبارک نے عائشہ کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔

''تب تو بہت بری گزری......؟''

روشی نے افسوس کا اظہار کیا۔

''ویسے اگر مجھے معلوم ہوتا آپ کی عید اتنی خراب گزرے گی تو میں عائشہ کے ساتھ آپ کو بھی اپنے گھر مدعو کر لیتی۔''

''کیا مطلب......؟ کیا عائشہ آپ کے گھر مدعو تھی......؟''

مبارک نے حیرت سے کہا۔

''جی......! آپ کو کوئی اعتراض ہے......؟''

روشی نے ایک ادا سے ہنس کر مبارک سے کہا۔

''اوہ......نو......نو......! بالکل نہیں......! یہ آزادی کا دور ہے۔ ہر انسان کو آزادی کا حق ہونا چاہئے......! کیوں عائشہ......؟''

اس کا مقصد سمجھ کر عائشہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ارے ہاں......! ہمارے ایک نئے پروفیسر آ رہے ہیں۔ ہم لوگ ان کے لئے ایک دعوت کا انتظام کر رہے ہیں، جس کو عید ملن پارٹی کا نام دیا گیا ہے۔ آپ لوگ اگر اس میں شرکت کریں تو اچھا ہے......!''

مبارک نے انہیں دعوت دی۔

''کیوں نہیں......؟''

روشی نے بیگ کھول کر کچھ رقم اس کی جانب بڑھائی۔

''یہ میرے اور عائشہ کی طرف سے سمجھ لیجئے......!''

''آپ آج کل عائشہ پر بہت مہربان نظر آتی ہیں۔''

مبارک نے پچاس کا نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

''عائشہ سے میں وصول کر چکا ہوں۔''

''کب......؟''

روشی چونکتے ہوئے بولی۔

''عائشہ میرے ساتھ آئی ہے اور تب سے میرے ہی پاس کھڑی ہے......؟''

''آپ کے خیال میں میں جھوٹ بول رہا ہوں......؟''

مبارک نے سخت لہجے میں کہا۔

''کیوں عائشہ......؟ تم نے پیسے دیئے ہیں......؟''

روشی کو کچھ اور نہ سوجھا تو عائشہ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

''نہیں تو......!''

عائشہ بوکھلا کر بولی۔ مبارک نے گھور کر اس کو دیکھا اور واپس مُڑ گیا۔

پہلا پیریڈ اٹینڈ کر کے وہ باہر نکلی ہی تھی کہ روشی نے پریشانی سے عائشہ سے کہا۔

''چلو عائشہ......! تم بھی میرے ساتھ گھر چلو......! بھیا کی طبیعت خراب ہے۔ فون آیا ہے۔''

''مگر میں کیوں چلوں......؟ تم جاؤ ناں......! تمہارا بھائی ہے۔''

عائشہ نے کچھ سخت لہجے میں کہا تو روشی کو اکیلے ہی جانا پڑا۔ عائشہ کچھ دیر کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر جیسے ہی پلٹی، مبارک سے ٹکرا گئی، جو اس

کے بے حد قریب کھڑا اس کو تک رہا تھا۔

''کینٹین میں چلی آؤ......!''

مبارک نے کہا اور خود آگے آگے چل دیا۔

''عید کیسی گزری......؟''

مبارک نے بیٹھتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''بتایا تو...... اچھی گزری......!''

''میں یاد آیا تھا......؟''

مبارک نے مسکرا کر پوچھا۔ عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''میں نے تم سے ملنے کا کہا تھا مگر تم آئیں نہیں......؟''

مبارک دل کا شکوہ زبان پر لے آیا۔

''تم میری مجبوریاں اچھی طرح سمجھتے ہو پھر بھی......؟''

''بھئی......! کیا تم ہر وقت اپنی مجبوریوں کا رونا روتی رہتی ہو......؟ محبت بزدل انسانوں کا کھیل نہیں......! محبت کرنے والے بے خوف و خطر اس میدان میں کودتے ہیں اور ایک تم ہو کہ گھر نہ آنا......؟ امی کو کیا کہوں گی......؟ روشی کے سامنے بات کرنا، وہ کیا سوچے گی......؟ اور اگر اِدھر اُدھر ملنے کا کہو تو مجبوریاں آڑے آجاتی ہیں......؟ کبھی تو ان سب بندھنوں سے آزاد ہو کر مجھ سے ملو......! صرف میری بن کر......!

ارے ہاں......! یاد آیا......!''

مبارک ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''یہ ساڑھی لو......! عید ملن پارٹی میں ساڑھی پہن کر آنا......!''

عائشہ نے کچھ کہنا چاہا تو مبارک جھلا گیا۔

"اب میں ساڑھی کے معاملے میں کوئی مجبوری نہیں سنوں گا۔"

"ٹھیک ہے......! پہن آؤں گی۔"

عائشہ نے کہا تو مبارک ہنس کر بولا۔

"یہ پہلی بات کی ہے تم نے دل خوش کرنے والی......!"

"ہاں......! مجھے بے شک جوتے پڑ جائیں، تم اپنا دل ضرور خوش کر لو......!"

عائشہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تو مبارک مسکراتے مسکراتے یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"اب کیا ہوا......؟"

عائشہ نے اسے برا سا منہ بناتے دیکھ کر پوچھا۔

"کوئی تمہاری تلاش میں آ رہا ہے۔"

مبارک پھر دانت پیس کر عائشہ سے بولا۔

"یہ لڑکی شیطان کی طرح چوبیس گھنٹے سر پر مسلط رہتی ہے۔ وہ دیکھو باہر......!"

مبارک نے کینٹین کے دریچے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے یونیورسٹی کا لان نظر آ رہا تھا۔ عائشہ نے شفاف شیشے کے باہر جھانکا تو روشی پریشان سی شاید اسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

"مبارک......! پلیز......! اب تم جاؤ......!"

عائشہ روشی کو دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہرگز نہیں......! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، بزدلی کا مظاہرہ مت کرو......! آتی ہے تو آنے دو......!"

"مگر اس کے تو بھائی کی طبیعت خراب تھی......؟ یہ اچانک کیسے آ گئی......؟"

"جیسے بھی آئی، اب آنے دو......! آج اسے بھی دیکھ لوں گا۔"

اتنے میں روشی دروازے میں کھڑی نظر آئی۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

"جل تو جلال تو......! آئی بلا......"

مبارک نے اتنا ہی کہا تھا کہ عائشہ کو ہنسی آ گئی۔

"عائشہ......! تم یہاں ہو......؟ میں باہر تمہیں تلاش کر رہی تھی۔"

روشی نے گھورنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"مگر تم تو گھر گئی تھیں......؟ پھر یہاں کیسے......؟"

"ندیم بھائی تو بالکل ٹھیک ہیں۔ نہ جانے کس کم بخت نے مجھے فون کر کے پریشان کیا......؟"

عائشہ نے نظر اُٹھا کر مبارک کو دیکھا اور پھر جیسے سب کچھ سمجھ گئی۔ مبارک کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ روشی کو چڑا رہا ہو۔

"اچھا......! عاشی ڈیئر......! میں چلتا ہوں۔"

مبارک نے عائشہ کے بجائے عاشی کہا اور اُٹھ گیا۔ اس کے جاتے ہی روشی عائشہ سے اُلٹے سیدھے سوال پوچھنے لگی۔

عید ملن پارٹی کا وقت شام چھ بجے رکھا گیا تھا۔ مگر طالب علم لڑکے

لڑکیوں کی آمد کا سلسلہ چھ بجے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ مبارک گاڑی لاک کر کے باہر نکلا تو عائشہ کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ کیونکہ اس کی دی ہوئی ساڑھی میں ملبوس وہ ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں وہ ایک سائے کی مانند لگ رہی تھی۔

شام کی سیاہ چادر آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ روشنی اور تاریکی کا یہ امتزاج بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ مبارک سیدھا اس کی جانب آیا۔

”عاشی......! یہ تم نے دُلہنوں کی طرح سر پر آنچل کیوں اوڑھ رکھا ہے......؟“

مبارک نے پیار سے اس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم......؟“

اس نے گھورتے ہوئے روشی کو دیکھا۔

”یہ ساڑھی تو میں نے......“

”عائشہ کو دی تھی......؟“

روشی نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”اور اس نے مجھے بطور گفٹ دے دی۔ کیونکہ وہ میری بہت ہی پیاری پیاری سی بھابی بننے والی ہے۔ اس کی منگنی میرے بھیا سے ہو رہی ہے۔“

وہ مبارک کو حیران اور پریشان چھوڑ کر لان کے اس حصے میں آگئی جہاں روشنیوں کا انتظام تھا۔ مبارک کچھ دیر تو کھڑا اپنے آپ پر قابو پاتا رہا

پھر خود بھی اُدھر چلا آیا۔ مگر اچانک وہ رُک گیا۔ عائشہ سبز ستاروں بھری ساڑھی پہنے روشی کے پاس کھڑی تھی اور روشی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

”عاشی......! بھیا تمہیں اپنی دی ہوئی ساڑھی میں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے اور تمہاری بے حد تعریف کر رہے تھے۔“

عائشہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ پوچھنے ہی والی تھی کہ یہ ساڑھی تو تم نے مجھے دی ہے، پھر تمہارے بھائی کا ذکر کیسے نکل آیا......؟

مگر اچانک مبارک پر نظر پڑ گئی۔ وہ کھڑا عائشہ کو گھور رہا تھا۔ عائشہ نے نظریں چرا کر سر جھکا لیا۔ وہ جانتی تھی مبارک اسے اپنی پسندیدہ ساڑھی میں نہ دیکھ کر غصے میں آیا ہے اور سب سے زیادہ غصہ تو اسے اس بات پر آیا ہوگا کہ اس کی دی ہوئی ساڑھی روشی نے پہن رکھی تھی۔

اب عائشہ اسے کیسے بتاتی کہ کل اس نے سوچا تھا کہ وہ یونیورسٹی آتے ہوئے روشی کے گھر ساڑھی لے کر وہیں سے تیار ہو کر جائے گی، مگر روشی نے خود ہی وہ ساڑھی پہن لی تھی اور سبز ساڑی اسے پہنا دی تھی۔

مبارک کا ذہن بری طرح اُلجھ گیا۔ کچھ لمحے وہ کھڑا عائشہ کو گھورتا رہا۔ پھر پارٹی چھوڑ کر چلا گیا۔ اُدھر روشی اپنی کامیابی پر پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں ہمیشہ جو چاہا تھا، پایا تھا اور اب مبارک تک پہنچنے میں اسے پہلی کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔

تقریب کے اختتام تک وہ بات بے بات خواہ مخواہ ہنستی رہی۔

پارٹی سے اگلے روز عائشہ یونیورسٹی گئی مگر مبارک نہیں آیا تھا۔ عائشہ نے سارا وقت اس کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا۔ دو تین دن بعد اس

کے دوستوں سے پتا چلا کہ اس کو سخت بخار ہے۔

عائشہ نے سنا تو تڑپ کر رہ گئی مگر چاہنے کے باوجود اس کی عیادت کو نہ جاسکی۔

ایک ہفتے بعد وہ خود ہی تندرست ہو کر یونیورسٹی چلا آیا۔ سب نے اس کا حال دریافت کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

''اپنوں کی مہربانیاں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں تو غم کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔''

مبارک یہ کہہ کر کینٹین کی طرف چلا گیا۔ عائشہ کچھ دیر کھڑی روشی کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچتی رہی۔ پھر پہلی بار اپنی بزدلی کے خول سے نکل کر اس نے مبارک کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔

''کہاں چلیں......؟''

روشی اس کا ارادہ سمجھ کر بولی۔

''مبارک کے پاس......! اور کہاں......؟''

عائشہ نے اپنے اندر جرأت پیدا کر ہی لی تھی۔

''میں بھی چلوں......؟''

روشی نے فکرمند چہرے کے ساتھ پوچھا۔

''شکریہ......!''

عائشہ نے خشک لہجے میں کہا اور چلی گئی۔

مبارک دریچے کے قریب کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

عائشہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیسے ہو......؟''

وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے سخت خفا ہے۔

''تم نے باہر مجھے نہیں دیکھا، میں نے کہا تو تھا کہ میں ٹھیک ہوں......!''

مبارک نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''طبیعت ہی تو ہے، کب خراب ہو جائے......؟ کیا بھروسہ......؟''

''میں تمہاری عیادت کو آنا چاہتی تھی مگر افسوس......! آ نہ سکی۔''

عائشہ نے اپنی مجبوری بیان کی۔

''میں نے تم سے شکوہ تو نہیں کیا......؟''

مبارک نے لاپرواہی سے کہا۔

''ارے ہاں......! چائے پیئو گی یا......''

''تم کیسی بے رُخی کی باتیں کر رہے ہو......؟ یہ اجنبی سا لہجہ اور یہ پرائی آنکھوں سے مجھے تکنا......؟''

''جب انسان پرایا ہو تو پرایا بننا ہی پڑتا ہے۔''

مبارک کا لہجہ پہلے جیسا تھا۔

''تم جو کہنا چاہتے ہو، سیدھی طرح کہو......! پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو......؟''

عائشہ نے کہا۔

''پہیلی تو اب رہی نہیں......! تم اپنی جگہ خوش اور میں......؟ میں بھی

شاید کبھی خوش ہو ہی جاؤں......؟''

''مبارک......! پلیز......! مجھے میری غلطی، میرا قصور تو بتاؤ......! یوں ہی ناراض ہونے کا تمہیں حق نہیں......!''

عائشہ رو دینے کو تھی۔

''روشی کو ساڑھی کیوں دی تھی......؟''

وہ دبے دبے لہجے میں دہاڑ کر عائشہ سے بولا۔

''وہ ساڑھی...... وہ دراصل مبارک......! وہ......''

''دیکھو عائشہ......! میں جھوٹ سننا بالکل پسند نہیں کرتا۔ اپنی زندگی میں نہ کبھی میں نے جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ سے جھوٹ بولے۔ یہ یونیورسٹی ہے، یہاں تمہیں ہر رنگ کے لوگ ملیں گے عاشی......! آخر تمہیں اتنا عرصہ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی......؟ تم پہلے ہی کہہ دیتیں کہ تمہیں روشی کا بھائی پسند آ گیا ہے......؟ میں تمہیں خود ہی چھوڑ کر الگ ہو جاتا۔ اگرچہ یہ ناممکن سی بات تھی مگر انسان......''

اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

''انسان نارمل ہو ہی جاتا ہے۔''

''تم سے کس نے کہا میں اس کے بھائی کو پسند کرتی ہوں......؟ میں تو اس کے بھائی کو......''

''دیکھا بھی نہیں......؟ یہی کہنا چاہتی ہو نا......؟ میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے عاشی......! کہ میں جھوٹ سننا پسند نہیں کرتا۔''

''مگر مبارک......! میری بھی تو سنو......!''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا......!''

وہ چیخ اُٹھا۔

''چاند رات کو بھی تم انارکلی روشی اور اس کے بھائی کے ساتھ آئی تھیں۔ مگر مجھ سے تم نے کہا کہ تم اپنے کچھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آئی ہو۔ میرے پیار کی پہلی نشانی بھی تم نے کسی اور کی نذر کر دی...... اور اب تمہاری منگنی روشی کے بھائی سے ہو رہی ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں......؟

تم چاہتی ہوگی مجھے وقت کے وقت پتا چلے اور میں صدمے سے پاگل ہو جاؤں......؟ یا اپنے حواس کھو بیٹھوں......؟

مگر عائشہ ڈیئر......! تمہارا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ میں ایک برس کا تھا جب میرے ڈیڈی ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ممی نے اپنی زندگی کے قیمتی سال میری پرورش کی نذر کر دیئے۔ تمہیں بھولنا اگرچہ ناممکن سی بات ہے مگر اپنی اس عظیم ماں کے لئے زندہ لاش بن کر بھی جینا پڑا تو جی لوں گا۔''

مبارک یہ کہہ کر میز کھسکا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور عائشہ آنکھوں میں آنسو لئے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اپنے بارے میں کوئی وضاحت کوئی صفائی پیش نہ کر سکی تھی۔ بے چین ہوتے دل کو سنبھالتے ہوئے وہ اُٹھ کر گھر چلی آئی۔

ماں نے جلدی گھر آنے کا سبب پوچھا مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کے حواس تو اب وقت معطل اور ذہن ماؤف تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بے گناہی کا یقین مبارک کو کیسے دلائے......؟ وہ اسے کیسے سمجھائے کہ وہ صرف اور صرف اسی کی ہے......؟

مسلسل سوچنے کی وجہ سے وہ جو بستر پر پڑی تو ایک ہفتہ اُٹھ ہی نہ سکی۔ روشی اور ندیم روزانہ عیادت کو آتے، ایک ہفتے بعد جب اس کا بخار ہلکا ہوا تو ماں کی باتوں نے اسے پھر بیمار ہونے پر مجبور کر دیا۔

”عاشی......! عید کے روز روشی کی امی نے تمہارے رشتے کی بات کی تھی۔ کافی سوچنے کے بعد ہم نے ہاں کر دی ہے۔ تمہیں یہ رشتہ پسند تو ہے......؟“

”ہاں کر کے آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں امی......؟ خدا کے لئے سوچئے......! ان کا اور ہمارا کیا جوڑ ہے......؟ کیا ضرورت تھی وہاں ہاں کرنے کی......؟ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا......؟“

”میں نے تم سے بات کی ہے، رائے نہیں مانگی......! بے حد اچھے لوگ ہیں۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی، اور پھر کون سا تمہارا باپ زندہ ہے......؟ یونیورسٹی تک تمہیں پڑھا دیا، اسے ہی کافی سمجھو......!“

”پڑھائی میں نے وظیفے سے حاصل کی ہے۔“

عائشہ کو بھی غصہ آ گیا۔

”زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں......! ہم لوگ ہاں کر چکے ہیں۔“

ماں اسے ڈانٹتے ہوئے اُٹھ گئی اور وہ بھی خاموش بیٹھی سوچتی رہی۔

منگنی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ مگر عائشہ کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے اور بگڑنے لگی۔ اس کے باوجود منگنی ملتوی نہ ہوئی۔ چھوٹی سی سادہ سی تقریب ہوئی جس میں سب کی موجودگی میں روشی کی امی نے اسے اُنگوٹھی پہنائی۔

کچھ دیر وہ لوگ عائشہ کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھ گئے اور روشی اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

”جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ......! بھیا شادی کی شاپنگ تمہیں ساتھ لے جا کر کرنا چاہتے ہیں۔“

اور عائشہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

یونیورسٹی گئے اسے ایک ماہ ہو چکا تھا مگر کوئی اس کی عیادت کو نہیں آیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یونیورسٹی میں روشی نے کہہ دیا تھا کہ وہ آج کل اپنی منگنی کی تیاری میں مصروف ہے۔

عائشہ کا خود بھی یونیورسٹی جانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اسے مبارک پر بھی غصہ تھا، جس نے بغیر کچھ جانے بوجھے یک طرفہ طور پر فیصلہ کر کے اسے سزا دی تھی۔

اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ اپنے کمرے سے باہر آ بیٹھی۔ اتنے میں روشی بھی آ گئی۔ عائشہ کو ٹھیک دیکھ کر بولی۔

”عاشی......! صبح تم یونیورسٹی چلو گی......؟“

عائشہ نے غصے سے اسے دیکھا اور نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

”میں تمہارے مقصد کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم بڑے لوگ آخر اتنے بے ضمیر کیوں ہوتے ہو......؟ تمہارا ضمیر مردہ کیوں ہوتا ہے......؟“

اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

”کیا مطلب......؟“

روشی نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تم مطلب سمجھ کر کیا کرو گی......؟ تمہارے لئے تو ضمیر کی ملامت بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ صبح مجھے یونیورسٹی لے جا کر تم اپنی کامیابیوں کا مشاہدہ کرنا چاہتی ہو......؟ دوستی کے مقدس رشتے کی آڑ لے کر تم نے کتنا گھناؤنا کھیل کھیلا ہے......؟ میں تمہیں......"

عائشہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر ایاز کے کمرے میں داخل ہونے کی وجہ سے بات قطع ہوگئی۔ روشی کچھ دیر بیٹھی ایاز سے باتیں کرتی رہی، پھر چلی گئی۔

عاشی کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔ مگر کچھ دنوں سے نہ ہی ندیم آیا تھا، اور نہ ہی روشی۔ وہ ان ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ایاز اس کے قریب آ بیٹھا اور باتیں کرتے ہوئے بولا۔

"عاشی......! تمہیں روشی کیسی لگتی ہے......؟"

"یہ روشی کا ذکر کہاں سے نکل آیا......؟"

عائشہ نے غور سے بھائی کو دیکھا۔

"عاشی......! تم باتوں ہی باتوں میں روشی کا عندیہ تو پوچھو......! کیا وہ اس گھر میں آنا پسند کرے گی......؟"

"بھیا......! سائے کا تعاقب کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہم زمین کے باسی ہیں، آسمان کو دیکھ سکتے ہیں مگر چھو نہیں سکتے۔ آپ اگر یہ کہیں کہ میں آسمان پر کیسے چلی گئی......؟ تو میں اپنی خواہش سے نہیں گی۔ رہی روشی کی بات......! تو اس نے مجھ سے میری اتنی قیمتی چیز چھینی ہے جس کے بغیر میں زندگی کا تصور نہیں کر سکتی۔ مجھے نہیں معلوم میں زندہ رہوں گی یا نہیں......؟"

عائشہ رونے لگی تھی۔

"ایسی کیا چیز چھینی ہے روشی نے......؟"

ایاز پیار سے پوچھنے لگے۔ عائشہ کے جواب دینے سے قبل ہی امی اندر داخل ہوئیں اور پوچھا کہ روشی کہاں ہے......؟

"کیا مطلب......؟ کیا روشی آئی تھی......؟"

ایاز چونک کر پوچھنے لگے۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو آئی تھی اور میں نے اسے بیٹھک میں بھیجا تھا۔"

ماں نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے وہ سب باتیں سن کر چلی گئی......؟"

ایاز نے کہا اور خود بھی اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

"عائشہ......! تم جلدی سے تیار ہو جاؤ......! بازار جانا ہے شاپنگ کے لئے......!"

عائشہ ماں کی بات پر بولی۔

"امی......! جی شادی آپ نے اپنی مرضی سے طے کی ہے، تو شاپنگ بھی اپنی پسند سے کر لیجئے......! مجھے کوئی اعتراض نہیں......!"

عائشہ نے کہا۔

صبح ابھی وہ ناشتہ کر ہی رہی تھی کہ روشی آ گئی۔ وہ ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی خوش گوار موڈ میں تھی۔

"عائشہ......! یونیورسٹی چلو گی......؟"

"کیوں نہیں......؟ اب تو اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔"

عائشہ کے بولنے سے قبل ہی ماں نے جواب دیا۔ اور عائشہ خاموشی سے تیار ہونے کے لئے چلی گئی۔

باہر گاڑی میں نہ ڈرائیور نہ ندیم۔ روشی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور عائشہ، مبارک کے بارے میں سوچنے لگی۔ یونیورسٹی پہنچ کر گاڑی رُکی تو عائشہ کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

مبارک اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے یوں کھڑا تھا جیسے ان ہی کا منتظر ہو۔ عائشہ کپکپاتی ہوئی ٹانگوں سے باہر آئی۔ بمشکل دو قدم اُٹھائے تھے کہ مبارک تیزی سے اس کی جانب آیا۔

عائشہ نے بے بسی سے اس کو دیکھا۔

"یہ نہ جانے آج کیا کہے......؟"

مگر اس نے کچھ کہنے کی بجائے عائشہ کا ہاتھ پکڑا اور فرنٹ سیٹ پر اسے دھکیلتے ہوئے خود بھی جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ عائشہ حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی مگر کچھ پوچھا نہیں۔

بیس منٹ بعد گاڑی ایک خوب صورت بنگلے کے سامنے رُکی اور چوکیدار کے گیٹ کھولتے ہی مبارک گاڑی اندر لے گیا۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے......؟"

عائشہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"بھئی......! ممی سے وعدہ کیا تھا کہ آج تمہیں ضرور لے کر آؤں گا اور تم تو جانتی ہو، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، تو تمہیں لے آیا۔"

"مگر میں...... میں تو اب......"

"کسی اور کی امانت ہوں......؟ یہی بات کہنا چاہتی ہو ناں......؟"

"ہاں......! اور یہ ایک حقیقت ہے۔ بہتر ہوگا تم مجھے واپس چھوڑ آؤ......!"

عائشہ نے کہا۔

مبارک نے اس کی بات سنی اور اَن سنی کر دی۔ نوکر کو آواز دی۔

"بڑی بیگم صاحبہ کہاں ہیں......؟"

"جی......! وہ تو باہر گئی ہیں۔"

ملازم نے ادب سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے......! ان سے ملو......! یہ چھوٹی بیگم صاحبہ ہیں۔"

مبارک نے سہمی کانپتی عائشہ کو اور بھی ڈرا دیا۔ سب ملازموں نے سلام کیا مگر عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا تو مبارک نے اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گونگی ہے......!"

سب نوکروں کی دبی دبی ہنسی نکل گئی اور مبارک اسے لئے اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو......؟"

عائشہ نے بگڑ کر غصے سے پوچھا۔

"سنو عاشی......! میں نے تمہیں ایک بار پہلے بھی کہا تھا کہ پیار کرنے والے کسی سے ڈرتے نہیں......! تم نے مجھے پہلے ہی سب کچھ کیوں نہ بتا دیا......؟ وہ تو شکر ہے، خدا نے انسان کو ضمیر جیسی ایک عظیم نعمت سے نوازا

ہے۔ اسی ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر روشی نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ مگر تم کافی کمزور ہوگئی ہو۔ روشی نے تو کسی کو بتایا ہی نہیں کہ تم بیمار ہو......؟“

عائشہ روتے ہوئے بولی۔

”آج تم پھر شکوہ کر رہے ہو......! تم نے مجھ سے کب پوچھا تھا......؟ تم تو روایتی مردوں کی طرح اپنا غصہ نکال کر چلتے بنے تھے اور میں......“

عائشہ باقاعدہ رونے لگی۔

”عاشی ڈیئر......! مجھے معاف کر دو......!“

مبارک نے افسردگی سے کہا۔

اتنے میں ملازم چائے لے کر آ گیا۔ چائے رکھ کر وہ عائشہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے باہر چلا گیا اور مبارک بھی مسکرانے لگا۔ پھر خود ہی میز کو قریب کھینچ کر چائے بنانے لگا۔

”لاؤ......! میں بناتی ہوں......!“

عائشہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”نہ نہ......! تم مہمان ہو......! اور پہلی بار آئی ہو۔ میں خود ہی بناؤں گا۔“

مبارک نے چائے بنا کر کپ اس کی جانب بڑھایا ہی تھا کہ ممی بھی آ گئیں۔ وہ بہت دیر تک مبارک کی ممی سے باتیں کرتی رہی اور پھر مبارک اسے یونیورسٹی چھوڑ گیا۔

واپسی پر ہمیشہ کی طرح روشی اسے گھر چھوڑنے آئی اور واپس جانے

کی بجائے خود بھی عائشہ کے ساتھ اندر آ گئی۔

”روشی......! تم بیٹھک میں بیٹھو......! میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔“

عائشہ نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ خود بھی روشی کے اس بدلے ہوئے روّیے کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔

روشی بیٹھک میں داخل ہوئی تو ایاز دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ روشی کو سامنے دیکھ کر چونک پڑا۔ روشی نے سلام کیا تو ایاز بولے۔

”کھانا کھائیں گی آپ......؟“

”کیوں نہیں......؟“

روشی نے کہا۔

”مگر اس سے پہلے چند باتیں ہو جائیں تو کیا ہی اچھا ہو......؟“

”ضرور......!“

ایاز نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے۔

”کیا آپ مجھے بہت زیادہ چاہتے ہیں......؟“

روشی نے اچانک ایاز سے سوال کیا۔

”کیا یہ بتانا بہت ضروری ہے......؟ تم نے خود کبھی کچھ محسوس نہیں کیا......؟“

ایاز نے مدہم لہجے میں کہا۔

”میں کچھ غلط راستوں کی سمت مُڑ گئی تھی۔ مگر اب......“

عائشہ کو دیکھ کر روشی خاموش ہوگئی۔

''ارے......! بھائی جان......! آپ بھی یہیں ہیں......؟''

''ہاں......!''

ایاز نے مسکرا کر کہا اور روشی بولی۔

''عاشی......! اس دن تم نے کہا تھا کہ انسان کے پاس ضمیر نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور تم نے کہا تھا، بڑے لوگوں کے ضمیر مردہ کیوں ہوتے ہیں......؟ تمہارے اس جملے نے میرے اندر ایک آگ سی لگا دی تھی اور پھر کل تمہاری اور ایاز کی باتیں سن کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے پاس بھی ضمیر نام کی کوئی چیز ہے اور میرا ضمیر بھی زندہ ہوگیا۔

میں جو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے تم سے تمہارا حق چھین رہی تھی، اور تم صرف غریب ہونے کی وجہ سے اپنے حق کے لئے کوئی جدوجہد بھی نہیں کر سکتی تھیں، دولت کی چمک سے اندھا ہو کر جب انسان اچھے برے کی تمیز کھو دیتا ہے تو صرف انسان کا ضمیر ہی اسے صحیح راستہ دکھاتا ہے اور ہر انسان کے ضمیر کو زندہ ہونا چاہئے، مردہ نہیں......!''

''روشی......! یہ تم کہہ رہی ہو......؟''

عائشہ مارے محبت کے اس سے لپٹ گئی۔

''ہاں عاشی......! یہ میں ہی کہہ رہی ہوں۔ جو رشتہ میں نے اپنے مفاد کے لئے طے کیا تھا، آج اسے بھی ختم کرتی ہوں۔''

روشی نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اُتار لی۔ پھر ٹھہرے ٹھہرے ٹھوس لہجے میں بولی۔

''ایک رشتہ توڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگر دوسرا جوڑ لیا

جائے......!''

روشی نے وہی انگوٹھی ایاز کی اُنگلی میں پہنا دی اور پھر عائشہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''اب تمہارے راستے میں جو بھی دیوار آئے گی، اسے میں خود گراؤں گی۔''

عائشہ نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔

''جب تک انسان کا ضمیر زندہ ہے، وہ مر نہیں سکتا۔''



محافظ

عرفان کتنی دیر سے کھڑا اس کو سوچوں میں گم دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ماحول ہی سے نہیں بلکہ اپنے آپ تک سے بے گانہ تھی۔ سر جھکائے نہ جانے کس سوچ میں مستغرق تھی......؟

کچھ سوچ کر عرفان اس کے قریب جا بیٹھا۔

"کیا سوچ رہی ہو......؟"

عرفان نے اس کے گالوں پر چمکتی افشاں کو ایک نظر دیکھتے ہوئے رسان سے پوچھا۔

"تم سے مطلب......؟"

شازیہ جیسے کاٹنے کو دوڑی۔

"نہیں بتانا چاہتیں تو مت بتاؤ......! ویسے میں......"

عرفان رُک کر شرارت سے مسکرایا۔

"جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو......؟"

"کیا سوچ رہی ہوں......؟"

شازیہ نے بے ساختہ پوچھا۔

"یہی کہ رات کو اکیلے کمرے میں ڈر لگے گا۔ ویسے اگر تم کہو تو میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں......؟"

"ایڈیٹ......! یو فول......!"

شازیہ غصے سے اسے برا بھلا کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نہیں ڈرتی ورتی کسی چیز سے......! اور تم بھی کان کھول کر سن لو......! میں صرف بھابی کی وجہ سے تمہارا لحاظ کرتی ہوں ورنہ تم جانتے ہو میں کتنی بدتمیز ہوں۔"

"جی ہاں......! اس گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کے بدتمیز ہونے کا ثبوت مل گیا تھا۔ لیکن کیا کروں......؟ بدتمیز ہونے کے باوجود یہ دل آپ کو پسند کرنے کی غلطی کر بیٹھا ہے۔"

وہ منہ بنا کر بولا۔

"اوہ......شٹ اَپ......!"

شازیہ دانت پیستی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور غصے کے اظہار کے طور پر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

سب گھر والوں کی خواہش تھی کہ شازیہ اور عالیہ کی شادی ایک ساتھ ہو۔ تا کہ پھر ماں باپ پر مزید کوئی بوجھ نہ رہے۔ مگر شازیہ نے جو ضد کی تھی، وہ پوری ہوئی، اور عالیہ اکیلی دُلہن بن کر پیا کے دیس چلی گئی۔

عالیہ کی شادی کے دوسرے دن وہ بیٹھی اپنی ماں کی باتیں سن رہی تھی

مگر کچھ عرفان کا خیال اور تھکن کے باعث خاموش تھی۔

"بس......! اب شازیہ کا فرض باقی رہ گیا۔"

ماں نے کہا تو شازیہ نے برا منہ بنا لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا، آخر اس لڑکی نے کیا سوچ کر انکار کیا ہے......؟"

"آنٹی......! دراصل یہ بھی آج کل ایک فیشن ہوگیا ہے۔"

عرفان نے اسے جلانے کے لئے کہا۔

شازیہ کی امی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا فیشن......؟"

"یہی کہ پہلے شادی سے انکار اور پھر......"

عرفان نے کہا تو شازیہ نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔

بھابی جلدی سے بولیں۔

"ارے بابا......! اب ختم کرو یہ سب قصے......؟"

شازیہ نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر وجہ نہ بتائی تھی۔ بہت پوچھنے پر بھی یہی کہتی تھی کہ میں شادی نہیں کروں گی۔

وہ دو بہنیں تھیں، اور ایک بھائی، جس کی شادی ہو چکی تھی۔ عالیہ، شازیہ سے بڑی تھی مگر دونوں بہنوں میں محبت بہت تھی۔ جب عالیہ اور اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس نے بغیر وجہ بتائے انکار کر دیا۔ چونکہ عالیہ بڑی تھی، اس لئے سب گھر والوں نے یہی فیصلہ کیا کہ پہلے عالیہ کی شادی ہو جائے، شازیہ جب اکیلی رہ جائے گی تو پتہ چلے گا کہ شادی زندگی

کے لئے کتنی ضروری ہے......؟

ان ہی دنوں بھابی کا بھائی عرفان امریکہ سے چلا آیا اور شازیہ کو پسند کرنے کی غلطی کر بیٹھا۔ مگر شازیہ کو تو جیسے اس سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ اس سے بات تک کرنا پسند نہ کرتی۔ یوں بھی شادی سے وہ پہلے ہی انکار کر چکی تھی۔ عالیہ نے بہت بار پوچھا بھی تھا۔

"اگر تمہیں کوئی اور پسند ہے تو بتا دو اور اگر کسی نے تمہیں دھوکہ دیا ہے تو اس کا ماتم کرنے کی بجائے، بہتر یہ ہوگا کہ اپنا گھر بساؤ......! اور ماں باپ کو بھی اپنا فرض پورا کرنے دو......!"

شازیہ نے یہ سب کچھ بڑے اطمینان سے سنا تھا۔ مگر بولی تو صرف اتنا۔

"کیا مرد کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی......؟ آخر مرد کو عورت کی زندگی میں اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے......؟ یہ صدیوں پہلے کا زمانہ نہیں، جب عورت محض جہالت اور کفالت کی وجہ سے مرد کا سہارا قبول کرتی تھی......؟ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔"

"کیوں......؟ اب زمانے کو کیا ہوگیا ہے......؟"

عالیہ نے بگڑ کر پوچھا۔

"اب عورت تعلیم یافتہ ہے۔ خود کماتی ہے۔ آزادی اس کا حق ہے۔ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں......؟ یہ سب قصے پرانے ہوگئے......؟"

"پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہی ہو......؟ کس آزادی کی بات کر رہی ہو......؟"

عالیہ نے اُلجھ کر کہا۔

''زمانہ بدلنے* سے مرد کی اہمیت پر کوئی حرف نہیں آیا۔ نہ اس کی ضرورت کم ہوئی ہے۔ مرد ہر زمانے میں مرد ہی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ابو اور بھیا کو لے لو......!''

''پلیز......! یہ موضوع بند کر دو......!''

شازیہ نے کروٹ بدل کر کہا اور منہ بنا کر لیٹ گئی۔ مگر عالیہ پریشانی سے اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ جانتی تھی شازیہ تنہا نہیں رہ سکتی۔ اگر وہ سب باہر بیٹھے ہوتے اور شازیہ سے کہتے۔

''جاؤ بھئی......! اپنے کمرے میں فلاں چیز لے آؤ......!''

تو وہ فوراً کہتی۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔ عالیہ کو میرے ساتھ بھیج دیں......!''

اور تو اور وہ اکیلی سوتی تک نہ تھی۔ ہمیشہ عالیہ کے ساتھ سوتی۔ مگر اب اس نے عجیب وغریب فیصل کر کے سب کو پریشان کر دیا تھا۔

عالیہ اکثر سوچتی۔

''ہو سکتا ہے کسی نے اسے دھوکہ دیا ہو......؟ جس کی وجہ سے اسے مردوں سے نفرت ہوگئی......؟''

تاہم اس نے سوچا تھا کہ جب میری شادی ہوگی تو اکیلے رہنے کی وجہ سے کوئی بہتر فیصلہ کر سکے گی۔ لیکن اس نے تو ان سب کو حیرت زدہ کر ڈالا تھا۔ اکیلے کمرے میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دستک کی آواز سن کر شازیہ نے غصے سے دروازہ کھولا۔ اس کا خیال

تھا شاید دستک عرفان نے دی ہے۔ مگر باہر بھابی کھڑی تھیں۔

''شازی......! رومی کو تمہارے پاس بھیج دوں......؟''

انہوں نے پیار سے پوچھا۔

''کیوں......؟''

ان کا مطلب سمجھ کر شازیہ غصے سے بولی۔

''میں جب اکیلی زندگی گزار سکتی ہوں تو کیا اکیلی سو نہیں سکتی......؟''

عرفان ابھی تک وہیں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ پلٹ کر بولا۔

''اور کیا باجی......؟ آپ تو خواہ مخواہ انہیں پریشان کر رہی ہیں۔ یہ اب کوئی بچی تھوڑی ہیں......؟ ماشاء اللہ......! اُنیس برس اور......''

''اوہ......! یو شٹ اَپ......!''

شازیہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

''ویسے باجی......! آپ گھبرائیں نہیں......! میرا کمرہ تو ان کے ساتھ ہے، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو یہ مجھے مدد کے لئے پکار سکتی ہیں۔''

عرفان پھر بھی باز نہ آیا۔

''اونہہ......! تیس مار خان کی شکل تو ذرا دیکھئے......!''

شازیہ نے نفرت سے اسے دیکھا۔ عرفان جانتا تھا کہ شازیہ ڈرپوک ہے۔ اس لئے پُرخلوص لہجے میں بولے۔

''شازیہ......! رومی کو اپنے کمرے میں سونے دو......! ورنہ تم رات میں ڈرو گی۔''

''اُفوہ......! آخر کیا سمجھ رہے ہیں آپ مجھے......؟ ایک چھوٹی سی

بات کو مسئلہ بنا دیا ہے......؟ جسے دیکھو، ہمدردی میں چلا آ رہا ہے۔ کہہ دیا میں نہیں ڈرتی ورتی کسی چیز سے۔ آپ سب میرے کمرے سے چلے جائیں فوراً......!''

ان کے جاتے ہی اس نے غصے سے دروازہ بند کرلیا۔

''یہ لڑکی شاید پاگل ہوگئی ہے......؟''

شازیہ کی بھابی بولیں۔

''جی نہیں......! وہ ہم سب کو پاگل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔''

عرفان نے کہا تو بھابی گھورتے ہوئے بولیں۔

''تم چپ رہو......!''

''جی بہتر......!''

عرفان نے سعادت مندی سے کہا اور اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

شازیہ اکیلی بستر پر لیٹی تھی اور مسلسل ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔

''کیا میں اکیلی اس کمرے میں سوسکوں گی......؟ خیر......! کچھ بھی ہو، سونا تو ہوگا، ورنہ سب مذاق اُڑائیں گے۔''

وہ سونے کی کوشش کرنے لگی، مگر بارہ بج گئے، نیند نے تو جیسے نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

اچانک اس کو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کے باہر کوئی چل رہا ہو۔ مارے خوف کے وہ تکیے میں منہ چھپا کر دُعا کرنے لگی۔

''اللہ میاں......! جلدی جلدی صبح ہو جائے......!''

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور شازیہ کی رہی سہی قوت بھی جواب دے گئی۔ پھر اس نے سرگوشی سنی، جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کا پکار رہا ہو۔ قبل اس کے وہ چیخ مارتی، یا مدد کے لئے کسی کو بلاتی، ساتھ والے گھر سے کراہنے کی آواز آئی۔ شازیہ کو تھوڑا حوصلہ ہوا اور وہ تایا یوسف کے بارے میں سوچنے لگی۔

تایا یوسف اس کے ابو کے بہت گہرے دوست تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ زمین لے کر گھر بنائے تھے۔ دونوں گھروں میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ شازیہ کا کمرہ ان کی دیوار کے ساتھ ہی تھا۔

کچھ دنوں سے تایا یوسف کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر آج تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ زیادہ ہی خراب ہو۔

ان کے دو بیٹے تھے، مگر دونوں ہی شادی کے بعد مستقل ملک سے باہر رہائش اختیار کر چکے تھے۔ وہ دولت کی چمک نے ماں باپ اور وطن کی محبت بھلا دی تھی۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ تنہا یہاں رہتے تھے اور محلے کے سب چھوٹے بڑے ان کو تایا جی کہتے تھے۔

شازیہ ان کے بارے میں سوچتی ہوئی نہ جانے کب نیند کی وادی میں اُتر گئی......؟

صبح وہ نماز پڑھنے کے لئے وضو کر رہی تھی کہ مسجد جاتے ہوئے عرفان اس کے قریب رُک گئے۔

''کمال ہے......! تم زندہ ہو......؟ میں تو سمجھا تھا کہ آپ......''

وہ شرارت سے جملہ اُدھورا چھوڑ کر مسکراتے ہوئے چلے گئے اور

شازیہ کا موڈ صبح ہی صبح خراب ہوگیا۔

ناشتے کی میز پر سب نے اسے حیرت سے دیکھا اور تقریباً سب ہی نے باری باری یہ سوال کیا۔

''شازی......! تم ٹھیک تو ہو......؟''

جب بھیا نے بھی آکر یہی بات پوچھی تو وہ غصے سے اُٹھتی ہوئی بولی۔

''کیا میں رات کو پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے گئی تھی جو آپ سب حضرات باری باری میری خیریت دریافت کر رہے ہیں......؟''

''ارے بھئی......! تم تو برا مان گئیں......؟''

بھیا نے اسے پکڑ کر اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔

''میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا کہ ہماری یہ بہنا کچھ ڈرپوک سی ہے۔''

''پھر وہی بات......؟''

شازیہ غصے سے چیخ پڑی۔

''آخر آپ اس بات کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے......؟ بھول کیوں نہیں جاتے......؟ میں نہیں ڈرتی ورتی اب کسی چیز سے۔''

''جی ہاں......! وہ تو ہم جانتے ہیں مگر......''

عرفان نے کچھ کہنا چاہا۔

''پلیز......! آپ چپ رہیں۔''

شازیہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ بھابی تو چپ رہیں مگر امی بولیں۔

''دفع کرو عرفان......! یہ تو ہے ہی سدا کی بدتمیز......!''

''جی......! دراصل میں بھول گیا تھا۔''

عرفان نے اس کو چڑانے کے لئے کہا اور ناشتہ کرنے لگا۔

ولیمے کے بعد عالیہ آئی، کچھ دن رہی اور شازیہ کے بارے میں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ بھی چلی گئی۔

ادھر شازیہ کا روز کا یہ معمول ہوگیا تھا۔ جب بھی ڈر کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلتی تو تایا جی درد سے کراہ رہے ہوتے۔ شازیہ ان کی کراہیں سن کر مطمئن سی ہو کر سو جاتی جیسے باہر کوئی چوکیدار ہو۔

گھر والے اگرچہ اب اس سے کوئی سوال نہیں پوچھتے تھے، مگر حیران سبھی تھے کہ آخر کیا ماجرا ہوگیا ہے......؟ شازیہ ایک دم اتنی بہادر کیسے ہوگئی......؟

سب سے زیادہ حیرانی عرفان کو تھی۔ اس کا خیال تھا کہ رات کی تنہائی میں جب خوف آئے گا تو ساری اکڑ بھول جائے گی، مگر وہ تو بجائے بھولنے کے کچھ اور اکڑ گئی تھی اور پہلے سے کچھ زیادہ بے پرواہ ہوگئی تھی۔

''عرفان......! ذرا میری بات تو سننا......!''

بھابی نے کہا تو عرفان ان کے کمرے میں چلے آئے۔

''جی فرمایئے......!''

عرفان نے بہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آخر اتنے دنوں سے تم کیا کر رہے ہو......؟''

بھابی نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جھک مار رہا ہے، اور کیا کر رہا ہے......؟''

بھیا نے اندر داخل ہوتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"ارے......! اگر یہ کچھ کر رہا ہوتا تو اس کا نتیجہ کچھ ظاہر نہ ہوتا......؟"

"دیکھئے بھائی جان......! یہ مجھ پر الزام ہے۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ آدھی رات کو کمرے کے باہر چلتا رہا ہوں، روح بن کر سرگوشیوں میں اسے پکارتا رہا ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ دروازے پر دستک بھی دے ڈالی، مگر یہ محترمہ اتنی بہادر تو نظر نہیں آتیں۔ پھر اثر نہ لینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے......؟ میرا خیال ہے وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلے گی......؟ مجھے ہی واپس امریکہ جانا ہوگا۔"

عرفان نے ٹھنڈی آہ بھری اور بھابی ہنستے ہوئے بولیں۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں......! یہ تو بس ذرا لاڈ پیار دیکھ رہے ہیں ہم، ورنہ جب ابو نے فیصلہ کیا تو اسے ہر حال میں ماننا ہوگا۔"

"مجھے تو ایسا نظر نہیں آتا......؟ لیکن اگر آپ کہتی ہیں تو......"

عرفان نے مسکین سی صورت بنائی تو بھیا قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولے۔

"تم جانتے ہو، ہم سب اس کی وجہ سے پریشان ہیں۔ سوچا تھا کہ تمہاری کوئی ترکیب رنگ لائے گی، مگر افسوس......! اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں......!"

"کون سی تدبیریں......؟"

شازیہ پوچھتی ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آپ کی بات نہیں ہو رہی۔ اس لئے آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں......!"

عرفان نے منہ بنا کر اس کو دیکھا۔ سادے فیروزی سوٹ میں اس کا سفید رنگ کچھ زیادہ ہی نکھر رہا تھا۔ بڑا سا دوپٹہ شانوں پر پھیلائے اور بیگ پکڑے وہ روز سے کچھ ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ عرفان کی بات پر اس نے گھور کر عرفان کو دیکھا۔ مگر چپ رہی۔

"کہیں جا رہی ہو......؟"

بھابی نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"جی بھابی......! مجھے بازار جانا ہے۔ اپنی دوست کے لئے گفٹ لینے......!"

شازیہ نے وضاحت کی۔

"شادی ہے کیا کسی دوستی کی......؟"

بھابی نے پھر پوچھا۔

"نہیں بھابی......! سالگرہ ہے۔ بھیا......! پلیز آپ ذرا مجھے بازار لے چلیں......!"

اور بھیا جو اب تک بڑے اطمینان سے کھڑے تھے، اچانک چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا کرتے ہوئے بولے۔

"شازی......! میری تو طبیعت کچھ ناساز ہے۔"

"کیوں......؟ کیا ہوا......؟"

شازیہ ان کے نزدیک چلی آئی

”پیٹ میں کچھ تکلیف سی محسوس کر رہا ہوں۔ شاید رات تک بخار ہو جائے......؟“

انہوں نے کمزور سے آواز میں کہا۔

”تو پھر میں کس کے ساتھ بازار جاؤں......؟“

شازیہ پریشان ہوگئی۔

”تم ایسا کرو......“

بھیا کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔ پھر عرفان کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”تم نے کہا تھا، تم بازار جا رہے ہو......؟“

”جی بھائی جان......! پروگرام تو ہے، آپ کو کچھ منگوانا ہے......؟

”عرفان نے انجان بن کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”منگوانا کیا ہے......؟“

بھابی اسے گھورتی ہوئی بولیں۔

”جب تم بازار جا رہے ہو تو شازیہ کو بھی ساتھ لیتے جاؤ......!“

”میں ان کو ساتھ لے جاؤں......؟“

عرفان نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے شازیہ کو دیکھا۔

”اونہہ......! میں تو جانے کے لئے بے چین ہو رہی ہوں جیسے......؟“

شازیہ نے منہ بنا کر سوچا۔

”عرفان......! بکواس مت کرو......!“

بھابی بولیں۔

”اکیلی جوان لڑکی بھلا کہاں جائے گی......؟“

”ہاں ہاں......!“

بھیا بھی جلدی سے بولے۔

”ساتھ ہی لے جاؤ......! اور ساتھ ہی لے آنا......!“

”جی بہتر......!“

عرفان چابی گھماتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا تو بھابی بولیں۔

”راستے میں کوئی فضول حرکت مت کرنا......!“

”کوشش کروں گا......!“

عرفان مسکرایا۔

”آؤ بھئی......!“

اس نے بے تکلفی سے شازیہ کو پکارا۔

”آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی......؟“

شازیہ نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

”ارے ہاں......! میں تو بھول ہی گیا......؟ آپ تو بہت بہادر ہیں۔ جب اکیلی پوری زندگی گزارنے کا فیصلہ کرسکتی ہیں تو اکیلی بازار تو کیا......؟ پوری دُنیا گھوم سکتی ہیں......؟“

”آپ دیکھ رہی ہیں بھابی......؟“

شازیہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”عرفان......! بکواس مت کرو......!“

بھابی نے اسے ڈانٹا۔

''اور شازیہ......! تم بھی خدمت کرو......! جاؤ شاباش......! چلی جاؤ......! تم کون سا اس سے ڈرتی ہو......؟''

بھابی نے کہا تو شازیہ فوراً بولی۔

''جی ہاں......! میں کون سا کسی سے ڈرتی ہوں......؟ چلیئے......!''

عرفان مسکراتا ہوا باہر آیا۔ موٹر سائیکل نکالی اور شازیہ کو لے کر روانہ ہوگیا۔ مگر بجائے بازار جانے کے شہر کے جدید ترین پارک میں چلا آیا۔

''یہ بازار ہے......؟''

شازیہ نے غرا کر پوچھا۔

''آہستہ بولو......! میں جانتا ہوں تم بہت بدتمیز ہو، مگر یہاں اچھے اچھے لوگ موجود ہیں۔ یوں بھی یہ گھر نہیں ہے کہ تم چیخ چیخ کر بولتی رہو......؟''

عرفان نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور بولا۔

''چلو آؤ......!''

''معاف کرنا......! مجھے پارک دیکھنے کا کوئی شوق نہیں......! میں بہت بارہا دیکھ چکی ہوں۔''

''تو گویا تمہیں یہاں ہجوم میں کھڑے ہونے کا شوق ہے......؟''

عرفان نے آنکھیں نکال کر دیکھا۔

''کیا بکواس ہے......؟ تم تو یوں مجھ پر رعب ڈال رہے ہو جیسے تم میرے......''

''خدا نہ کرے جو میں تم جیسی لڑکی کا ''وہ'' بن جاؤں......؟''

عرفان مسکرایا، پھر سخت لہجے میں بولا۔

''چلتی ہو یا......''

''اچھی بات ہے......!''

شازیہ نے ہار مان لی۔

''اس وقت تو میں چل رہی ہوں، مگر گھر واپسی پر تمہیں بھی دیکھوں گی......؟''

''اچھا......! ہاں......! یہ ٹھیک ہے......!''

عرفان نے لپک کر دو ٹکٹ لئے اور اندر داخل ہوگئے۔ عرفان آگے آگے تھا اور شازیہ جان بوجھ کر تھوڑے فاصلے پر ٹہل رہی تھی۔ ایسے میں ایک لڑکا تیزی سے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔

''ہیلو......!''

شازیہ نے گھبرا کر عرفان کو دیکھا، مگر وہ سیدھا جا رہا تھا اور پھر بھی شازیہ نے فاصلہ برقرار رکھا۔

لڑکے نے شازیہ کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لئے کہا۔

''کوک پئیں گئیں......؟''

شازیہ گھبرا گئی اور عرفان چلتے چلتے رک کر بولا۔

''بھائی......! اگر اجازت ہو تو میں بھی شامل ہو جاؤں......؟''

''کیا......؟''

لڑکے نے حیرت سے اسے دیکھا تو عرفان نے کڑی نظروں سے اسے گھورا اور بولا۔

”اوئے......! چلتا پھرتا نظر آ......! ورنہ......“

لڑکا گھبرا کر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا دوسری جانب چلا گیا۔

عرفان نے شازیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہی جملے سننے کے لئے تم پیچھے چل رہی تھیں ناں......؟ میری ساری توجہ تمہاری ہی جانب تھی۔

شازیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ مصنوعی جھیل کے پاس پہنچ کر وہ رُک گئی۔

”اب کیا ہے......؟“

عرفان نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں پہاڑی پر نہیں جاؤں گی۔“

شازیہ نے صاف انکار کر دیا۔

”اچھی بات ہے......!“

عرفان اسے لئے سامنے والے پارک میں بیٹھ گیا۔ عرفان نے دو آئس کریم لئے۔ ایک اسے دیتے ہوئے بولا۔

”میں کسی ناول کا ہیرو تو ہوں نہیں جو مجنوں بن کر اپنا وقت ضائع کرتا رہوں۔ تم بہرحال اپنا آخری فیصلہ مجھے سنا دو......! مجھے واپس امریکہ جانا ہے اور میں چاہتا ہوں جانے سے پہلے شادی ہو جائے تاکہ تمہیں ساتھ لے جاؤں......!“

”میں نے اپنا فیصلہ بہت پہلے اپنے ماں باپ کو سنا دیا تھا اور تم اچھی طرح جانتے ہو......!“

”وہ فیصلہ بچوں والا فیصلہ ہے......؟“

”لیکن بقول آپ کے میں بچی نہیں......! اس لئے وہ فیصلہ بھی ایک بڑے کا فیصلہ ہے۔ یوں بھی اگر مجھے شادی کرنا ہوتی تو میں اس شخص کا انتخاب کرتی، جس کی رہائش اپنے وطن میں ہوتی، جس کو اپنے وطن سے محبت ہوتی۔“

”اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے......! تم اپنا فیصلہ تبدیل کر لو......! میں اپنی رہائش تبدیل کر لیتا ہوں۔“

”لیکن میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں فیصلہ تبدیل کر رہی ہوں......؟ میرا فیصلہ وہی ہے۔ بہتر ہوگا اب آپ مجھے بازار لے چلیں......!“

شازیہ بات ختم کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عرفان بھی خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر آ کر اس نے موٹر سائیکل نکالی اور جب شازیہ بیٹھنے لگی تو عرفان نے پلٹ کر کہا۔

”اتنی بے چینی کیا ہے میرے ساتھ بیٹھنے کی......؟“

شازیہ نے آنکھیں نکال کر اس کو دیکھا اور دانت پیس کر رہ گئی۔

عرفان نے آئینے میں اس کا چہرہ دیکھا اور ہنسی دباتے ہوئے بولا۔

”اب بیٹھ بھی چکو......! یا کسی کا انتظار ہے......؟“

شازیہ بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئی اور پارک سے باہر نکلتے ہی عرفان نے موٹر سائیکل کی رفتار تیز کر دی۔

شازیہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم پاگل ہو......! تمہیں اپنی ان حرکتوں سے کچھ نہیں ملے گا۔“

''مل تو رہا ہے......!''

عرفان نے ہنس کر کہا۔

''تم نے میرے شانے کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔''

شازیہ نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ مگر گرنے سے بچنے کے لئے اسے پھر سہارا لینا پڑا۔ گھر کے باہر موٹر سائیکل روکتے ہوئے عرفان بولا۔

''ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کرنا......! نہ جانے کیوں عمر بھر کی تمہاری جدائی سہنے کو دل نہیں چاہتا۔''

شازیہ نے گھور کر دیکھا تو وہ ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شازیہ بھابی کے سامنے اس کی شرارتیں سنانے کے لئے بیٹھ گئی۔

کچھ دنوں سے تایا جی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ شازیہ جو پہلے ان کے کراہنے کی وجہ سے سکون محسوس کرتی تھی، اب ناگواری محسوس کرنے لگی تھی۔ شازیہ کو ان پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ جن کی وجہ سے وہ ٹھیک سے سو بھی نہ سکتی تھی۔

اس نے سوچا۔ وہ صبح ان کے گھر جائے گی اور تائی جی سے کہے گی۔

''آخر آپ تایا جی کو ہسپتال میں کیوں نہیں لے جاتیں......؟ خواہ مخواہ اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی بے سکون کرتے ہیں۔''

ساری رات وہ تایا جی کے کراہنے کی وجہ سے سو نہ سکی۔ صبح کے قریب کہیں اس کی آنکھ لگی، اور جب وہ بیدار ہوئی تو رونے کی آوازیں سن کر وہ باہر آئی تو اس کو عرفان نظر آیا۔

''کیا ہوا......؟''

وہ ناراضگی بھول گئی۔

''تایا جی فوت ہو گئے......!''

عرفان نے مدہم لہجے میں کہا۔ پہلے تو اسے افسوس ہوا، پھر اس نے سوچا۔

''چلو......! شکر ہے......! کم از کم رات تو آرام سے کٹا کرے گی۔''

وہ مطمئن ہو گئی۔

''کیا سوچنے لگیں......؟''

عرفان غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ رات بھر سو نہیں پائی۔

'آپ سے مطلب......؟''

شازیہ نے بگڑ کر اسے دیکھا اور پھر کمرے میں آ گئی۔

رات ہوئی تو وہ اپنے کمرے میں آئی تو نہ جانے کیوں خوف سا محسوس ہوا۔ مگر وہ ہمت کر کے لیٹ گئی اور لیٹتے ہی کفن میں لپٹا ہوا تایا جی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ شازیہ کا دل چاہا کہ وہ آج امی کے کمرے میں جا کر سو جائے مگر عرفان کا خیال کر کے وہ لیٹی رہی اور پھر سو بھی گئی۔

آدھی رات کا وقت ہوگا جب اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرے کا راج تھا۔ شازیہ کو یوں لگا جیسے اس کے آس پاس بہت سارے بھوت کھڑے ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آس پاس دیکھنے لگی۔

رات کے سناٹے میں اپنی ہی سانس کی آواز سن کر ڈر گئی۔ پھر وہ بھول گئی کہ اس نے کیا فیصلہ کیا تھا......؟ وہ اُچھل کر بستر سے اُتری اور

''ابو......! ابو......!'' چیختی ہوئی دروازہ کھول کر باہر بھاگی۔ سب سے پہلے اس کے قریب عرفان پہنچا۔

''کیا ہوا شازی......؟''

عرفان نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ شازیہ آس پاس دیکھتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

''عرفان......! وہ مرد مر گیا جسے اپنی محافظ سمجھ کر میں اتنے دن آرام سے سوتی رہی۔ وہ جس کی کراہیں سن کر میں مطمئن ہو جاتی تھی، وہ آج مر گیا، اور اندر کمرے میں......''

اس نے عرفان کا بازو مضبوطی سے تھام کر سسکی بھری اور عرفان نے سوچا۔

''میں آخر اتنے دنوں سے یہ بات کیوں نہ سمجھ سکے کہ وہ محض تایا جی کی وجہ سے بہادر بن گئی تھی......؟''

انہوں نے غور سے اس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھا تو وہ اس وقت وہی عورت تھی، جو ہمیشہ مرد کا سہارا لے کر زندہ رہتی آئی ہے۔ مرد جو اس کا محافظ ہوتا ہے، مضبوط سہارا ہوتا ہے۔

اور عرفان اس وقت خود کو اس کا محافظ سمجھ کر مسکرانے لگا۔ ظاہر تھا کہ وہ اب تو شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔



انتظار کے بعد

موسم کی پہلی برف باری سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ ماں کے منع کرنے کے باوجود شانوں پر گرم شال ڈالتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

''بشریٰ......! اگر باہر جا رہی ہو تو کم از کم کوٹ ہی پہن لو......''

ماں کہتی رہ گئی مگر وہ سنی اَن سنی کرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

وہ کشمیر ہی کے رہنے والے تھے مگر باقی کے اعلیٰ افسر ہونے کی وجہ سے وہ لوگ کبھی مستقل طور پر کشمیر میں نہ رہ سکے۔ مختلف شہروں میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی لئے اپنے ملک کا تقریباً چپہ چپہ گھوم چکی تھی۔

البتہ کشمیر جو اس کا وطن تھا، اس کو اچھی طرح کبھی نہ دیکھ پائی۔ ایک طویل مدت کے بعد اب کی بار موسم سرما میں اس کے والد کا تبادلہ پھر کشمیر ہو گیا تھا۔ اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد وہ پہلی بار کشمیر آئی تھی۔

موسم سرما کی پہلی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ اس نے ٹی وی اور

فلموں میں برف باری کے مناظر ضرور دیکھے تھے مگر بذاتِ خود اس کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ برف باری سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کو دبا نہ سکی تھی اور گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

روئی کے گالوں کی طرح درختوں پر گرتی ہوئی برف بہت مسحور کن ثابت ہوئی تھی۔ گھومتی گھامتی بستی سے نکل کر باغات تک پہنچ گئی تھی۔ آنے کو تو وفورِ شوق میں آگئی تھی مگر اسے موسم کی شدت کا اندازہ نہ تھا۔

برف باری زیادہ ہوگئی تھی۔ واپس جانا چاہتی تھی مگر وائے قسمت کہ راستہ ہی گم ہوگیا۔ باوجود کوشش کے اسے وہ موڑ یاد نہ آیا جدھر سے گھر کو جانا تھا۔

ساری خوشی و سرمستی کافور ہوگئی۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی وہ حیران و پریشان اطراف میں نظریں دوڑا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ بھی شاید موسم سے خوفزدہ تیز تیز قدم اُٹھاتی جا رہی تھی۔

بشریٰ نے کچھ سوچ کر اس کو آواز دی۔ لڑکی نے شاید آواز نہ سنی کیونکہ وہ رُکی نہیں تھی۔ بشریٰ نے دوبارہ آواز دی۔ اس بار آواز بلند تھی۔ لڑکی ٹھٹک کر رہ گئی تھی اور پلٹ کر بشریٰ کو دیکھنے لگی تھی۔ بشریٰ اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔

"کیا بات ہے بی بی......؟"

لڑکی نے یوں پوچھا جیسے بہت جلدی میں ہو۔

"اچھی بہن......! میں بستی کا راستہ بھول گئی ہوں۔ مجھے راستہ بتا دو......!"

بشریٰ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

لڑکی نے غور سے اسے دیکھا۔

"تم ادھر کیوں آئی تھیں......؟ تمہیں نہیں معلوم، موسم خراب ہو رہا ہے......؟ ایسے موسم میں لوگ گھر کو جانے کی تیاری کرتے ہیں اور تم گھر سے باہر نکل آئی ہو......؟"

بشریٰ کو لڑکی کی نصیحت ذرا بھی پسند نہ آئی۔ بگڑ کر بولی۔

"مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں......! یہ بتاؤ......! اس بھوت خانے سے باہر کیسے نکل سکتی ہوں میں......؟"

لڑکی نے جلدی سے ایک پگ ڈنڈی کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری سمت مُڑ گئی۔ اس کو بھی شاید بشریٰ کا لہجہ ناگوار گرا تھا۔

بشریٰ جلدی سے اسی پگ ڈنڈی پر ہو لی جو لڑکی نے بتائی تھی۔ کچھ دُور جا کر ہی وہ پگ ڈنڈی تین راستوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ بشریٰ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس راستے کا انتخاب کرے......؟

بہت سوچ کر وہ ایک راستے پر ہو لی۔ شام کا سرمئی اندھیرا سیاہی میں ڈھلنے لگا تھا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ مگر راستہ تھا کہ ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔

دفعتہً اس نے چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کو دیکھا، تھوڑا سا اطمینان ہوا۔ وہ تقریباً بھاگ کر اس کے قریب پہنچتی ہوئی بولی۔

"سنئے......!"

عورت نے پلٹ کر دیکھا، پھر حیرت سے بولی۔

’’آپ......آپ کون ہیں......؟ اور اس طوفانی موسم میں یہاں کیا کر رہی ہیں......؟‘‘

آواز سن کر بشریٰ کو معلوم ہوا وہ عورت نہیں، مرد تھا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ اب کیا کرے......؟ آخر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

’’دیکھئے......! میں راستہ بھول کر ادھر آ نکلی ہوں۔ کوشش کے باوجود مجھے راستہ نہیں ملا۔ آپ کی مہربانی ہوگی، اگر میری راہنمائی کریں......!‘‘

’’مجھے افسوس ہے، میں اس وقت آپ کو لے کر کہیں نہیں جا سکتا۔ ایک تو موسم خراب ہے، دوسرے میری ڈیوٹی شروع ہو چکی ہے۔ ہاں......! اگر آپ پسند کریں اور مجھ پر اعتبار کریں تو یہاں سے کچھ دُور میرا جھونپڑا ہے، آپ وہاں پناہ لے سکتی ہیں۔‘‘

بشریٰ نے ایک لمحہ سوچا، پھر رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ وہ بشریٰ کو لے کر جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔

جھونپڑے کا دروازہ کھول کر بولا۔

’’آیئے......! تشریف رکھئے......!‘‘

بشریٰ جلدی سے اندر داخل ہوگئی۔ جھونپڑے میں ایک ہی چارپائی تھی جس پر سفید چادر بچھا کر سفید تکیہ اور ایک کمبل رکھ دیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی صفائی کر کے گیا ہو۔

راستے میں تاریکی ہونے کی وجہ سے وہ اس آدمی کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ لیکن جب اس نے کہا کہ آپ چارپائی پر بیٹھ جائیں تو بشریٰ نے پلٹ کر ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی۔ وہ بسکٹ کلر کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

براؤن رنگ کی گرم چادر سے پورا وجود ڈھکا ہوا وہ اتنا جاذبِ نظر تھا کہ بشریٰ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

’’اپالو کہا جائے یا حسن کا دیوتا......؟‘‘

کوئی تشبیہ بھی تو ذہن میں نہیں جم رہی تھی۔

شاید اسے بشریٰ کی گرم نگاہوں کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے جوں ہی بشریٰ کی طرف نظریں جمائیں، بشریٰ نے گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

نوجوان نے لالٹین کی مدہم زرد روشنی میں اس کے خوب صورت مگر خوفزدہ چہرے کو دیکھا اور سوچا۔

’’لباس سے تو کسی اچھے گھرانے کی لگتی ہے۔‘‘

’’آپ کا نام......؟‘‘

بشریٰ نے اچانک پوچھا۔

’’نام تو میرا راجا ہے، ویسے پیار سے لوگ مجھے راجو کہتے ہیں۔‘‘

پھر تھوڑے توقف سے بولا۔

’’آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں......؟‘‘

بشریٰ اس کی شائستگی پر حیران رہ گئی۔

’’شاید پڑھا لکھا ہے......؟‘‘

اس نے سوچا اور نام بتاتے ہوئے بولی۔

’’اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں......؟‘‘

’’ایک کیا......؟ آپ جتنی باتیں چاہیں پوچھ سکتی ہیں......!‘‘

راجا نے شائستگی سے جواب دیا۔

"آپ یہاں کیا کرتے ہیں......؟ میرا مطلب ہے آپ یہیں رہتے ہیں یا کہ کام کے سلسلے میں رہنا پڑتا ہے......؟ ابھی ابھی آپ نے اپنی ڈیوٹی کے بارے میں کہا تھا کہ شروع ہو چکی ہے۔"

بشریٰ نے یہ سوچ کر پوچھا تھا، کہیں وہ چور یا ڈاکو نہ ہو......؟

"جی......! میں یہاں کام ہی کے سلسلے میں رہتا ہوں۔ دراصل آپ مجھے اکاؤنٹنٹ سمجھ سکتی ہیں۔ میں باغات کا مال بار کراتا ہوں۔ بارہ بجے کے قریب منڈی ٹرک جاتے ہیں۔ میں یہ سب کام اپنی نگرانی میں کرواتا ہوں۔ ویسے آپ اتنے خطرناک موسم میں گھر سے کیوں نکلی تھیں......؟ اور پھر آبادی سے اتنی دُور یہاں......؟"

راجا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کمال ہے......! آپ اس خوب صورت موسم کو خطرناک کہہ رہے ہیں......؟ مجھے تو ایسے ہی موسم پسند ہیں۔ اسی لئے گھر سے نکل پڑی۔ موسم کے سرور نے اندازہ ہی نہ ہونے دیا کہ اتنی دُور نکل آئی ہوں۔ حتیٰ کہ راستہ ہی بھول گئی۔"

بشریٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"خوب......! آپ اس موسم کو بہت دلکش سمجھ کر گھر سے نکلیں......؟ اگر راستے میں کوئی حادثہ ہو جاتا تو موسم کی ساری دلکشی نکل جاتی......؟ خیر......! اس وقت آپ آرام کریں۔ میں جا رہا ہوں۔ میری واپسی رات بارہ بجے کے بعد ہوگی۔ ظاہر ہے آپ اس وقت تو بستی جا نہیں سکتیں۔ باہر برف باری بڑھ گئی ہے۔ راستہ مخدوش ہو چکا ہے۔ لہٰذا واپسی صبح تک ملتوی کر

دیجئے......!"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

بشریٰ نے چار پائی پر لیٹ کر اچھی طرح کمبل لپیٹ لیا۔ مگر سوئی نہیں۔

"نہ جانے یہ آدمی کیسا ہو......؟ اس وقت تو شریف نظر آ رہا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے......"

"خیر......! میں جاگتی رہوں گی......!"

مگر کوشش کے باوجود بارہ بجے تک نہ جاگ سکی۔ گھومنے پھرنے کی وجہ سے تھکی ہوئی تھی۔ اس لئے جاگتے رہنے کی کوشش کے باوجود نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔



راجا نے آخری ٹرک کے پھلوں کی پیٹیوں کی گنتی مکمل کی اور بولا۔

"ٹھیک ہے بھئی......! تم بھی دیکھ لو......!"

"یار......! تم نے دیکھ لیا یا میں نے دیکھ لیا، ایک ہی بات ہے۔"

ٹرک ڈرائیور نے جواب دیا۔ پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"یہ سردی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ بیچارے مزدوروں کو تو دیکھو کیسے سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو......!"

راجا نے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا کام تو ہوگیا، میں تو چلتا ہوں۔"

"تمہیں آج بڑی جلدی ہے واپسی کی......؟ کیا کوئی انتظار کر رہا ہے......؟"

ڈرائیور نے ہنس کر پوچھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں......!"

راجا مسکرا دیا۔

"بس ذرا سردی کی وجہ سے کہہ رہا تھا۔"

راجا نے مزدوروں کو جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی گھر کی طرف چل پڑا۔

ابھی جھونپڑے سے تھوڑا دُور ہی تھا کہ اس کا دوست عاشق سامنے سے آٹکرایا۔

"کیوں یار راجا......! تمہارا مال چلا گیا......؟"

"ہاں......! مال تو چلا گیا......!"

راجا نے کہا۔

"کیا تمہارا مال آج نہیں جانا......؟"

"نہیں یار......! موسم خراب ہے۔ اپنا مال لینے کوئی آیا ہی نہیں۔ مالک نے کہا چھٹی کرو۔ میں نے کہا چلو تمہارے جھونپڑے میں بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کریں گے۔"

"مگر عاشق......! مجھے تو بڑی زور کی نیند آ رہی ہے۔"

راجا نے خواہ مخواہ جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"اس لئے آج تو باتیں کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تمہاری نیند کی ایسی کی تیسی......!"

عاشق نے فوراً کہا۔

"میں دیکھوں گا تمہیں کیسے نیند آتی ہے......؟"

"دراصل آج صبح اوور ٹائم لگایا تھا۔ سارا دن سو نہیں سکا۔ اس لئے نیند آ رہی ہے۔"

راجا نے وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے......! تم سو جانا، میں بھی تمہارے یہاں ہی سو جاؤں گا۔"

عاشق نے اسمینان سے لہا۔

"تم اپنے جھونپڑے میں کیوں نہیں جاتے......؟"

راجا نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"ابے......! یہ تو مجھ سے کس انداز میں بات کر رہا ہے......؟"

عاشق بھی بگڑ کر بولا۔

"اگر تم ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے، اللہ حافظ......!"

وہ منہ بناتا ہوا دوسری جانب مُڑ گیا اور راجا مسکراتا ہوا اپنے جھونپڑے کی طرف آ گیا۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ بشریٰ کمبل لپیٹے سو رہی تھی۔ چارپائی ایک تھی اور کمبل بھی ایک۔ اس لئے راجا کے سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے ایک نظر بشریٰ کو دیکھا اور پھر اپنا حساب کا رجسٹر اُٹھا

کر بیٹھ گیا۔

اچانک باہر زور سے بجلی کڑکی۔ بشریٰ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور پھر کمرے میں راجا کو دیکھ کر مارے خوف کے اس کی جان نکل گئی۔

حساب کرتے کرتے راجا نے یوں ہی بشریٰ کی طرف نظر اُٹھائی اور اسے جاگتے پا کر بولا۔

''باہر کہیں بجلی گری ہے۔ مگر آپ گھبرائیں نہیں......! ادھر سب خیریت ہے۔ اطمینان سے سو جایئے......!''

راجا کے کہنے کے باوجود بشریٰ لیٹنے کی بجائے کمبل اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھ گئی۔

''یہ رات، یہ تنہائی، یہ ویرانہ اور اجنبی مرد......! ایسی میں، میں سو جاؤں......؟ نہیں......! اتنی بے وقوف تو نہیں۔''

بشریٰ نے سوچا۔

راجا بڑے غور سے اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ سوچ کر بولا۔

''دیکھیں مس بشریٰ......! میں ایک شریف انسان ہوں۔ آپ بے فکر ہو کر سو جائیں......!''

راجا کی بات کا بشریٰ پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ اسی حالت میں بیٹھی رہی تھی۔

''صبح میں آپ کو بستی پہنچا دوں گا۔''

راجا نے رجسٹر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

صبح کے ابھی چھ ہی بجے تھے، جب راجا نے اسے تیار ہونے کو کہا۔ بشریٰ وقت دیکھتی ہوئی بولی۔

''ماما ڈیڈ رات کے کتنے پریشان ہوں گے......؟''

راجا نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا مگر چپ رہا۔ بشریٰ نے جوتا پہنا اور بولی۔

''چلیے......!''

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستی پہنچ گئے تھے۔ موسم اب بھی سرد تھا۔

''ارے......! یہ آپ کا گھر ہے......؟''

راجا حیرت سے بولا۔

''ادھر پچھلی طرف ہمارا گھر ہے......!''

''مگر میں نے کبھی آپ کو ادھر نہیں دیکھا۔''

بشریٰ نے کہا۔

''کبھی اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ ادھر آ کے رُک سکوں۔ والد فوت ہو چکے ہیں۔ پانچ بہنیں ہیں اور ایک بھائی، جن کا میں واحد سہارا ہوں۔ دن رات کام سے فرصت نہیں ملتی۔ صبح ناشتہ کرنے آتا ہوں اور پھر رات کو کھانا کھانے۔ یعنی مصروفیت ہی مصروفیت ہے۔ پھر آپ مجھے کیسے دیکھ سکتی تھیں......؟ خیر......! اب مجھے اجازت دیجیے......!''

''اب آپ یہاں تک آ ہی گئی ہیں تو اندر آ جایئے......! ڈیڈی سے مل لیں......!''

بشریٰ اسے اندر لے آئی۔ سامنے ہی برآمدے میں ماں کھڑی تھی۔

بشریٰ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

''تو کہاں چلی گئی تھی میری بچی......؟''

ماں اس کی پیشانی چومتی ہوئی بولی۔

''تمہارے ڈیڈی تمہاری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اس وقت اپنے کمرے میں پریشان بیٹھے ہیں۔ یہ کون ہیں......؟''

انہوں نے راجا کو دیکھ کر پوچھا۔

''امی......! یہی تو ہیں جن کی وجہ سے میں گھر واپس آسکی۔''

بشریٰ نے مختصر طور پر انہیں راجا کے بارے میں بتایا۔

''خدا تمہاری عمر دراز کرے بیٹا......! اگر تم نہ ہوتے تو نہ جانے بشریٰ کا کیا حال ہوتا......؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ جان......؟ یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کیا۔ اب مجھے اجازت دیجئے......!''

اتنے میں بشریٰ اپنے ڈیڈی کو لے کر آ گئی۔

''اچھا......! تو یہ ہے وہ راجا جو تمہیں یہاں لایا ہے......؟''

انہوں نے نخوت سے کہا اور جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر راجا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''یہ لو برخوردار......!''

''یہ کیا......؟''

راجا نے حیرت سے نوٹ کو دیکھا۔

''جناب......! یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کیا۔

''کسی پر کوئی فرض نہیں ہوتا۔ اگر یہ تمہارا فرض تھا تو تم اسے دروازے پر چھوڑ کر چلے گئے ہوتے مگر تمہیں یہی چیز اندر لائی ہے۔ اب لینے میں شرم کیسی......؟''

''ڈیڈی......؟''

بشریٰ چیخ کر بولی۔

''یہ میرا محسن ہے، بلکہ آپ کا بھی۔ آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہئے......!''

''بیٹا......! تم بچی ہو......!''

ڈیڈی نے پیار سے اسے دیکھا پھر راجا سے بولے۔

''پکڑو اور جاؤ......!''

''معاف کیجئے گا......! آپ کو میری توہین کا کوئی حق نہیں۔ مگر قصور آپ کا نہیں، سب بڑے لوگ آپ جیسے ہی بے حس ہوتے ہیں۔''

راجا تیزی سے باہر نکل گیا۔

''ڈیڈی......! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔''

وہ بگڑ کر بولی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ بے حد لاڈلی تھی۔ اس لئے اپنی من مانی ہی کرتی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آئی اور سوچنے لگی۔

''راجا کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ جو رات میں نے راجا کے جھونپڑے میں گزاری ہے، اگر کوئی دوسرا ہوتا تو کیا راجا کی طرح میری عزت

کرتا......؟ بجائے اس کے کہ اس کا احسان مانا جاتا، اسے ذلیل کر کے نکالا گیا ہے۔"

وہ بے چینی سے شام کا انتظار کرنے لگی۔

چار بجتے ہی وہ بستر سے نکلی۔ جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، پھر گرم شال شانوں پر اچھی طرح لپیٹتی ہوئی باہر جانے لگی۔

"آج پھر جا رہی ہو......؟"

ماں نے اسے جاتا دیکھ کر پوچھا۔

"امی......! جلدی آجاؤں گی۔"

بشریٰ نے جلدی سے کہا اور باہر نکل گئی۔

راجا کے گھر کے قریب رُک کر اس نے اندر جھانکا۔ سامنے صحن میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔

"پانی کا ایک گلاس مل سکتا ہے......؟"

بشریٰ نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ لڑکی مُڑی اور گلاس بھر کے بشریٰ کو دے دیا۔ بشریٰ کو پیاس تو نہ تھی مگر چونکہ پانی کے بہانے اندر آئی تھی، اس لئے پینا پڑا۔ ابھی اس نے آدھا گلاس ہی پیا تھا کہ پیچھے سے راجا کی آواز آئی۔ بشریٰ نے پلٹ کر دیکھا تو وہ چونک پڑا۔

"آپ......؟ اور یہاں......؟"

"جی......!"

بشریٰ مسکرائی۔

"میں باہر باغات کی طرف جا رہی ہوں۔ آپ جلدی سے ادھر ہی

آجایئے......!"

پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر تیر کی طرح باہر نکل گئی۔ اسی وقت راجا کی بہن واپس آئی اور بولی۔

"بھیا......! یہاں میں ابھی ایک لڑکی کو چھوڑ کر گئی تھی، کہاں گئی وہ......؟"

"پتہ نہیں......! یہ گلاس مجھے پکڑا کر چلی گئی۔"

راجا اسے گلاس دیتے ہوئے بولا۔

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ ابھی آ کر کھانا کھاؤں گا۔"

گھر سے نکلتے ہی اس نے بشریٰ کو دیکھا جو خراماں چلی جا رہی تھی۔ راجا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس سے جا ملا۔

"کیوں بلایا ہے آپ نے مجھے......؟"

وہ ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

"چلتے رہئے......! بتادوں گی......!"

بشریٰ نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

"دیکھئے......! میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔"

راجا سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن اب تو آپ کو میرے لئے وقت نکالنا ہی پڑے گا۔"

بشریٰ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"آپ کے ڈیڈی کی باتوں میں کچھ کمی رہ گئی تھی جو آپ چلی آئیں......؟"

باتیں کرتے کرتے دونوں ایک خوب صورت سی جگہ پر پہنچ کر رُک گئے۔

''بیٹھ جایئے ورنہ کھڑے کھڑے تو آپ تھک ہی جائیں گے......؟''

راجا نے گھور کر اسے دیکھا تو بشریٰ ہنس کر بولی۔

''ظاہر ہے......! جو باتیں آپ کو کہنی چاہئیں اور آپ نہیں کہیں گے تو مجھے ہی کہنی پڑیں گی......؟''

''معاف کیجئے......! مجھے کچھ جلدی ہے۔ آپ جو کہنا چاہتی ہیں، جلد کہہ ڈالئے۔''

راجا رکھائی سے بولا۔

''آپ نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے......؟''

بشریٰ نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی......!''

راجا نے یوں چونک کر اسے دیکھا جیسے اس نے کوئی بہت غلط بات کہہ دی ہو۔

''آپ نے جواب نہیں دیا......؟''

بشریٰ نے مسکرا کر پوچھا۔

''ان احمقانہ باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے......!''

راجا کا لہجہ اُکھڑا ہوا تھا۔

''چلو......! یہ بھی اچھا ہوا......!''

بشریٰ ہنستی ہوئی بولی۔

''میں سارا دن یہی سوچتی رہی، کہیں آپ کسی سے پیار نہ کرتے ہوں......؟''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں......؟''

راجا نے تلخی سے پوچھا۔

''یہی کہ اب آپ پیار کرنے کے لئے تیار ہو جائیں......!''

بشریٰ نے پھر ہنستے ہوئے کہا۔

''مطلب......؟''

راجا اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''اتنا مشکل سوال تو نہیں......!''

بشریٰ اسے تنگ کرتی ہوئی بولی۔

''آپ ہوش میں تو ہیں......؟''

راجا کو اس کی دماغی حالت پر شک سا ہونے لگا۔

''ہاں بھئی......! بالکل ہوش میں ہوں......!''

بشریٰ نے فضا میں اپنا رومال لہرایا۔

''ہرگز نہیں......!''

راجا اسے تشویش سے دیکھتا ہوا سر ہلانے لگا۔

''میرا خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

راجا کے لہجے میں واقعی تشویش تھی۔

''چلو......! یہی سمجھ لو......! مگر یہ بتاؤ......! تمہارا کیا خیال ہے؟

میرے بارے میں......؟''

لہجہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔

''میں آپ جیسی رئیس زادیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، جو اپنا وقت گزارنے کے لئے دل لگی کرتی ہیں۔ مگر آپ نے بہت غلط انتخاب کیا ہے۔ بہتر ہوگا میرا پیچھا چھوڑ کر کسی اور کو نشانہ بناؤ......!''

راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''راجا......؟''

بشریٰ اپنی توہین برداشت نہ کرسکی۔

''محبت ایک پاکیزہ اور مقدس جذبہ ہے۔ تم اس کے تقدس سے انکار نہیں کر سکتے۔ تم اگر کسی اور سے پیار کرتے تو ٹھیک تھا، لیکن اب اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم دل لگی کر رہی ہوں......؟ تو ایسی کوئی بات نہیں......!

تمہاری شخصیت مجھے متاثر کرگئی اور میں نے تمہیں اپنا آئیڈیل بنا لیا ہے۔ شاید میرا طریقۂ اظہار درست نہیں۔ ورنہ تم مجھے بری لڑکی نہ سمجھتے، جو ایک ہی دن میں ملی اور محبت کا اظہار کرنے لگی۔

میں سمجھتی ہوں محبت میں انسان کو پرکھنے کے لئے سالوں اور مہینوں کی نہیں، اس لمحے کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ اپنے دل میں کسی دوسرے کی چاہت محسوس کرے۔ قبولیت کا ایک ہی لمحہ ہوتا ہے جو امر ہو جاتا ہے۔

تم یقین کرو راجا......! وہ رات جو میں تمہارے گھر گزار کر آئی، بھول نہیں سکی۔ تم اگر میری باتوں کو نہیں سمجھ سکے تو ٹھیک ہے۔ تم مجھے بھول جانا، مگر میں شاید تمہیں نہ بھلا سکوں......؟''

بشریٰ واپسی کے لئے مُڑ گئی۔

راجا جو حیران سا اس کی بڑی بڑی باتیں سن رہا تھا، چونک کر بولا۔

''تم اس فرق کو سمجھتی ہو جو تمہارے اور میرے درمیان ہے......؟ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی......''

''میں اس فرق کی پرواہ نہیں کرتی۔''

بشریٰ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''لیکن بشریٰ......! تمہارے ڈیڈی...... تم کسی فرق کو مانو یا نہ مانو......! وہ تو کبھی اس بات پر رضا مند نہیں ہوں گے کہ تمہاری شادی کسی معمولی آدمی سے ہو......؟''

''ڈیڈی کی فکر تم مت کرو......! ڈیڈی وہی کریں گے جو میں کہوں گی۔ تم اپنی کہو......!''

''اپنی......؟''

راجا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پہلی بار مسکرایا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

''راجا......! اوہ راجا......! تم کتنے اچھے ہو......!''

بشریٰ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''چلو......! اب تمہیں ماں اور بہنوں سے ملاؤں......!''

راجا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ابھی......؟''

بشریٰ حیرت سے آنکھیں پھاڑتی ہوئی بولی۔

"نہ بابا نہ......!"

"کیوں......؟ ابھی ملنے میں کیا حرج ہے......؟"

"تم سمجھتے کیوں نہیں؟ ابھی مجھے ان سے ملتے ہوئے شرم آئے گی۔"

"یہ اچھی رہی......! اظہارِ محبت کرتے ہوئے شرم نہیں آئی......؟ اور ماں سے ملتے ہوئے شرم آ رہی ہے......؟"

راجا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"خیر......! جیسے تمہاری مرضی......! مگر اس وقت واپس چلو......! کیونکہ مجھے کھانا کھا کر ڈیوٹی پر جانا ہے۔"

اور بشریٰ دوسرے دن ملنے کا وعدہ لے کر گھر لوٹ آئی۔

پھر کوئی دن ایسا نہ گزرا، جب وہ راجا سے ملنے نہ گئی ہو۔ پیار میں وہ کتنی دُور نکل گئی تھی۔ اسے احساس ہی نہ تھا۔

اس دن وہ راجا سے ملنے آئی تو وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو......؟"

بشریٰ نے جیب سے کشمش نکال کر کھاتے ہوئے پوچھا۔ راجا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"اکثر سوچتا ہوں جس تیزی سے تم روشنی بن کر میری زندگی میں آئی ہو، کہیں اس سے زیادہ تیزی سے تاریکیوں میں چھوڑ نہ جانا......؟"

"کیا تم اب بھی مجھے ایسا سمجھتے ہو......؟"

بشریٰ نے شکایت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں ایسا نہیں سمجھتا، مگر نہ جانے کیوں اپنی خوش بختی کا یقین

ہیں۔ یہاں آ کے بیٹھ کر یہی سوچتا ہوں، شاید آج تم نہ آؤ......؟ اور اگر بشریٰ......! واقعی کسی دن تم......"

"اگر مگر کچھ نہیں، میں روز آؤں گی اور اگر کبھی میری زندگی میں وہ وقت آیا، جب تمہیں چھوڑنا پڑا تو کسی اور کی بھی نہیں بنوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"خدا نہ کرے جو کبھی ایسا ہو......؟"

راجا نے محبت سے اس کے پُرعزم چہرے کو دیکھا۔

مگر ان کی محبت کی زندگی سچ مچ ہی دو گھڑی ثابت ہوئی۔ بشریٰ راجا سے مل کر گھر آئی تو اس کی آنٹی کا لڑکا ریحان آیا ہوا تھا۔ بشریٰ اس سے ملاقات کئے بغیر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی بشریٰ کے کمرے میں آ گیا اور بشریٰ کو اطمینان سے لیٹے دیکھ کر بولا۔

"محترمہ......! بڑے آرام سے یہاں پڑی ہیں۔ کیا پتہ نہیں کہ گھر میں کوئی مہمان آیا کب سے بور ہو رہا ہے......؟"

"ارے......! تم......؟"

بشریٰ اُٹھتی ہوئی بولی۔

"مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ تم آئے ہو......! تم نے اپنے آنے کی اطلاع بھی تو نہیں دی......؟"

"محترمہ......! تمہاری بے نیازی کا ابھی سے یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا......؟"

ریحان بے تکلفی سے اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"ہائیں......؟ شادی......؟ کس کی شادی کی بات کر رہے ہو......؟"

بشریٰ تھوڑا پرے ہٹتی ہوئی بولی۔

"جناب......! تمہاری اور اپنی شادی کی بات کر رہا ہوں۔"

ریحان اسی لہجے میں بولا۔

"ممی نے اسی لئے تو یہاں بھیجا ہے۔ دو تین دن تک وہ خود بھی یہاں آجائیں گی اور پھر سمجھو بات پکی......!"

"ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا......!"

بشریٰ بڑبڑائی۔

"ارے بھئی......! کیا نہیں ہوسکتا......؟"

ریحان نے چونک کر پوچھا۔

"یہ شادی نہیں ہوسکتی......؟"

بشریٰ نے بلند آواز میں جواب دیا۔

"لیکن کیوں نہیں ہوسکتی......؟ مجھ میں کیا کمی ہے......؟"

ریحان نے گھور کر اسے دیکھا۔

"انکار کر کے تم میری توہین کر رہی ہو......! میں تو سارے راستے بڑے میٹھے سپنے دیکھتا آیا ہوں۔"

ریحان نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"ویسے میں سمجھ گیا تھا کوئی گڑبڑ ضرور ہے......!"

"مجھ سے اصل بات سنو......! میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں

ریحان......! میں تمہیں تو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ ایسا کرو......! آنٹی کے آنے سے قبل تم یہاں سے چلے جاؤ......! یا پھر تم اپنی جانب سے انکار کر دو......!"

بشریٰ نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔

"ارے واہ میں خواہ مخواہ تمہارا بھائی، میں تو شادی کرنے آیا ہوں۔"

ریحان کے لہجے میں شرارت تھی۔

"پلیز ریحان......! میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔ تم ابھی واپس چلے جاؤ......! پلیز......! تم تو میرے اچھے بھائی ہوتاں......!"

"اچھا بابا......! شادی نہیں ہوتی نہ ہو......! لیکن اتنی دُور سے کشمیر آیا ہوں تو تفریح کر کے ہی جاؤں گا ناں......!"

"تمہاری تفریح میری زندگی برباد کر دے گی۔ پلیز......! واپس چلے جاؤ......! ورنہ آنٹی آگئیں تو بات بگڑ جائے گی۔"

بشریٰ نے روہانسی ہو کے کہا تو ریحان بولا۔

"اصل بات کیا ہے......؟"

اس پر بشریٰ نے اسے تفصیل سے راجا کے بارے میں بتا دیا۔

"ٹھیک ہے......! میں کل واپس چلا جاؤں گا۔"

ریحان رضامند ہوتے ہوئے بولا۔

"کل ہی کیوں......؟ جب جانا ہی ہے تو ابھی چلے جاؤ......!"

بشریٰ نے کچھ ایسے منت بھرے لہجے میں کہا کہ ریحان اُٹھا اور اندر داخل ہوتی آنٹی سے اجازت لے کر انہیں حیران کرتا ہوا باہر نکل گیا تو بشریٰ کی امی بولیں۔

”یہ اتنی جلدی کیوں چلا گیا......؟ جبکہ وہ رہنے کے لئے آیا تھا اور اگر وہ جا رہا تھا تو تمہیں اسے روکنا چاہئے تھا......؟“

”کیوں، میں کیوں روک لیتی......؟ اگر وہ جانا چاہتا ہے تو جائے۔“

بشریٰ لاپرواہی سے بولی۔

”دیکھو بشریٰ......! تمہارے ڈیڈی تمہاری شادی ریحان کے ساتھ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔“

”مگر میں ریحان سے شادی نہیں کروں گی۔“

بشریٰ بغیر کسی جھجک اور خوف کے بولی۔

”ٹھیک ہے......! اگر وہ تمہیں پسند نہیں تو تم اپنی پسند بتا دینا۔ ہمیں بہرحال تمہاری خوشی عزیز ہے۔“

ماں کی بات پر بشریٰ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔

”ممی......! آپ ڈیڈی سے کہیں کہ میری شادی راجا سے کر دیں۔“

”کیا......؟“

ماں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”یہ وہی راجا تو نہیں جو تمہیں گھر چھوڑنے آیا تھا......؟“

بشریٰ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

”اچھا......! میں بات کروں گی، مگر مجھے اُمید نہیں کہ وہ اس شادی پر رضا مند ہوں......؟“

”وہی ہوا......؟ بشریٰ کے ڈیڈی سب کچھ سن کر غصے سے بولے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ ہم نے اسے اتنے نازوں سے پالا ہے اور

اب ایک غریب کے پلّے باندھ دیں......؟ بچی بے وقوف ہے مگر ہم تو نہیں......؟ یہ میرا آخری فیصلہ ہے، اسے بتا دینا......!“

”اس نے بھی اپنے فیصلے کو آخر فیصلہ قرار دیا ہے کہ وہ راجا کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔“

بشریٰ کی ماں نے انہیں بشریٰ کا آخری فیصلہ سنا دیا۔

”اس کے فیصلے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قبل اس کے کہ بات بڑھے، میں اپنا ٹرانسفر کسی دوسرے شہر میں کرا لیتا ہوں۔ تاہم اس دوران میں اس بات کا خیال رہے کہ وہ گھر سے باہر نہ جانے پائے......!“

دو تین دن کے اندر اندر ہی انہوں نے اپنا ٹرانسفر لاہور کرا لیا۔

بشریٰ کو اس وقت پتا چلا جب جانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ موسم بھی کافی خراب تھا۔

بشریٰ نے سوچا۔

کچھ بھی ہو، وہ راجا سے ملنے ضرور جائے گی۔

کمرے سے باہر نکلی تو برآمدے میں ڈیڈی کرسی بچھائے بیٹھے تھے۔

”کہاں جا رہی ہو......؟“

بشریٰ کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

قبل اس کے بشریٰ جواب دیتی، راجا کی ماں گھر میں داخل ہوئی۔

ڈیڈی کے ساتھ بشریٰ نے بھی انہیں حیرت سے دیکھا۔ کیونکہ وہ انہیں نہیں جانتی تھی۔ قریب آ کر اس نے سلام کیا اور خود ہی اپنا تعاف کرا دیا۔

راجا نے انہیں آج ہی بشریٰ کے بارے میں بتایا تھا اور وہ ممتا کے

ہاتھوں مجبور ہو کر چلی آئی تھیں۔ ان کا تعارف سنتے ہی بشریٰ کے ڈیڈی کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور جب انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ حقارت سے بولے۔

"کیا سوچ کر آپ یہاں تشریف لائی ہیں......؟ اپنی اوقات تو دیکھی ہوتی......؟ آخر تم چھوٹے لوگ ایسی خواہش کیوں کرتے ہو جن کی تکمیل ناممکن ہوتی ہے؟ تم جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا کب چھوڑو گے؟ تم نے یہ بات کہنے کی جرأت کیسے کی؟ اپنے آوارہ بیٹے کو سمجھا لو۔"

ڈیڈی کا لہجہ حقارت آمیز تھا۔

"پلیز ڈیڈی......!"

بشریٰ نے چیخ کر ان کی بات کاٹی۔

"جسے آپ حقیر سمجھ رہے ہیں، وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ میں خود جھونپڑوں کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہ محلوں کے خواب نہیں دیکھ رہا۔"

"تم چپ رہو بشریٰ......! میں اچھی طرح سمجھتا ہوں ان چھوٹے لوگوں کی قیمت کو......؟ اور سنو تم......!"

وہ پھر راجا کی ماں سے مخاطب ہوئے۔

"اپنے بیٹے کو اچھی طرح سمجھا لینا ورنہ انجام اچھا نہ ہوگا۔ اگر اس نے اپنا راستہ تبدیل نہ کیا تو وہ مجھے اچھی طرح جان جائے گا۔"

"ڈیڈی......! آپ اس کی توہین نہ کیجئے......!"

بشریٰ غصے سے بولی۔

"میں نے اسے پسند کیا ہے۔ یہ قصور میرا ہے، اس کا نہیں......!"

"بکواس بند کرو......!"

ڈیڈی طیش میں بولے۔

"اور سنو......! تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو......؟ جاؤ اپنے بیٹے سے کہو......! اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے۔"

"نہیں ڈیڈی......! آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ یہ خواہش تو میں نے کی ہے، آپ ہاں کر دیجئے۔ آپ کو میری قسم ڈیڈی......! ہاں کر دیجئے۔"

بشریٰ روہانسی ہو کر بولی۔

"بکواس بند کرو بشریٰ......! تم وہی کرو گی جو میں کہوں گا، اور مائی......! تم یہاں سے دفع ہو جاؤ......!"

انہوں نے غصے سے کہا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک راجا کی ماں یہاں موجود رہے گی، بشریٰ اول فول بکتی رہے گی۔

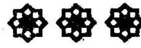
راجا کی ماں نے انہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"بڑے صاحب......! آپ اور آپ کا خاندان میرے اعلیٰ صفت بیٹے کے قابل ہی کہاں ہے......؟ میں خود تھوکتی ہوں ایسی شادی پر......!"

راجا کی ماں فاتحانہ انداز میں چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ لیکن اپنے پیچھے ایک الاؤ چھوڑ گئی۔ اس کے الفاظ تھے کہ زہر، جو ڈیڈی کی رگوں میں سرایت کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے ڈیڈی......! آپ نے اپنی خوشی پوری کر لی۔ مگر میرا فیصلہ بھی سن لیجئے......! میں جان دے دوں گی مگر کسی اور جگہ شادی نہیں کروں گی۔"

یہ کہہ کر بشریٰ روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔



راجا اس راستے پر نظریں گاڑھے کھڑا تھا جدھر سے بشریٰ اپنے ڈیڈی کے ساتھ لاہور چلی گئی تھی۔ راجا کی ماں نے اسے سب حالات بتا دیئے تھے۔ وہ بشریٰ کی وفاداری سے واقف ہو گیا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ مجبور ہو کر بھی والدین سے بغاوت نہیں کر سکے گی۔

راجا چپ چاپ کھڑا مٹی کے اس تازہ ڈھیر کو دیکھ رہا تھا جس میں اس نے اپنی محبت دفن کر دی تھی۔ یہ قبر اس نے خود بنائی تھی۔

''بشریٰ......!''

وہ پیار بھری سرگوشی میں بولا تو آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

''مجھے بے وفا مت سمجھنا، میری مجبوریوں کو سمجھنا۔ بھائی اور بہنوں کی جو ذمہ داریاں مجھ پر ہیں، انہیں پورا کرنے کے لئے مجھے ابھی زندہ رہنا ہے، ورنہ اب مجھے زندگی سے کوئی پیار نہیں۔ میرا وعدہ ہے، میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد کسی اور کے پاس جانے کی بجائے تمہارے ہی پاس آؤں گا۔

ہاں بشریٰ......! تمہارے ہی پاس آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا......!''

پھر وہ جس درخت کے نیچے کھڑا تھا، اس کے تنے سے سر ٹکا کر رو دیا۔

